

نئے افق

ماہنامہ







برکمال کو ذوال ہے.....!!

اللہ تعالیٰ کا یہ عدل کا نظام ہے کہ ہر کمال کو ذوال ہے۔ ہر بلندی کے بعد پستی کا آ لازمی ہے۔ جیسے رات کی تاریکی کے بعد دن کے اجالے کا آ لازمی ہے۔ ایسے ہی ہر بلندی کے بعد اچھائی اور نیچائی کا آ لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا جوڑا پیدا فرمایا ہے۔ اب شاید ہدیٰ کی تاریکی چھٹنے اور اجالا پھیلنے کا وقت قریب آنے کو ہے۔ کہتے ہیں کہ جب گیلدری موت آتی ہے تو اس کا رخ شہر کی طرف ہو جاتا ہے۔

وطن عزیز کی تاریخ ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ گواہ ہے۔ جب جب حکمران وقت اقتدار کے نشے میں مدہوش ہونے لگتے ہیں تو ان کے ذوال کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ وطن عزیز کی سیاسی تاریخ ایک شفاف آئینے کی مانند ہمارے سامنے ہے۔ جب جب جس حکمران کو یہ گمان ہوا کہ اس کی کرسی مضبوط ہے اسے کوئی نہیں ہلا سکتا تب وہ منہ کے بل گرا ہے۔ جب جب جنرل ایوب خان کو یہ گمان ہوا کہ اسے اور اس کے اقتدار کو کوئی ہلا نہیں سکتا اور انہوں نے من کی کرتا شروع کی آئین و قانون کی دھجیاں اڑانا شروع کیں۔ اپنے لاڈلے بیٹے کو ہر ایوب کو کھلی ہتھی دے دی کہ جو بھی میں آئے کرتا پھرے۔ قانون تمہارے گھر کی لٹری ہے ہلا خراب نہیں منہ کی کھائی پڑی اور ذلت و رسوائی کے ساتھ رخصت ہوتا ہی پڑا یہی حشر جنرل یحییٰ کا ہوا انہوں نے بھی قانون کو اپنی جوتی کی ٹوک پر رکھا پھر وہی ہوا جو ہوتا تھا انہیں بھی ذلت و رسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ پھر سونے کی چڑیا ذوال القادر مل بھٹو کے ہاتھ لگی جب تک انہوں نے قانون کو قانون سمجھا اس کا احترام ملحوظ رکھا انہوں نے ملک پر ہی نہیں بلکہ عوام کے دلوں پر راج کر کے اور جب انہوں نے اقتدار کی کرسی کو مضبوط سمجھا اور خود کو قانون سے بالاتر سمجھا تو انہیں بھی قانون نے ہی اپنے گھٹنے میں جکڑ لیا اور ساری قانون دانی دھری کی دھری رہ گئی۔ کہتے ہیں کہ اللہ کی لاشی بے آواز ہوتی ہے۔ جب ملتی ہے تو وہ کچھ ہو جاتا ہے جس کا تصور تک انسان نہیں کر سکتا۔ جنرل ضیا الحق نے اقتدار اپنی بندوق کے زور پر حاصل کیا تھا اور تاثر دیا کہ اللہ کی مضبوطی کو کچھ رکھا ہے جب انہوں نے اللہ کی رسی کو چھوڑ کر اس کی رسی کو مضبوطی سے تھما تو ان کے دماغ بھی آسمان سے باتیں کرنے لگے وہ سمجھنے لگے کہ وہ خود ہی قانون ہیں سفید و سیاہ کے مالک ہیں جو چاہیں کریں اللہ کے بجائے انہوں نے اپنے سر پر امریکا کا ہاتھ مضبوط جانا اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا پھر قانون نے ان کے نیچے سے ہی نہیں بلکہ اوپر ہی اوپر ان کو اقتدار سے محروم کر دیا۔ اللہ کی بے آواز لاشی کام کر گئی۔ جب میاں نواز شریف کو اللہ نے اقتدار نصیب کیا تو وہ بھی ہلا خراب کیسے مقام پر پہنچے جہاں انہیں یہ یقین ہو گیا کہ ان کی کرسی مضبوط ہے۔ انہیں کوئی ہلا نہیں سکتا اور انہوں نے بھی قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا کہ ان کے ہاتھ بھی مل گئے اور تخت ان کے نیچے سے سرک گیا۔ پھر ایک نیا دور شروع ہوا پہلے پڑائی کے ہائی ذوال القادر مل بھٹو کی جی کو اقتدار نصیب ہوا جب تک وہ قانون اور آئین کی پاسداری کرتی رہیں حکومت کرتی رہیں لیکن جیسے ہی انہیں یہ گمان ہوا کہ ان کی کرسی ان کا اقتدار مضبوط ہے خود کو قانون سے باور جانا تب ان کا تختہ بھی الٹ دیا گیا۔ پھر دوبارہ میاں نواز شریف کی نازی لگ گئی اور اقتدار انہیں نصیب ہو گیا۔ چونکہ انہوں نے اس بارے میں عرصے میں اپنی بے گئی اور بے توقیر قہدی سے کچھ شیش حاصل نہیں کیا تھا۔ اب ان میں اپنے سر پرست ضیا الحق کی خود سری خود مختاری کی خوب بھس بھس چکی تھی۔ انہوں نے اب زیادہ مل کر اقتدار کے تخت پر

بٹھتے ہی خود کو اور اپنے قانون سمجھا اور جیتی جیتی آ یا جیسا چاہا کرنا شروع کر دیا۔ قانون کو تو ہر حکمران اپنے گھر کی لٹری سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ خود کو قانون ساز ادارے کا رکن ہونے کے باعث سمجھتا ہے کہ قانون کا کیا ہے یہ تو ہم نے خود ہی بنایا ہے۔ اس کا اطلاق عوام پر ہوتا ہے۔ حکمرانوں اور سیاست دانوں اور قانون سازوں پر نہیں ہوتا ہاں اگر کسی طرح ہوتا ہے تو حکومت مخالفین پر ہوتا ہے۔ دوسری بار بھی میاں نواز شریف کو قانون سے کھینٹنے اور خود کو اور اپنے قانون سمجھنے کی سزا ملی۔ اب کے انہیں کڑی سزا ملی جلا وطنی بھی، جیل بھی پڑی بدنامی کا داغ بھی سہتا پڑا اور ان کی حماقت یا کم فہمی یا خود کو قانون و آئین سے ماہر سمجھنے کی خوب سزا ملی اور اس کے نتیجے میں ایک بار پھر حکومت پر فوج قابض ہوئی اور جنرل پرویز مشرف اپنی دونوں بظلوں میں دو کتے کے پلے دبانے نمودار ہوا۔ اس کا سارا دور صومٹ ان ہی لوگوں کے عیش کا دور رہا۔ جنہوں نے ان سے ان کے کتے کے پلوں کی طرح وقاداری نبھائی اور جتنائی اور جب انہوں نے بھی خود کو قانون سے باور جانا اور خود ہی قانون بن گئے۔ جو انہوں نے کیا وہی درست مانا جانے لگا۔ قانون ساز ادارے تو ادارے خود قانون اور عدل کرنے والے اداروں کو وہ اپنی انگلیوں پر چھانے لگا لیکن کب تک پھر اس کے کمال کو بھی زوال نے آ کر اور اس نے اپنے مشیروں کی حماقت انہیں مشوروں پر اور خود کو قانون سے باور سمجھنے پر قانون سے براہ راست نگر لینے ہوئے چیف جسٹس آف پاکستان پر اپنا ناکروہ ہاتھ ڈال دیا۔ اور پھر ویتا نے دیکھا کہ صاحب اقتدار و اختیار ہوتے ہوئے اسے اللہ تعالیٰ نے کس طرح بے بس و مجبور کر دیا۔ اقتدار چھوڑنے پر اس کے چہرے پر جو سیاہی ملی جا چکی ہے جو بدنامی بے عزتی اسے نصیب ہو رہی ہے تو وہ کبھی سمجھی نہیں ہے۔ اب موجودہ حکمرانوں نے تقریباً ساڑھے تین سال کی طویل مدت جیسے تیسے تو گزرا دی ہے لیکن اس طویل مدت اقتدار نے انہیں بھی اس غلط فہمی میں جکڑ کر دیا ہے کہ ان کی کرسی ان کا اقتدار مضبوط تر ہے۔ انہیں کوئی کسی طرح ہٹا نہیں سکتا۔ قانون کی کیا اہمیت ہے۔ قانون ساز ادارہ تو ہمارا اپنا ہے جب چاہیں جو چاہیں قانون بنا جاسکتا ہے۔ حکمران وقت کے حواریوں مشیروں نے ان کے دایم یا ہم موجود کو شاہ یوں نے ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیں ہیں اور انہیں سب اچھا ہے سب قابو میں ہیں کی نوید دے رہے سناتے رہے ہیں۔ یہاں ہمیں وہ قصہ یاد رہا ہے جب ایک اندھے حافظ جی کو ان کے ایک معتمد نے رات کو کھانے پر بلایا تو وہ اپنے ایک شاگرد کو ساتھ لے گئے کھانا کھا کر جب واپس لوٹنے لگے تو راستے میں ایک گہری کھائی پڑی تھی جب حافظ جی اس کھائی کے قریب پہنچے تو شاگرد نے انہیں اطلاع دی حافظ جی کھائی کا حافظ جی جو بے چارے نہ جانتا تھے۔ بولے ہاں بیٹا خوب کھائی۔ لڑکا بار بار کہتا رہا لیکن حافظ جی شاگرد سے یہی کہتے رہے کہ خوب کھائی۔ اور یہ کہتے کہتے وہ کھائی میں گر گئے۔ ایسا ہی معلوم ہو رہا ہے کہ موجودہ حکمرانوں کے کمال کے زوال کا وقت شروع ہو رہا ہے۔ ان کی بلندی پستی میں بدلنے کو بے یہ بھی وہی حماقت اور نادانی کر رہے ہیں جو ان کے پیش رو حکمران کر چکے ہیں۔ قانون سے کچھ بھولی کھیلنے کھیلنے اب یہ قانون سے ٹکرانے جا رہے ہیں بلکہ گرا چکے۔ عدالت عظمیٰ کے احکام کو رد کیا جا رہا ہے اور اپنے من نے احکام کی کھیل کرانی جا رہی ہے۔ جس حکام کے لیے عدالت عظمیٰ نے حکم صادر کر دیا حکمرانوں نے اس حکم سے سرتابی کرتے ہوئے ہاتھ بچا رکھا۔ البتہ خبر یہ ہے بلکہ وہ قوم کی حفاظت کرے۔ دیکھیے کہ آسمان کی بارگاہ دکھاتا ہے۔

عمران احمد

عمران احمد

گناہوں کا گناہ

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو مسلمان بھی فرض نماز کا وقت آنے کے بعد اس کے لیے اچھی طرح وضو کرے، خشوع پیدا کرے اور (آداب کے مطابق) رکوع کرے تو اس کا یہ عمل اس کے تمام پچھلے گناہوں کا گناہ بن جاتا ہے۔ جب تک کہ اس نے کسی گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہ کیا ہو اور (گناہوں کی تلاقی کا) یہ عمل ساری عمر جاری رہتا ہے۔“

عزیزان محترم..... سلامت باشد!

ماورضان المبارک گزر گیا، اس ماہ کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے رحمتوں اور برکتوں کا مہینہ قرار دیا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ جو اس ماہ میں مغفرت طلب کرے گا اسے نہ صرف معاف کر دیا جائے گا بلکہ انعامات سے بھی نوازا جائے گا۔ مگر افسوس صد افسوس ہم نے اس ماہ کو رحمتوں کا مہینہ بنا دیا۔ کہتے ہیں اس مہینے شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے مگر ہم خود شیطان بن گئے۔ اس ماہ جس طرح کراچی میں کل عام ہوا جلوت مار ہوئی اس کا کراچی سے باہر بننے والے تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ وقت آ گیا ہے جب دنیا سے قرآن اٹھالیا جائے گا لوگوں کے دل ایمان سے خالی ہو جائیں گے توبہ کے دروازے بند کر دیے جائیں گے اور انسان انتظار کریں گے کہ اس کڑک کا اس دھماکے کا جس کا وعدہ کیا گیا ہے مگر یہ وقت گزر گیا شاید اللہ تعالیٰ کو اب بھی ہم سے امید ہے کہ ہم سدھر جائیں راہ راست پرا جائیں۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ ہمیں کم از کم انسان بنے اور انسانیت کا احترام کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔

محمد فہد، مظفر گڑھ۔ محترم جناب عمران صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ صد خوش رہو آباؤ ہو۔ کسے مزاج ہیں جناب کے۔ میرا ایک شعر آپ کے اور تمام اسلاف و قارئین کے نام۔

بس اک یہی التجا ہے فیصل کی رب سے

سدا مہکتا رہے چمن تیرا مانند بہار

اب کی بار نائل کافی خوب صورت اور جاذب نظر لگا (نائل پرنگی حسین کے گھنے بالوں کا راز بتا دیجیے گا ذرا.....؟) لیکن بیک گراؤ نہ پرد و خطرناک آنکھیں بہت ہی ڈراؤنا منظر پیش کر رہی تھیں۔ محترم مشتاق احمد قریشی صاحب۔ دستک میں آپ نے انتہائی خوب صورت انداز میں موجودہ ملکی حالات کی عکاسی کی ہے۔ اب آتا ہوں ساتھیوں کے محبت ناموں اور سنی و شیعہ تہذیب کی جانب۔ سب سے پہلے جناب سید عبداللہ شاہ صاحب کرسی صدارت پر براجمان ملے۔ جناب سب سے پہلے تو ناچیز کی جانب سے تحفہ سلام قبول کیجیے پھر کرسی صدارت کے حوالہ سے ”مبارک باد۔ بھائی پاکستان پوسٹ کی کارگزاریوں پر شکوہ کوئی نئی بات نہیں یہ تو اس انسان کو ہے جس کا پالا ”پاکستان پوسٹ“ سے پڑا۔ جہاں تک آپ کے پڑوسی کا سوال ہے تو انہوں نے آپ کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی جس پر

ہم آپ کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔ آپ کی تائی کی وفات پر اظہار رنج و الم کے ساتھ دعا گو ہوں کہ اللہ مرحومہ کے صغیرہ کبیرہ گناہ معاف فرماتے ہوئے انہیں جنت الفردوس میں مقام عطا فرمائے ویسے آپ نے سینئر جونیئر تبصرہ نگاروں کا تذکرہ کیا اگر چند جونیئر کے نام لکھ دیتے تو بہتر تھا۔ پتا نہیں آپ نے ہمیں کس ”درجہ“ میں جگہ دی ہے۔ سرور شاہ کے بارے میں آپ کی رائے سے میں تو متفق ہوں باقی ساتھیوں کا تو پتا نہیں۔ (شاہ بھائی میں دو ٹوک اور گھری بات کا قائل ہوں میری بات کا برا مت منانا.....! اگر مان جاؤ تو ایڈوانس میں معذرت! جہاں تک میرے تبصرے کا تعلق ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اگر خون جوان ہے تو تبصرے بھی جو اس مردوں والے ہی ہوں گے؟ جہاں تک پاکستان کے ایسی اثاثوں کے حوالے سے جناب ریاض بٹ صاحب کی فکر ہے اس سے متفق ہوں اور آپ کی آراء کی نفی کرتے ہوئے یہی کہوں گا کہ اگر ہم اپنی دھرتی ماں کی حفاظت کے لیے پریشان نہیں ہوں گے تو یوں ہوگا کہ احمد علی کیف کے بارے میں آپ کی رائے سے متفق ہوں۔ جناب محمد اسلم جاوید نے افق نیلی میں خوش آمدید اور ناگہانی جانب سے تحفہ سلام قبول کیجیے۔ آپ کے جذبات اور پرچے کے حوالے سے آپ نے خیالات اور آراء قابل تعریف ہے آپ سے درخواست ہے کہ یونی پرچی زینت بڑھاتے رہیں اور فیصل تبصرہ کے ساتھ سلسلہ بنی ہو تو اور بھی تحفہ پر بھیجے۔ جناب ابن مقبول صدیقی صاحب! خاکساری جانب سے گندہ سلام قبول کیجیے۔ دعا ہے لکھنؤ آپ جیسے بزرگوں کا سایہ ہمارے سر قیامت برقرار رکھے۔ ناچیز آپ کی آراء سے متفق ہے اور تبصرہ کی تعریف پر دل سے شکر گزار بھی اسی طرح دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ عبدالمالک کیف بھائی کیسے ہو ناچیز کی طرف سے تحفہ سلام قبول کرو۔ جناب تبصرہ پسند کرنے پر الفاظ تشکر اور مختصر مگر جامع تبصرہ لکھنے پر مبارک باد اسی طرح ریکارڈ حاضری لگواتے رہا کرو اور ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھا کرو۔ احمد علی کیف کیسے ہو جی! میرے چودہویں دے چن! تے نال کتھے غائب ہو ہر مہینے ایک ہی بات پولیٹ فارم پر تمام دوستوں سے ملاقات ہوتی ہے یہاں تو حاضری لگوالی کرو.....؟ معلوم ہے بہت مصروف ہوتے ہو یا آج کے دور میں کوئی بھی فارغ نہیں ہوتا پھر بھی دوستوں کے لیے وقت نکال پڑتا ہے سمجھ کر نہیں۔ جواب کا منتظر رہوں گا۔ طالب دعا۔ جناب فقیر محمد بخش صابر لگا صاحب! سب سے پہلے تو فرزند ارجمند کی جانب سے تحفہ سلام قبول کیجیے۔ دعاؤں میں یاد رکھنے پر ناچیز آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہے اور دعا گو ہے کہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قیامت قائم رہے اور اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ جناب ریاض بٹ صاحب۔ سلام محمدی قبول کیجیے التجا ہے کہ دھڑکنوں پر کنٹرول رکھا کیجیے۔ میں آپ کی بات سے متفق ہوں کہ واقعی پرندہ آزادی کی قدر ہے اور اسے آزادی کی قدر ہے جب کہ ہمیں نہ پوری آزادی میسر ہے اور نہ ہی کسی قدر ملی آزادی کی قدر ہے۔ واقعی ہم آزاد نہیں ہیں۔ 65 سال گزر چکے ہیں وطن عزیز کی آزادی کو ٹکڑا بھی تک انہی انگریزوں اور فرنگیوں کے زیر تسلط ہیں۔ اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے ملک میں ابھی تک انگلش قانون الاگو ہے تعلیمی نصاب میں اسلامیات کی جگہ انگلش پر ہی زور دیا گیا ہے اور اس کو ہی لازمی مضمون قرار دیا گیا ہے اور میرا یہ پیشہ ہے کہ ”ہم اس وقت تک انگریزوں کے

اتنے عرصے سے یار نہ کوئی کلام نہ کوئی تبصرہ کیا وجہ ہے؟ خود کو بھی حاضر کرد اور وقاص عرف دکی کی حاضری کو بھی یقینی بنواؤ۔

اب کچھ کہانیوں کی بات ہو جائے۔ اقبال بھٹی صاحب کی ”بل ڈاگ“ ابھی رہی لیکن میں سمجھ نہیں پایا کہ اس اسٹوری کا محور کیا تھا یا اس سے کیا اخذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ راحیلہ تاج کی ”جانور“ ناپ پر رہی آپ نے انسان میں چھپے پیر اور نفرت بھرے جانور پر خوب صورت انداز میں قلم کشی کی۔ بانی کہانیوں پر تبصرہ ابھی محفوظ ہے۔ بزم سخن میں سیدہ فوزیہ رضوی ناپ پر رہی۔ نایاب صدف نمبر دو جب کہ فرخ ناز اور ثوبیہ ناز نمبر تین پر بانی دوستوں کی بھی بہت اچھی کاوش تھی۔ خوش بوخن میں عصمت اقبال نمبروں جب کہ رابعہ حسن لنگہ نمبر دو اور علی احمد علی نمبر تین پر رہے جب کہ نظمیں میں ریحانہ سعیدہ نمبر ایک وقاص احمد دکی نمبر دو اور حافظ رحیم بخش صاحب نمبر تین پر رہے۔ ذوق آگہی میں اصغر علی ناصر نمبروں ابن مقبول جاوید صدیقی صاحب نمبر دو اور غلام فاطمہ نمبر تین پر رہیں۔ عمران بھائی پچھلے ماہ کی غیر حاضری کے سبب تبصرہ ذرا لمبا اور باندا رہا ہے۔ کوشش تو بہت کی کہ زیادہ لمبا نہ ہو مگر ارش ہے کہ کاٹ چھانٹ لہی کیجیے گا (نہ کریں تو زیادہ بہتر ہے) اور خیال رکھیے گا کہ کسی بات کے درمیان میں سلسلہ نہ توڑا جائے۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد۔ بڑی آرزو تھی ملاقات کی ہمیشہ مسامت رہو۔ جناب مشتاق احمد قریشی صاحب۔ السلام علیکم! آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں۔ ماہ تمبر کا تازہ پرچہ عید مبارک نمبر دیکھ کر میرے دل کو بڑی خوشی ہوئی۔ ایسا خوب صورت پرچہ نکالنے پر دلی مبارکباد قبول کریں۔ سرور قی پبلک کی طرح اب بھی دلکش تھا۔ ویسے نئے افق کی جتنی بھی تعریف کی جائے بہت کم ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے میں آپ کا پرچہ بے حد مقبول ہے۔ میں بھی پرچے کا بہت ہی پرانا قاری ہوں۔ مقررہ تاریخ پر پرچہ مل جاتا ہے زیادہ انتظار نہیں کرتا۔ گفتگو میں خط شائع کرنے اور ساتھ ہی خوش بوخن میں غزل شائع کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ آپ جس طرح میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ یہی جذبات آپ کو خط آخر پر کرنے پر ہمیں مائل کرتا ہے۔ ویسے پرچے کے تمام عنوان اپنی اپنی جگہ بہتر ہیں۔ مثلاً دستک، اقراء گفتگو، خوش بوخن، بزم سخن وغیرہ اس بار کہانی ایک سے بڑھ کر ایک بھی تمام قلم کاروں کو میری طرف سے دلی مبارک ہو۔ یہ ایک معیاری پرچہ ہے۔ چند کہانیوں نے مجھے بہت ہی متاثر کیا ہے۔ مثلاً پھندہ، خواہش، گردش، جانور، پاگل، قرض محبت، پکاڑ گٹھ جوڑ وغیرہ آج کے اس دور میں زندگی بسر کرنا بھی بہت مشکل ہے ہر طرف مہنگائی کا زبردست طوفان ہے آخر انسان کیا کرے ویسے بھی کاروباری حالات نہیں ہیں اپنے قیمتی وقت میں سے وقت نکال کر یہ تحریر لکھ رہا ہوں۔ میرا یہ نوازش نام آپ کو عید سے شاید پیسے مل جائے تو بہتر ہے میری طرف سے تمام اسٹاف اور آپ کی خدمت میں عید مبارک بہت بہت قبول ہوں۔ اپنی خوشیوں میں ہمیں شامل کر لینا ہم سمجھیں گے کہ ہماری عید ہوگئی۔ چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں بشرط آپ کا تعاون ساتھ رہے ہمیں آپ سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت

تسلط سے آزاد نہیں ہوں گے جب تک ہم خود نہ چاہیں۔“ اور اس آزادی کے لیے ہمیں پھر سے جدوجہد کرنا ہوگی ایک نئے سرے سے؟

جناب عبداللہ عاطر صاحب! سلام مسنونہ کیسے ہو بھائی کہاں غائب ہو اتنے عرصے سے؟ یار اگر لوگ ہی غائب رہے تو ہمارا کیا ہوگا اور باقی ساتھی؟ اتنے مختصر تبصرے کے ساتھ حاضری؟ یا صرف احمد علی کیف کا ہی کیوں شکریہ۔ محفل کے بانی ساتھی کہاں اور تم مجھے ہی بھول گئے یہ تو زیادتی ہے۔ فوراً میرے ساتھ رابطہ کرو تا کہ میں تمہاری سرزنش کر سکوں۔ (کسی بات کا برا مت ماننا تمام باتیں بہ حد مذاق ہی کہی ہیں) رابطہ کرتا ہوں تو عمران بھائی یا پھر طاہر قریشی صاحب سے میرا نمبر لے سکتے ہو وہ آپ کو نمبر دے دیں۔ سید آکاش بخاری جناب خاکسار کا سلام عرض ہے اور جواب فرض ہے۔ کہاں غائب ہوا اتنے عرصے سے؟ نہ کوئی خط نہ کوئی میسج نہ کوئی مس کال اور نہ ہی کوئی کال؟ بے رخی کی انتہا کردی۔ جناب ریگولر ہو جاؤ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے ورنہ.....؟ ورنہ کچھ نہیں یار ہم کیا کر سکتے ہیں؟ خاکسار آپ کی بات سے متفق ہے۔ ہمارے حکمران وعدے کرنے کے شیریں تر و فان میں ذرہ بھر نہیں ملتی غیر باقی اسیران کا حال سناؤ اور تمام دوستوں کو میری طرف سے محبتوں بھر اسلام؟

محترمہ عصمت اقبال مین سب سے پہلے ناچیز کا گلہ۔ تہ سلامی قبول کیجیے خاکسار آپ کو نئے افق فیملی میں موٹ و پلکم کرتا ہے۔ امید ہے ریگولر حاضری ہوتی رہے گی۔ ڈیڑ شاہین سلام محمدی قبول کر دو اور تم سے مجھے بہت شکوے ہیں اور بہت ناراض ہوں ایک تو ریگولر حاضری نہیں ہوتی اور پھر کوئی کلام بھی نہیں بھیج رہی ہو کیا وجہ ہے.....؟ اگر میرا یہ تبصرہ پڑھ رہی ہو تو ہر صورت اس کا جواب بھیجیو۔

جناب ارشاد قریشی صاحب! سلام محمدی قبول کیجیے کیسے مزاج ہیں جناب کے؟ کہاں غائب ہو جناب آپ تو ریگولر لکھنے والے ہو پھر اچانک یوں غیر حاضری؟ دعا ہے رب العزت آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ محترمہ شبنی ارشاد صاحب! سلام مسنونہ کیسے مزاج ہیں۔ اچانک یوں اتنی لمبی غیر حاضری۔ سب ٹھیک تو ہے؟ خوش رہا کیجیے۔

محترمہ شہناز بانو صاحب! گلدستہ سلام قبول کیجیے۔ کہاں غائب ہو جی۔ محفل دوستوں میں تمام دوست آپ کی کمی شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ ریگولر حاضر ہوا کرو جی۔ محترمہ ریحانہ سعیدہ صاحب! خاکسار کی جانب سے گلابائے عقیدت و سلام قبول کیجیے۔ کیسے مزاج گرامی ہیں۔ کیا مصروفیات ہیں۔ مصروفیات کو ذرا کم کریں اور کچھ وقت محفل دوستوں کے لیے بھی نکالیں دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ محترمہ طاہرہ جمیں تارا! سلام عرض ہے جواب قرض ہے۔ مزاج سے آگاہی فرض ہے۔ کہاں غائب ہو اتنے عرصے سے ریگولر حاضری کو یقینی بنائے تمام دوست آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ ناظم بخاری کہاں غائب ہو یا؟ تھکے سلام قبول کرو اور جلد از جلد حاضری کو یقینی بناؤ۔ محترم ذاکر واجد گیلانی صاحب! سلام محمدی قبول کیجیے۔ جناب صرف کلام کی حد تک محدود نہ رہیں۔ محفل دوستوں میں بھی حاضری یقینی بنائیں۔ اس کے علاوہ باقی تمام دوست جن کے نام نہیں لکھ پایا وہ بھی ناراض نہ ہوں کیونکہ پہلے ہی تبصرہ کافی لمبا ہو چکا ہے اس لیے انتہائی معذرت اور تمام دوستوں کو سلام۔ راؤ چاند صاحب! جناب کہاں غائب ہو

سے کہاں پہنچ گئی۔ سید اکاش بخاری خدا آپ کی مشکلیں آسان کرے آمین۔ ثم آمین۔ اب کہانیوں پر کچھ تبصرہ ہو جائے۔ حسب معمول نعر اسود کی قسط اچھی رہی۔ کہانی کا نمبر اچھا جا رہا ہے۔ راجیلہ تاج کی جانور بہت پسند آئی۔ شبی ارشاد کی کالی بھینز کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔ سلسلے دار ”گردش“ کی اٹھان بتا رہی ہے کہ یہ کہانی آگے چل کر ہمارے دلوں پر راج کرے گی۔ غیر حاضر قارئین سے پر زور گزارش ہے کہ جلد از جلد حاضری لگوائیں۔ اب تھوڑی سی بات ہو جائے باقی سلسلوں کی۔ بزم سخن میں بنیش یا سمین، محمد ظفر اور ظفر سعید کے اشعار زیادہ پسند آئے۔ ویسے اس دفعہ بڑے عرصہ کے بعد تمام انتخاب لاجواب تھا۔ ذوق آگہی میں ابن جاوید مقبول صدیقی کے علاوہ غلام فاطمہ، عمران شیخ اور محمد شتاعت حسنین کا انتخاب پسند آیا۔ اب اجازت والسلام۔

فقیر محمد بخش صابہ لنگاہ و حسنین و ثقلین لنگاہ، خانیوال۔
بزرگوار محترم حاجی مشتاق احمد قریشی عزیز محترم عمران احمد صاحب آپ کی بھرپور دعاؤں کا طلب گار ہے۔ آپ سب عزیزوں کے لیے بھرپور دعائیں اور التجا خداوند پاک کا آپ سب عزیزان خیر و عافیت سے ہوں گے اور عید الفطر کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو عید الفطر کی خوشیاں مقدر کرے آمین ثم آمین اور ان خوشیوں میں غریب و نادار بہن بھائیوں کو ہرگز نہ بھولے گا بلکہ اپنے ساتھ رکھے گا۔ دیگر احوال یہ ہے کہ قبول حضرت علی تجوری المشہور داتا گنج بخشؒ کے جھوٹ رزق کو کھا جاتا ہے۔ تو عرض ہے کہ ماہنامہ نے افق صاحب زادہ محمد ثقلین صابر لنگاہ بروز ہفتہ کو ملتان شریف سے خرید کر لایا۔ سرورق پر مید مبارک کی پکار تھی۔ جو کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اگر زندگی نے ساتھ دیا تو عید الفطر کے بعد فراغت نامہ کی سرکاری چھٹی مل جانے کے بعد دل سے پڑھوں گا۔ باقی ممبران مطالعہ کر رہے ہیں اور ساتھ ہی عرض ہے کہ محبت نامہ بن مطالعہ نے افق حاضری فقیر لنگاہ کے طور پر لکھ رہا ہوں تاکہ آپ سب کو یہ باور رہے کہ فقیر لنگاہ حاضر محفل ہے۔ باقی اللہ خیر تے بیڑا پار خوش رہو۔ بہن بھائیوں اور دوستوں یاروں ماہ ستمبر 2011 کے شمارے کی اعزازی نوید جانہ رات اور عید الفطر کی خوشیوں کے رنگ میری دعائیں بھرپور انداز میں آپ کے ساتھ اور آپ کی دعائیں میرے ساتھ۔ باقی میری طرف سے بھرپور انداز میں اور گروپ آف لنگاہ ممبران نے افق گفتگو کی طرف سے آپ کو سلام محبت دعائیں۔ کوئی یاد کرے یا نہ کرے فقیر کی یاد میں جگمگاتے ستارے جن میں سے کچھ کے نام درج ہیں۔ میری دعائیں صدائیں ان کے نام ہیں کہ سدا خوش رہو! بادشاہ ہو۔ بزرگوار مشتاق احمد قریشی صاحب۔ عمران احمد صاحب، دلشاد حسین صاحب۔ حسام بٹ صاحب اور ان کی قسط وار آنے والی داستان بازی گر طاہر احمد قریشی صاحب راجیلہ تاج صاحبہ، رحمانہ سعید صاحبہ، ماہ لقا صاحبہ، صاحبہ زاویہ عالیہ انعام الہی صاحبہ، زاویہ شبی ارشاد صاحبہ، زارش پھر سابقہ رنگ اور دوز میں واپس آؤ۔ ریاض بٹ صاحب، روبینہ احمد صاحب، عفتان احمد صاحب، محمد احمد شہزاد صاحب نام اور مقام کی بھی پہچان رکھو عزیز و سر فراز راہی صاحب، سسر شہناز بانو صاحبہ، ورخوردار سعد علی صاحب، واسعد علی صاحب صدائے جمگٹا اور بانو صاحبہ کوئی نئی قسط لے کر حاضر قارئین ہو باقی تندرستی صحت آپ سب کا

دے خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے۔ تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ آپ کی زندگی میں رنگ برنگے پھول کھلتے رہے میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حاضر ہوں۔ مجھ سے بھی ہاتھ ملا دو اور اس سے ملانے والے اور کوئی قاتل ذکر بات نہیں جو تحریر کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ نیک تمناؤں کے ساتھ۔

ریاض بٹ، حسن ابدال۔ السلام علیکم! اس ماہ کا پرچہ 22 اگست کو مل گیا۔ حسب معمول خوب صورت اور دلکش سرورق لیے ہوئے ہے۔ جس کے لیے مصور صاحب کی تعریف نہ کرنا زیادتی کے زمرے میں آئے گا۔ عمران بھائی اس بار میری کہانی نئے انداز سے شائع کرنے کا بے حد شکر یہ لیکن ایک غلطی ہو گئی کہانی کے ساتھ میرا نام نہیں تھا۔ البتہ فہرست میں نام موجود تھا۔ بہر حال امید ہے آئندہ کا جب بھائی خیال رکھیں گے۔ اب قدم رکھتے ہیں اپنی محفل یعنی ”گفتگو“ میں۔ سب سے پہلا طویل خط ہے جناب سید عبداللہ شاہ حیدر آباد کا۔ اعزازی پرچہ پوسٹ میں آپ کے پڑوسی کو دے گیا۔ اس کی یہ کوئی اتنی قابل دست اندازی محکمہ ذاکہ نہیں یعنی آپ کے پڑوسی کی زیادتی بلکہ بے حسمی ہے۔ آپ کی تالی اماں کی وفات کا پڑھ کر دلی سدمہ ہوا۔ خدا پیڑا و برتر ان کو جنت الفردوس میں جلد دے۔ اور توہن کو سبر ٹیبل مطاف فرمائے آمین۔ میری تحریر کردہ گفتگو کہانی ”قاتل کون“ کو نمبر ون دینے پر بہت مشکور و ممنون ہوں۔ آپ کی باقی باتیں بھی میں نے پلے بانہ لی ہیں۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی بھائی اس بار بھی آپ کا خط خوب صورت لفظوں کا مرقع ہے۔ ہر بات کا تفصیلی احاطہ کرنا آپ کا کام ہے۔ کراچی کے حالات دن بدن خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اللہ ہمارے پاک وطن کو سلامت رکھے۔ میرا تبصرہ شعر اور کہانی پسند کرنے کا بے حد شکر یہ۔ ”ذوق آگہی“ میں آپ کا انتخاب لاجواب ہے۔ جناب عبدالملک کیف ہم نے رسالہ بچھلے ماہ میں امدادی سے نکال لیا تھا۔ آپ کے خیالات بہت اچھے اور بلند ہیں۔ فقیر محمد بخش صابر لنگاہ صاحب آپ کا طویل خط پڑھ کر آپ کے حالات سے آگاہی ہوئی۔ بھائی یہ دنیا ہے یہاں پر ہر قسم کے لوگ ہیں۔ بغیر سوچے سمجھے الزام تراشیاں کرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ دوسروں کے دلوں پر کیا بٹے گی؟ ایسے لوگ سزا کے مستحق ہیں۔ ویسے آپ بڑے دل گردے والے ہیں۔ سب کچھ برداشت کر گئے۔ ان شاء اللہ اچھا ہی ہوگا۔ اس باری تعالیٰ سے امید لگالیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے آپ نے اچھا کیا کہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا۔ سید اکاش بخاری بھائی کافی عرصے بعد آپ کی حاضر ہوئی۔ آپ نے بھی اپنے دل کے کچھ چھپو لے پھوڑے۔ یہاں تو کسی طرف بھی انصاف اور احساس نظر نہیں آ رہا۔ خدا ہی صاحب اختیار لوگوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ بات احساس اور انصاف کی چل نکلی ہے۔ تو عرض کرتا چلوں سنا بھی ہے اور پڑھا بھی ہے کہ شیطان رمضان المبارک میں قید کر دیا جاتا ہے۔ لیکن رمضان مبارک میں اشیائے خورد و نوش کی بوشر یا قیوتوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ شیطان کسی نہ کسی راستے سے ایسے بے جا منافع خوروں کو درغلا تا رہتا ہے۔ سب سے افسوس ناک اور شرم ناک صورت حال یا بات یہ ہے کہ کچھ اللہ کے بندے یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ یہی مہینہ تو کمانے کا ہے۔ بہر حال بات کہان

مقدر ہو۔ گردش کے ایوان اوصاف ایم اے صاحب راؤ محمد فہد صاحب راؤ محمد چاند صاحب سرور شاہ صاحب زویہ شاہ صاحبہ بل ڈاگ کے اقبال بھٹی صاحبہ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب محترم دول بہار ہستی۔ دل میں بسنے والا ارشاد احمد قریشی صاحب اور میں آزاد صاحب تاریخ کے نمودار ہیں۔ چوہدری نور الٰہی جٹ صاحب حمیرا فیض بخاری صاحبہ نذر حسین آصف صاحب صاحب زادی حنا ناز صاحبہ ظفر شاین صاحبہ سید فیاض احمد کاش بخاری صاحبہ محمد خان مجاہد صاحبہ سید محمد عبداللہ شاہ صاحبہ راؤ شہر یار صاحبہ فیض عباس لنگاہ صاحبہ قمر جہاں صاحبہ طاہرہ جہیں تارا صاحبہ محمود احمد مووی صاحبہ محمد سلیم اختر صاحبہ ادارہ نئے افق پبلشرز مصور صاحبان زین نقوی صاحبہ اسرار احمد صاحبہ صائمہ ناصر صاحبہ محمد عبداللہ عاطر صاحبہ عبدالمالک کیف صاحبہ احمد علی کیف صاحبہ سلمیٰ غزل صاحبہ صاحبہ زادی این شاین صاحبہ ارسلان علی لاہوری صاحبہ محمد اسلم چوہدری فیصل آباد صاحبہ طاہرہ دیوی شیرازی صاحبہ رانا خالد صاحبہ محمد فاروق ساحلی صاحبہ اللہ دتہ عابد صاحبہ فریدہ جیلانی صاحبہ محمد فاروق انجم صاحبہ بالکل خاموش ہو گئے ہر برادر سامنے تو تاکہ محفل دما بنامہ جگمگائے۔ ناز سلوش شے صاحبہ حسنین بلوچ صاحبہ عبدالحکیم ساجد صاحبہ سمیع جمال صاحبہ عصمت اقبال عین صاحبہ اصغر علی ناصر صاحبہ اور پیاری بیٹی زرینہ طالب حسنین لنگاہ صاحبہ عزیز عمران احمد صاحبہ جن جن عزیزان کے نام تحریر میں لائے گئے وہ میرے دل کی آواز میں سلام محبت و دعائیں اور عید مبارک کا پیغام بذریعہ گفتگو کے سنگ ان تک پہنچنا آپ پر فرض اور قرض ہے۔ باقی سب آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ اس تحریر کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ والسلام

محجابت ناز عباسی رحیم یار خان محترم جناب عمران احمد قریشی صاحب! نہایت ادب و احترام سے السلام علیکم! صد اچھولوں کی طرح مسکراتے رہو امین۔ جناب میں کافی عرصہ سے نئے افق پڑھتا آ رہا ہوں لیکن میں نے لکھنے کی ہمت بھی نہیں کی کئی دفعہ میں نے نئے افق میں لکھنے کے لیے قلم اور کاغذ ہاتھ میں لیتا تھا لیکن میرے ہاتھ رک جاتے تھے لیکن آج میں نے نئے افق میں لکھنے کے لیے مجبور ہو گیا ہوں اور مجھے مجبور کیا ہے حسام بٹ نے جن کی تحریر ”مراد منزل“ پڑھ کر میں اپنے آپ کو روک نہ سکا اور میں نے لکھنا شروع کر دیا۔ بٹ صاحب کیسے ہو جناب؟ آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ آپ نے بہت اچھی تحریر لکھی ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ نئے افق میں اسی طرح بہت اچھی تحریریں لکھتے رہیں۔ آسیہ لطیف کی تحریر ”مقصد حیات“ بھی بہت پسند آئی۔ سر میں نے بھی ایک تحریر لکھ رکھی ہے لیکن نئے افق میں بھیجے سے گھبراتا ہوں کہ شاید مجھے نئے افق میں جگہ نہ ملے اور میں بہت نرم دل کا ہوں اور میں دل چھوٹا کر جاؤں گا کہ میری تحریر کو نئے افق میں جگہ نہیں ملی سر اگر آپ میری حوصلہ افزائی کریں گے تو میں اپنی تحریر نئے افق کو ضرور بھیجوں گا۔ آخر میں تمام نئے افق پڑھنے والوں اور تمام نئے افق اسلاف کو سلام اور عید الفطر مبارک ہو۔ والسلام

محمد ارشاد قریشی اسلام آباد۔ محترم بھائی عمران السلام علیکم! امید ہے آپ سب لوگ خیریت سے ہوں گے۔ کچھ مصروفیت کی وجہ سے غیر حاضر رہا۔ اب حاضری لینی ہوگی۔ میں

اپنی اس محفل میں شریک ہو کر اپنے سب دوستوں کو سلام پیش کرتا ہوں۔ اس دعا کے ساتھ کہ آپ سب پر میرے رب کریم کی طرف سے رحمت ہو (آمین)۔ موت برحق ہے کسی کو کچھ پتا نہیں کہ اب کس نے طے جانا ہے۔ والد محترم کے انتقال کے بعد میری ذمہ داریوں میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ مگر حالات جو بھی ہوں زندگی اور وقت کو گزارنا تو ہے۔ آج میں سب سے پہلے اپنے ان بہن بھائیوں کا نام لے کر شکر یہ ادا کروں گا۔ جنہوں نے نئے افق فون اور پیغام کے ذریعے مجھ سے تعزیت کی۔ جناب فقیر محمد بخش صابر لنگاہ حسنین و فکلین صابر لنگاہ احمد علی کیف وقاص احمد کی ملک ظفر شاین عبدالحکیم ساجد رسلان علی محمد عبداللہ عاطر عبدالمالک کیف محمد فہد جتوئی سید آکاش بخاری طاہرہ جہیں تارا شہناز بانو شہینی ارشاد۔ پروردگار آپ سب کو بے شمار خوشیاں عطا فرمائے آمین۔ اگست کا شمارہ میرے سامنے ہیں جو بہت ہی خوب صورت ہے اس تمام کاوش پر میں عمران بھائی اور ان کی محنتی ٹیم کو مبارک باد دیتا ہوں۔ کہانیوں میں راحیلہ تاج کی (ازالہ) آسیہ لطیف کی (مقصد حیات) اسرار احمد کی (بہانہ) صائمہ ناصر کی (شرط) شہناز بانو کی (سچا موتی) پسند آئیں۔ باقی کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ خوش بو سخن میں عبدالمالک کیف اور فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب کی حمد ولعت شریف اچھی لگی۔ طاہرہ جہیں ریحانہ سعیدہ عبدالحکیم ساجد حسنین عباس بلوچ سرور شاہ عالیہ انعام الہی نے غزلوں میں اپنا معیار برقرار رکھا۔ رمضان شریف کا بہت مہینہ ہم سب گزار رہے ہیں۔ اس ماہ میں 14 اگست بھی ہے اور آپ سب دیکھ رہے ہیں کہ ملک کے حالات روز بہ روز بگڑ رہے ہیں۔ امن کا صرف نام ہے امن ہے نہیں۔ کبھی ہم کی پارٹی کو بدنام داتا دیکھتے ہیں۔ کبھی کسی لیڈر کو اور اب تو جن پر ہمیں فخر تھا اور ہے اب ہم ان کو بھی بدنام کر رہے ہیں۔ بدامنی لوز شید تک مہنگائی روز قیامتوں کا بڑھتا۔ ان تمام نے ہر آدمی کو پریشان کیا ہوا ہے۔ آج میں ہر دل عزیز نئے افق کے پلیٹ فارم سے سب سے گزارش کر رہا ہوں کہ یہ ملک اللہ نے ہمیں دیا ہے۔ ہمیں اس ملک اس ملک کی قابل خرافوج اور غیور عوام ان سب کو اپنی تحریروں کے ذریعے حفاظت عزت اور زندگی کا پیغام دینا ہے۔ کوئی کچھ بھی کرے یہ میرے مالک کا فیصلہ ہے کہ یہ ملک شاد و آباد رہے گا۔ صرف چہرے بدلیں گے میں آخر میں سب دوستوں کا شکر یہ ادا کرتا ہوں جو مجھ کو یاد رکھتے ہیں۔

عصمت اقبال عین۔ منگلا ڈیم! عمران بھائی السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ پہلے تو میں آپ کی بے حد مشکور ہوں کہ آپ نے اگست کے شمارے میں میرا خط شامل کیا اور ستمبر کے شمارے میں میری غزل شامل کی یقیناً جانیں اس قدر خوش ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتی۔ خط لکھنے میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ مصروف بھی۔ شاعری کے علاوہ میرا مشغلہ پینٹنگ بھی ہے اور میں ایک پروجیکٹ پر کام کر رہی تھی جس کی وجہ سے بزم گفتگو میں حاضری نہ ہو سکی۔ میں اپنے ان تمام بھائیوں کی مشکور ہوں جنہوں نے مجھے اس محفل میں خوش آمدید کہا۔ جن میں سید عبداللہ شاہ حیدر آباد ابن مقبول جاوید احمد صدیقی عبدالمالک کیف فقیر محمد بخش صابر لنگاہ اور ریاض بٹ حسن ابدال شامل ہیں۔ بزم گفتگو کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی وہ یہ کہ اس بزم کے تمام احباب ایک دوسرے کے لیے

مظل کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ احمد علی کیف صاحب غیر حاضری کیوں بھیجی۔ سب کو میری طرف سے سلام ایڈمید مبارک۔ سب کے محبت نامے پڑھے اور سب کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔ خاص کر فقیر محمد بخش کے لیے دعا کہ اللہ پاک انہیں مشکلات سے نجات عطا فرمائے آمین۔ دعائیں کرتے کرتے ہم اقرائیں پہنچے۔ ”صدق و امانت اور کذب و خیانت“ مضمون پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف احادیث پڑھ کر ایمان تازہ کیا۔ واقعی سچ بولنے سے ہر مصیبت سے نجات ملتی ہے۔ اس کے بعد کہانیوں کی طرف ورت لگائی۔ کش کش میں جھلا ہو گئے کہ پہلے کون سی پڑھیں۔ کیونکہ سب کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں خاص کر بحر اسود گردش پکار خیر پکار کی آخری قسط پڑھی جس نے آخری طور تک اپنے سحر میں جھلا رکھا۔ ”مشل حوزہ“ ریحانہ سعیدہ ”خواہش“ طاہرہ دیوبی ”بد بخت“ زین نقوی کی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ دوسری کہانیاں زیر مطالعہ ہیں ورنہ تبصرہ نہ کر پاؤں گا۔ بزم سخن خوش بوخن کی سلیکشن اچھی تھی اپنی کوئی غزل نظم نہ پا کر تھوڑا سا دکھ ہوا بزم سخن کے لیے کتنے اشعار روانہ کیے ایک بھی شائع نہ ہوا کیوں؟ عمران قریشی صاحب ایک عدد اسٹوری ”انوکھی واردات“ کے نام سے بھیج رہا ہوں۔ اگر معیار پر پوری اترے تو نوک پلک سنوار کر قریشی اشاعت میں جگہ دے کر شکر یہ کاموقع دیں۔ نئے افق کے لیے پہلی دفعہ کہانی لکھی ہے کہ نئے افق نے جو حوصلہ عطا کیا ہے لکھنے کی طاقت عطا کی ہے۔ اس کے لیے تھوڑی سی کوشش کی ہے۔ والسلام

بشیر احمد بھٹٹی..... بسا ہاوی پور۔ عزیزان محترم عمران احمد صاحب آداب ”بحر اسود“ کے اس پار ”زبردست تاریخی کہانی ہے۔ سبب سے بھرپور اس کہانی نے سحر طاری کر دیا ہے۔ مجھے دوسرے قارئین کا تو پتا نہیں بہر حال میں اس کہانی کی گرفت میں آ گیا ہوں۔ ہر ماہ نئے افق کا انتظار رہتا ہے۔ محترم بحر اسود کی قسط کے نمبروں میں غلطی ہو گئی ہے سو اس صبح کا چھوٹا سا اشتہار دے کر درست فرمائیں۔ فروری 2011ء کے شمارے میں اس کی پہلی قسط شائع ہوئی ہے۔ مارچ میں قسط نمبر 2 شائع ہوئی ہے۔ اپریل میں قسط نمبر 3 شائع ہوئی ہے۔ مئی میں قسط نمبر 4 شائع ہوئی ہے مگر غلطی سے قسط نمبر 3 شائع کر دیا گیا۔ اپریل اور مئی میں قسط کو 3 لکھا گیا ہے۔ جون میں قسط نمبر 5 کو 4 کر دیا گیا ہے۔ اس طرح جولائی میں قسط نمبر 6 کو 5 لکھا گیا ہے۔ پھر اگست میں قسط نمبر 7 لکھا گیا ہے۔ 5 کے بعد اک دم 7 کا ہندسہ نئے قارئین کوشش و تش میں ڈال دے گا۔ بہتر ہے کہ آپ اک چھوٹے سے اشتہار کے ذریعے قارئین پر واضح کر دیں کہ قسط نمبر 3 اور 4 کو دوبار تین لکھ کر غلطی ہوئی ہے۔ مئی کے شمارے کی قسط نمبر 3 کو 4 پڑھائے جائے۔ اس طرح قسطوں کے نمبروں کی ترتیب صحیح ہو جائے گی۔ والسلام (محترم بھٹی صاحب غلطی کی نشاندہی کا شکریہ۔ پر جا وقت پرانے کی کوشش میں ایسی چھوٹی موٹی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ بہر حال بحر اسود اب اختتام پذیر ہو گئی ہے۔ آئندہ احتیاط کریں گے)۔

پر خلوص اپنائیت رکھتے ہیں اور نئے آنے والوں کو کھلے دل سے ویلکم کرتے ہیں۔ اب رسالے کی طرف آتی ہوں سرورق اچھا تھا پیچھے جو نقاب پوش لڑکی دکھائی گئی اس کا انداز تو خوب صورت تھا لیکن اس کی آنکھوں کا رنگ زیادہ لائٹ کر دیا۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی نے ملک کی جو سیاسی اور معاشی صورت حال بیان کی ہے وہ تقریباً تمام خپ وطن پاکستانیوں کے دل کی آواز ہے۔ اقرائیں طاہر قریشی صاحب نے صدق و امانت اور کذب و خیانت پر ایمان افروز احادیث کا انتخاب کیا۔ ذوق آگہی میں بہت سی اچھی باتیں پڑھنے کو ملیں۔ خوشبوخن کی تمام غزلیں اور نظمیں اچھی تھیں لیکن جو زیادہ اچھی ملیں ان میں محمد اسلم جاوید ”میشم علی آغا“ عمر احمد صدیقی اور محمد عبداللہ عاطر کی غزلیں شامل ہیں۔ بزم سخن سب کا پسندیدہ سلسلہ ہے جہاں تک کہانیوں کا تعلق ہے سب سے پہلے آخری کہانی پڑھتی ہوں اور بعد میں دوسری تحریریں۔ طاہرہ شیرازی کی ”خواہش“ اور ریاض بٹ کی چھندہ اچھی لگی۔ آخر میں نئے افق کے تمام قارئین کو سلام۔ میری کوئی بات اچھی نہ لگی ہو تو اس کے لیے معذرت۔ رب اعزت ہمارے ملک کو اپنی رحمت کے سامنے میں رکھے آمین۔

عبدالمالک کیف..... منچن آباد۔ ماہنامہ ”نئے افق“ ستمبر 2011ء کے لیے دکان سے چٹا کیا تو نہ تھا لیکن باکر کو فون کیا کہا کل لے جانا مگر بے سود آخر مجبور ہو کر 27 تاریخ کو صادق آباد جانا پڑا بڑی نیوز ایجنسی سے چٹا کیا اس نے کہا ختم ہو گیا ہے۔ بڑی پریشانی ہوئی آخر دوسری چھوٹے سی دکان ”اتفاق بک اسٹال“ سے چٹا کیا تو اس نے کہا ہے تب جا کے جیسے سانس چل پڑی شکر کیا۔ گاؤں سے سبھر پور شہر جانا ہوتا ہے پھر اس سے صادق آباد تب کہیں جا کر ہمارا یہ دارا ”نئے افق“ ہمارے ساتھ چلنے پر راضی ہوتا ہے۔ (اب کیا کریں محبت کی ہے تو خرے تو اٹھانے پڑے گے)۔ بہر حال عید مبارک کے ساتھ تبصرہ کا شمار پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ نیلے سوٹ میں مایوس اک صنف نازک ہاتھوں میں بھی بلورنگ کی چوڑیاں پہنے چمک رہی تھی اور آنکھوں میں ایک چہرے پرے کا ڈالا ہوا تھا۔ ہماری پرانی پاکستانی فلموں کی ہیروئن کی طرح پیچھے کوئی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ شاید سرمہ اس کے گھر سے چرایا گیا تھا۔ خیر سرمہ کہیں سے چرایا گیا مگر بڑی بڑی گول گول آنکھوں میں بڑی کشش پائی جاتی تھی۔ دستک میں کون بنے گا کروڑ پتی۔ میں تو بڑا خوش ہوا کہ ایسا بھ پچن کے پروگرام میں ہم غریب نہ پہنچ پائے ”نئے افق“ میں بھی یہ سلسلہ شروع ہوا ہے شاید۔ ”تو اس میں ضرور شامل ہوں گے اور جیتیں گے۔ آگے پڑھا تو پتا چلا یا یہ تو ٹاپک ہے ہمارے پیارے ملک کے حالات پر لکھا گیا۔ مشتاق قریشی صاحب نے ہماری سیاست ”غریب مکاؤ جان چھڑاؤ“ کے تحت چلنے والی سیاسی روش پر آئینہ دکھایا۔ بلکہ زبردست لکھا۔ مگر ہمارے ملک کے سیاسی مداری اتنے پتھر دل ہو چکے ہیں حرام کھا کھا کے ان کی جیبیں اتنی گر چکی ہیں کہ اپنے فائدے کے علاوہ انہیں کچھ دکھتا ہی نہیں۔ محفل گفتگو میں قدم رکھا محفل میں موجود چہروں سید عبداللہ شاہد محمد اسلم جاوید ابن مقبول جاوید احمد صدیقی فقیر محمد بخش انکاہ ایڈیٹریل ریاض بٹ محمد عبداللہ عاطر بڑے عرصے بعد دکھائی دیے۔ جناب سید آکاش بخاری صاحب سب لوگ مختلف شہروں سے آ کر اس

اختر

ترتیب: طاہر قریشی

تجارت میں صدق و امانت:-

(۱۹۷)

(ترجمہ) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

سچا اور امانت دار سوداگر انبیاء صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔

(جامع ترمذی، مسند دارمی، سنن دارقطنی)

(تشریح) اس حدیث نے واضح طور پر یہ بھی بتایا کہ قرب خداوندی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات حاصل کرنے کے لیے بھی دنیا اور مشاغل دنیا چھوڑنا ضروری نہیں بلکہ ایک سوداگر بازار میں بیٹھ کر اللہ و رسول کے احکام کی فرمانبرداری اور صدق و امانت جیسے دینی قوانین کی پابندی کے ذریعہ آخرت میں حضرات انبیاء اور صدیقین و شہداء کی معیت اور رفاقت تک حاصل کر سکتا ہے۔

(۱۹۸)

(ترجمہ) عبید بن رفاعہ اپنے والد ماجد حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث روایت کی کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ:- تاجر لوگ قیامت کے دن بدکار اٹھائے جائیں گے (یعنی عام تاجروں کا حشر بدکاروں کا سا ہوگا) سوائے ان (خدا ترس اور خدا پرست) تاجروں کے جنہوں نے اپنی تجارت میں تقویٰ کی اور حسن سلوک اور سچائی کو برتا ہوگا۔

(جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی)

جھوٹ اور خیانت ایمان کے منافی ہیں:-

(۱۹۹)

(ترجمہ) حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:- مومن کی طبیعت اور فطرت میں ہر خصلت کی گنجائش ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے۔

(مسند احمد، شعب الایمان، المصنوع)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ مومن اگر واقعی مومن ہو تو جھوٹ اور خیانت کی اس کی فطرت میں گنجائش نہیں ہو سکتی دوسری برائیاں اور کمزوریاں اس میں ہو سکتی ہیں لیکن خیانت اور جھوٹ جیسی خالص منافقانہ

عادتیں ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں پس اگر کسی میں یہ بری عادتیں موجود ہوں تو اسے سمجھنا چاہئے کہ اس کو ایمان کی حقیقت ابھی نصیب نہیں ہوئی ہے اور اگر اپنی اس محرومی پر وہ مطمئن نہیں رہنا چاہتا ہے تو اس کو ان خلاف ایمان عادتوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنا چاہئے۔

جھوٹ کی گندگی اور سرائند:-

(۲۰۰)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کے جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے ایک میل دور چلا جاتا ہے۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) جس طرح اس مادی عالم کی مادی چیزوں میں خوشبو اور بدبو ہوتی ہے اسی طرح اچھے اور برے اعمال اور کلمات میں بھی خوشبو اور بدبو ہوتی ہے جس کو اللہ کے فرشتے اسی طرح محسوس کرتے ہیں جس طرح ہم یہاں کی مادی خوشبو اور بدبو کو محسوس کرتے ہیں اور کبھی کبھی وہ اللہ کے بندے بھی اس کو محسوس کرتے ہیں جن کی روحانیت ان کی مادیت پر غالب آ جاتی ہے۔

بڑی سخت خیانت:-

(۲۰۱)

(ترجمہ) سفیان بن اسید حضری سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خودنا ہے آپ فرماتے تھے:- یہ بہت ہی بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات جھوٹی بیان کرو جب کہ وہ تم کو اس بیان میں سچا سمجھتا ہو۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ جھوٹ اگرچہ بہر حال گناہ ہے اور بہت سنگین گناہ ہے لیکن بعض خاص صورتوں میں اس کی یہ سنگینی اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے ان ہی صورتوں میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک شخص تم پر پورا بھروسہ اور اعتبار کرے اور تم کو بالکل سچا سمجھنے اور تم اس کے اعتبار اور حسن ظن سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس سے جھوٹ بولو اور اس کو دھوکا دو۔

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانی)



ادریس آزاد

ادریس آزاد

فاروقین کرام! عام طور پر ہمارے ذہنوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ شاید مسلمان معالک صدیوں سے ذلت و پستی کی زندگی گزار رہے ہیں لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارویں صدی کے ابتدائی عرصہ تک خلافت اسلامیہ کا سورج پوری دنیا پر چمکتا تھا اور ترکوں کا لوہا دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے طور پر مانا جاتا تھا تو ہم دنگ رہ جاتے ہیں یہ صدیوں سے پستی کی زندگی میں نہیں البتہ یہ سچ ہے کہ ہم صدیوں سے غفلت کی نیند سو رہے ہیں بغداد کی پہلی تباہی تاتاریوں کے ہاتھوں عمل میں آئی لیکن اسلام کی برکتوں سے ایک دن ایسا آیا کہ تاتاری خود مسلمان ہو گئے جسما کہ علامہ اقبال کا ایک شعر ہے

ہے عواں سورخ تاتار کے افسانے سے
ہاسمیاں مل گئے کعبے کے صدمہ خانے سے

یہ مابول ترکوں کے نور شجاعت کی آخری کہانیوں میں سے ایک ہے جب ترک دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھے اور برقص کا ویانی (ترک فوج کا جھنڈا) کا ساپہ پورے یونان، مصر، عراق، یمن، کریمیا اور بلغاریہ تک پھیلا ہوا تھا

تاریخ پسند قارئین کے لیے ادریس آزاد کا دلکش و مغرور ترجمہ

شیراز کو ایسے لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ ملاقات جہاں ترک فوجوں کے گھوڑے دندناتے پھر رہے تھے، مادام تھریشیا کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ شیراز نے اپنے سر کو زور سے جھکا دیا اور یہ دیکھنے کے لیے کہ نہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا، اسے انگوٹھے پر کانٹا لکھنا اسے درد کا زرا بھی احساس نہ ہوا۔ تو گویا وہ جی جی خواب دیکھ رہا تھا۔ اسے درد کا احساس کیسے ہوتا۔ اس نے مادام تھریشیا کے بعد بھی سے اترنے والی خاتون کو بھی دیکھ لیا تھا۔ شیراز کے انگوٹھے پر اس کے دانٹوں نے ڈھمبن دیا لیکن اس کے منہ سے یہ نہ نکلی۔ ایک عجیب احساس کی لہر اس کی ہڈیوں کے گودے میں دوڑ گئی۔ دوسری خاتون کو دیکھتے ہی اسے سب کچھ بھول گیا۔ وہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ اور کس کام سے یہاں آیا ہے؟ وہ ہکا بکا بھڑا سا مزہ کولے چرچ کے سامنے رکھی بھی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تھیوڈورا تھی۔ مادام تھریشیا کی بیٹی تھیوڈورا لائیسیم کی وہ ڈھن اور حسین طالبہ تھی جو چاہتے تو دنیا کی ہیبت میں بہل کی طرح چپک چپک کر باتیں کیا کرتی تھی۔ نہ جانے کتنے دن شیراز اور تھیوڈورا نے لائیسیم کی روشوں پر ٹپکتے ٹپکتے

گزار دیے تھے۔ ماں! وہی تھیوڈورا شیراز کے سامنے تھی۔ شیراز کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن یہ سب جاک تھا۔ خواب نہیں تھا۔ سورج اتنی کی اوٹ سے پوری طرح نکل کر ایک گول تھال کی طرح مشرق میں چمکنے لگا۔ اب شیراز کا چٹان کی اوٹ میں کھڑے رہنا بے فائدہ تھا۔ وہ ہر طرف سے دیکھا جا سکتا تھا۔ شیراز نے اپنے گھوڑے کو چٹان میں ابھرے ہوئے ایک پتھر کے ساتھ باندھا اور خود ذلیلے ڈھالے قدم اٹھاتا بستی کی طرف بڑھنے لگا۔ چرچ کے سامنے رکنے والی بھی میں سے مادام تھریشیا اور اس کی بیٹی ہی اتری تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ کوئی محافظ تھا اور نہ کوئی سپاہی۔ خائبہ! انہیں اس بات کا احساس تھا کہ وہ دشمن کے علاقے میں ہیں۔ لیکن اس کا کوچاں بھی اتر کر چرچ میں چلا گیا۔ اب شیراز کو چرچ کے سامنے صرف بھی کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ شیراز مختلف پتھروں اور چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا اس طرح بستی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ چرچ کا دروازہ مسلسل اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اس نے گھوڑا اسی لیے چھوڑ دیا تھا کہ کہیں وہ دیکھ نہ لیا جائے۔ شیراز بستی کی جانب اسی لیے بڑھ رہا تھا کہ شاید اسے وہاں کوئی ترک

اور ہستی کے دیہاتی عیسائی باشندے روفیہ سے انجس کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

عیسائیوں کی اس چھوٹی سی ہستی میں روفیہ کی بہت عزت تھی لیکن گزشتہ کئی ماہ سے وہ بڑی بڑی خبریں سن رہی تھی۔ پہلے اسے بتایا جاتا رہا کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان بڑی جنگ ہونے والی ہے۔ پھر کسی نے کہا کہ پیٹر اعظم کی افواج باسکو سے چس پڑی ہیں۔ پھر کچھ روز بعد اسے معلوم ہوا کہ استنبول سے مسلمان لشکر بھی مولڈیویا کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ روفیہ شب و روز خداوند یسوع مسیح کے آئے لڑائی اور دعا کرتی کہ۔

”خداوند انسانوں کو انسانوں کا خون کرنے سے بچا۔“
لیکن اس کی ایک دعا بھی قبول نہ ہوئی۔ اس کے برعکس دونوں لشکر روفیہ کے نزدیک ہی ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ کچھ روز پہلے اس نے ترک سپاہیوں کو دیکھا تھا جن کے دستے ہستی میں گھس آئے تھے۔ ترک فوجی روفیہ کے چرچ میں بھی دندناتے ہوئے داخل ہو گئے تھے۔ تب روفیہ کو یہ پتا چلا کہ صلیبی افواج کو مسلمانوں نے گھیر لیا ہے اور وہ شب و روز ایک ہی دعا کرنے لگی۔

”اے مالک! انسانوں کو انسانوں کا خون کرنے سے بچا۔“
دن لڑتے گئے اور روفیہ آئے روز نئی نئی خبریں سننے لگی۔ کسی نے کہا کہ مسلمان سپاہی ظالم درندے ہوتے ہیں اور ایک ایک عیسائی کو چن چن کر مار دینے کا عزم رکھتے ہیں۔ روفیہ کا دل کانپ گیا لیکن اس نے اپنی دعائیں جاری رکھیں۔ اب اس کی عمر ساٹھ سے اوپر تھی۔ بیس سال پہلے جب مادام تھروشیا ایک حسین اور جوان لڑکی تھی تو روفیہ اس وقت چالیس سال کی پختہ کار عورت تھی۔ لیکن ساٹھ سالہ روفیہ جسمانی طور پر بالکل تندرست اور صحت مند تھی۔ گزشتہ شب روفیہ کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ تقریباً آدھی رات کے وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ روفیہ نے دروازہ کھولا تو

ملکہ کا تاج پہنتی تھی۔ کارپوس کے بچے کی ماں بننے والی تھی لیکن اسے بنیوں سے نفرت تھی۔ وہ مقدونیا کے تاج و تخت کا وارث جانتی تھی۔ اسی پائلین نے اسے ایک بھیا تک کیل تھیلے پر اکسایا۔ اس کیل میں سب سے بڑا کردار روفیہ اور کرنے والی تھی۔ نرس روفیہ دل سے ایک نیک عورت تھی لیکن وقت کی ملکہ کے احکامات کو رد کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھا۔ روفیہ نے ہائی بھر لی۔

مادام تھروشیا نے اپنے وقت پر ایک خوب صورت چاند جیسی بچی کو جنم دیا لیکن روفیہ نے کمال مہارت سے بچے کو بدل دیا۔ مادام تھروشیا کا حکم تھا کہ کسی مسلمان کا بھی اس کی گود میں نہ ڈالا جائے اور روفیہ یہی ملطی کر بیٹھی تھی۔ اس نے ایک مسلمان آہن گر کو نوملود بچہ مادام تھروشیا کی بچی سے بدل دیا تھا۔ کلاؤپوس مادام تھروشیا کا بیٹا نہیں تھا۔ کلاؤپوس اس مسلمان آہن گر کا بیٹا تھا۔ گو باشر زکا بھائی۔ روفیہ نے یہ سوچا کہ اگر مادام تھروشیا کو پتا چلا کہ اس کی گود میں کسی مسلمان کا بچہ ڈالا گیا ہے تو وہ غصے اور اشتعال میں زمین و آسمان ایک کر دے گی۔ روفیہ گھبرا گئی اور اس نے فی الفور مقدونیا سے نکل بھاگنے کا فیصلہ کیا۔

مقدونیا کے چرچ سے نکل کر وہ مختلف شہروں اور ملکوں کے گرجا گھروں میں گھومتی رہی لیکن اس کی روح کو کہیں بھی چین نہ ملا۔ بالآخر آج سے سات سال پہلے روفیہ کے قدم دریائے پرچ کے کنارے اس چھوٹے سے تنہا اور ویران چرچ میں آ کر رک گئے۔ یہاں روفیہ کی روح کو قرار ملا اور اس نے اس ویران چرچ کو آباد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب سے روفیہ یہاں آئی تھی ہستی والے بہت خوش تھے۔ ان کے چرچ میں نہ تو کوئی پادری تھا اور نہ ربابہ۔ روفیہ چرچ میں ہی رہنے لگی۔ یہ ایک بڑے سے کمرے پر مشتمل ایک سادہ سا گرجا گھر تھا۔ چرچ کے کمرے میں ایک طرف روفیہ نے اپنے رہنے کے لیے لکڑی کی چھوٹی سی کھڑی بنالی۔ اب وہ گزشتہ سات سال سے نہ صرف اس چرچ کی دیکھ بھال کر رہی تھی بلکہ ہر اتوار کو باقاعدہ عبادت کا اہتمام ہوتا تھا

سمجھ میں بہت سی باتیں آ رہی تھیں۔ وہ مشکوک سا یہ یقیناً رات کی تاریکی میں روی لشکر سے ہو کر آیا تھا۔ گویا دشمن دریا کے راستے بہت آسانی سے پیغام رسائی کر رہا تھا اور بلط جی کے افسر اس صورت حال سے بے خبر تھے۔ خود شیراز کی تمام تر جاسوسی دھری کی دھری رو گئی تھی۔ اس نے بھی دریا کی طرف توجہ ہی نہ دی تھی۔ وہ مطمئن تھا کہ تیز رو دریائے پرچھ میں گھوڑا ڈالنا کسی بزدل عیسائی کے بس کی بات نہیں لیکن اب وہ اچھی طرح جان گیا تھا کہ دشمن نے دریا کو ہی اپنی آخری کیل نجات سمجھا تھا۔

شیراز ابھی یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا ایک اس کی نظر بھی لے کر چلا پڑا۔ وہ چرچ سے نکل کر متلاشی نگاہوں کے ساتھ چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے چرچ کے گرد گرد گھوم کر ہر طرف سے جائزہ لینے کی کوشش کی۔ شیراز کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ چرچ میں پناہ لینے والے جانا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ مادام تھروشیا کا کو جوان چرچ سے باہر نکل کر حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ سوچ کر شیراز کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ فوری طور پر ان لوگوں کا پتہ چھانیں کہ پانے کا کیونکہ اب اس کے پاس صوز ابھی نہیں تھا اور وہ بہت دور نکل آیا تھا۔ شیراز بے ساختہ ہاتھ ملنے لگا۔

”روفیہ“ بیس سال پہلے ہی مقدونیا کو چھوڑ کر کہیں چل گئی تھی۔ وہ مقدونیا کے ایک چرچ میں نرس تھی لیکن آج سے بیس سال پہلے وہ ایک گناہ کر بیٹھی تھی جس کی پاداش میں اس نے خود کو بہت بڑی سزا دی تھی۔ اس نے اپنی پوری زندگی کو بچ کر دیا تھا۔ روفیہ بیس سال پہلے مقدونیا میں رہتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مقدونیا میں یونانی سردار کارپوس نے ایک بڑی بغاوت کے نتیجے میں اپنی پادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس عارضی بادشاہ کی ملکہ غصہ و تھروشیا ہی تھی۔ مادام تھروشیا نے گرجا گھر کی نرس روفیہ کو اپنے شاہی محل میں بلوا کر یہ حکم دیا تھا کہ اسے بیٹا چاہیے۔ نو جوان اور حسین مادام تھروشیا جو بیس سال پہلے مقدونیا کی

سپاہی مل جائے۔ آخر یہ عیسائیوں کی ہستی تھی اور یقیناً ترک افسروں نے اسے ہستی کو اپنی نظر میں رکھا ہوگا لیکن چند گھنٹوں قبل جب شیراز ہستی کے قریب سے گزرا تھا تو اسے ترک فوج کا کوئی سپاہی دکھائی نہ دیا تھا۔ یہ علاقہ شیراز کی نگہ رانی میں نہیں آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شیراز کو معلوم نہیں تھا کہ ہستی میں کوئی ترک سپاہی اسے مل سکتا گیا نہیں۔ مادام تھروشیا کو یوں کھلم کھلا اس ہستی کی طرف آتا دیکھ کر شیراز سوچنے لگا کہ ترک فوجی افسر اپنی بالادستی کی وجہ سے اس قدر بے پروا ہو گئے ہیں۔ وہ وادی جس میں شہنشاہ روس محصور تھا یہاں سے دور نہیں تھی۔ پہاڑوں کی اس چار دیواری سے نکل کر آنے والا دریائے پرچھ چند سو قدم کے فاصلے پر ہی اس ہستی کو سیراب کرتا تھا۔ اگر دشمن کی کمک یعنی آسٹری فوج دریائے کے پتھوں سے گزرنے کی ہمت کر لیتی تو اس کے لیے آس پاس کی پہاڑیوں پر قبضہ کرنا دشوار نہیں تھا۔ شیراز دل ہی دل میں ترک افسروں پر افسوس کرنے لگا۔ یہ تو اتفاق تھا کہ اس نے مادام تھروشیا جیسی معروف عورت کو دیکھ لیا تھا اور اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ دشمن کی کمک قریب ہی کہیں موجود ہے۔ اگر وہ اتفاق سے اس طرف نہ آتا تو ترک فوج کو کبھی پتہ نہ چلتا کہ یوں ان کے پہلو میں لینے دریا کے پتھوں سے آسٹری فوج کے دستے شہنشاہ روس کو بازیاں سروانے کے لیے آ چکے ہیں گے۔ ابھی شیراز کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ مادام تھروشیا اپنے ہمراہ آسٹری فوج کی کمک لائی ہوگی۔ البتہ اسے یہ یقین ضرور تھا کہ چرچ کی پراسرار عمارت میں ترک فوج کے خلاف کسی سازش کا چال نہ بنا جا رہا ہے۔

شیراز کی جنگی طبع کی یہی پھر ہی سے ہستی تک آیا تھا لیکن یہاں اسے کوئی ترک سپاہی دکھائی نہ دیا۔ شیراز کی نظریں مسلسل چرچ پر پکی ہوئی تھیں لیکن اب وہ چرچ کی عمارت سے بہت دور تھا۔ وہ دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ اگر اسے کوئی ترک دست اپنی مدد کے لیے نہ ملا تو مادام تھروشیا اور وہ مشکوک سا یہ جس کے تعاقب میں شیراز یہاں تک آیا تھا ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ اب شیراز کی

اندرا پال۔ روفیہ اس سے بہت کچھ جانتا تھا۔ وہ بے حد جذباتی اور تھی لیکن کلاڈیوس جلدی میں تھا۔ وہ روفیہ کے پاس نہ رکا اور جس طرح اچانک آیا تھا اسی طرح اچانک واپس چل دیا۔ روفیہ کلاڈیوس کے ساتھ دروازے تک آئی اور اس کے چلے جانے کے بعد دیر تک دروازے میں کھڑی رہی۔ وہ درے کی جانب اڑا چلا جا رہا تھا۔ روفیہ قدرت کے اس کرشمے پر بے حد حیرت زدہ تھی۔ وہ گم سم اسے لکڑی کے کمرے میں لوٹ آئی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کلاڈیوس کا بیٹا اشتر کی طرف گیا ہے اور جلد ہی وہ واپس آئے گا۔

روفیہ سوچنے لگی کہ واپسی پر کلاڈیوس کو سب کچھ بتا کر اپنے من کا بوجھ ہلکا کر لے گی۔ وہ قدرت کے اس کرشمے کو تائید دیتی تھی اور یہی فیصلہ کر کے چرچ کے ہال میں ٹپلنے لگی کہ کلاڈیوس کے واپس آتے ہی وہ کلاڈیوس سے مادام تھریشا کی بابت دریافت کرے گی۔

گھنٹے پر گھنٹے گزر رہے تھے لیکن کلاڈیوس تھا کہ واپس نہ آ رہا تھا۔ روفیہ نے چرچ کا دروازہ مسلسل کھلا رکھ چھوڑا تھا اور پھر صبح سے کچھ دیر پہلے جب ابھی رات کی تاریکی باقی تھی، روفیہ نے کلاڈیوس کے گھوڑے کی

آہٹ سنی۔ وہ تیزی سے چرچ کے دروازے کی جانب بڑھی۔ کلاڈیوس گھوڑے سے اتر رہا تھا۔ وہ بے حد گھبراہٹا ہوا تھا۔ اس نے بڑی نکلت کے ساتھ روفیہ سے کہا۔

”مقدس نن! بہت پریشانی کی بات ہے۔ مجھے اپنا گھوڑا بھی چرچ میں لانا ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ٹھیک نہیں لیکن ایک شخص میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے ختم کر دوں۔ اگر میں نے اسے زندہ چھوڑ دیا تو ہمارے اس خفیہ راستے کا ترک فوج کو پتہ چل جائے گا۔ میں جانتا ہوں وہ یہاں آئے گا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ میں اسی چرچ کی عمارت میں اسے گھیرنا چاہتا ہوں۔ وہ اکیلا ہے۔ اگر آپ مجھ سے تعاون کریں تو ممکن ہو سکتا ہے بصورت دیگر ہم عظیم عیسائی بادشاہ کو لشکر سے نہیں نکال پائیں گے۔ مقدس نن! یہ سچیت کا بہت بڑا نقصان ہوگا۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا!“

اتنا کہہ کر کلاڈیوس نے اپنے گھوڑے کی لگام تھامی اور بے جھجک چرچ کے اندر داخل ہو گیا۔ چرچ میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنا گھوڑا ایک نشست کے پائے سے باندھا اور بڑی تیزی سے گھوڑے کی زین کھول کر اس میں سے چڑے کا ایک تھوڑا نکال لیا۔ اگلے لمحے

کو کیا ہو گیا۔ وہ یوں دالہا نہ انداز میں اس کے ساتھ کیوں لپٹ رہی تھی لیکن روفیہ کے دل پر جو گزری تھی وہ صرف خدا جانتا تھا۔ وہی بچہ جسے بیس سال پہلے اس نے اس کی حقیقی ماں سے جدا کر دیا تھا آج اس کی بوڑھی ہانہوں میں ایک بار پھر پناہ لینے کے لیے آ گیا۔

روفیہ کے دل نے چاہا کہ وہ ابھی اور اسی وقت کلاڈیوس کو سب کچھ سچ بتا دے لیکن کلاڈیوس مضطرب تھا۔ وہ کسمسا کر بوڑھی راہبہ کی ہانہوں سے نکلا اور ایک بار پھر کہنے لگا۔

”مقدس نن! ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ خدا اور سچیت کے لیے۔“

اب روفیہ نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

”ہاں بیٹا، ہاں۔ میں اپنی جان کی بازی لگا کر تمہاری مدد کروں گی۔ تم اندر آ جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”آپ کو کچھ نہیں کرنا، سب کچھ ہم خود کریں گے۔ میرے ہمارے کوئی ساعی نہیں۔ میں ابھی اور اسی وقت دروی لشکر کی طرف جا رہا ہوں۔ مجھے درپائیں سے گزرنا ہوگا اور پہاڑی درہ عبور کر کے دروی لشکر تک پہنچنا ہوگا۔ اگر شہنشاہ اور ملکہ نے میری بات مان لی تو ہم بہت جلد شاید کل رات ہی شہنشاہ اور ملکہ کو انتہائی خفیہ طور پر اسی راستے سے نکال لائیں گے۔ ہمیں اپنے سپاہیوں کو ایک رات کے لیے چھپانا ہے تاکہ آسٹروی فوج کا وہ دستہ جو میرے ہمراہ شہنشاہ کی حفاظت کے لیے آئے گا دشمن کی نظروں میں نہ آ سکے۔ ہمیں یہ سب کچھ رات کی گہری تاریکی میں کرنا ہوگا۔ میں آپ سے یہ سب باتیں چھپا بھی سکتا ہوں لیکن ایک راہبہ پر اعتماد کرنا میرے مذہب کا پہلا سبق ہے۔ اس لیے میں نے آپ کو اپنے راز میں شریک کر لیا۔ آج میں دریا کا تمام راستہ اچھی طرح سے دیکھ لینا چاہتا ہوں تاکہ ہم جلد سے جلد شہنشاہ کو دشمن کے حصار سے نکال سکیں۔“

کلاڈیوس نے کچھ دیر کے لیے روفیہ کے ساتھ چرچ کے

سامنے ایک اجنبی کھڑا تھا۔ اجنبی نے روفیہ سے کہا۔

”مقدس نن! میں آسٹروی فوج کا ایک سپاہی ہوں اور شہنشاہ روس کی مدد کے لیے آیا ہوں۔ میرے ساتھ آسٹروی فوج کی کمک ہے لیکن میں نے انہیں پہاڑی گھاٹیوں میں چھپا دیا ہے۔ ہمارے پاس دریا کے سوا کوئی راستہ نہیں جہاں سے ہم دروی شہنشاہ کو خفیہ طور پر نکال لائیں۔ اگر آپ ہماری مدد کریں تو میں شہنشاہ روس پر بیرونی گریٹ اور اس کی ملکہ کی تھراؤ کو جو بغاوت دشمن کے حصار سے نکال سکتا ہوں۔“

روفیہ دنگ رہ گئی۔ اجنبی نے اتنی بڑی بڑی باتیں کہہ دی تھیں کہ روفیہ جیسی معمولی عورت کے اوسان خطا ہونے لگے۔ شہنشاہ روس؟ ملکہ کی تھراؤ؟ آسٹروی فوج کی کمک اور روفیہ کی مدد؟ یہ سب باتیں گویا کسی جادوئی کہانی کا راکہ تھیں۔ روفیہ گم سم کھڑی رہی تو اجنبی نے پھر کہا۔

”مقدس نن! ہم سستی میں کسی کو تکلیف نہیں دینا چاہتے۔ مسلمان فوجیوں کی تمام توجہ بستی پر ہے۔ لیکن آپ کا چرچ محفوظ ترین ہے۔ ہم ملکہ اور بادشاہ کو ہمیں بدل کر لائیں گے۔ میرا نام کارڈیوس ہے۔ آپ مجھ پر اعتماد کر سکتی ہیں۔ میں ایک مشہور عیسائی سردار کارڈیوس کا بیٹا ہوں جو بھی مقدہ نیا کا بادشاہ تھا۔ میں بھروسے کا آدمی ہوں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔“

اب تو جیسے بوڑھی راہبہ کے سر پر آسمان گر پڑا۔ کارڈیوس کا بیٹا؟ گویا مادام تھریشا کا بیٹا؟ وہی لڑکا اس کے سامنے کھڑا تھا جسے بیس سال پہلے اچھی حقیقی ماں کی گود سے جدا کیا تھا۔ وہ مسلمانوں کا خون تھا لیکن آج ایک عیسائی سالار بن کر روفیہ کے پاس آیا تھا۔ روفیہ چکرائی۔ اسے میرے خدا! یہ کیا ماجرا ہے؟ اسے خداوند! تو مجھ سے میرے گناہ کا کون سا قمارہ چاہتا ہے۔ ایک لخت روفیہ رونے لگی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ کلاڈیوس نے آگے بڑھ کر بوڑھی راہبہ کو سہارا دیا تو وہ کلاڈیوس سے لپٹ گئی۔ کلاڈیوس کو سینے سے لگائے لگی اور دالہا نہ انداز میں اس کا منہ اور سر جو سننے لگی۔ کلاڈیوس نہیں جانتا تھا کہ بوڑھی راہبہ

راہبہ کی آواز سنی۔
”نہیں۔ کسی مشکوک فرد نے پناہ نہیں لی۔ یہاں صرف مقدس باپ کے بیٹے آتے ہیں۔ جیسے تم آئے ہو۔“ موت اور زندگی خداوند کے ہاتھ میں ہے۔“
کلاؤ یوس کے کان ہلکی آہٹ پر بھی گئے ہوئے تھے۔ اسے شیراز کی آواز پھر سنائی دی۔
”ٹھیک ہے۔ آپ ایک طرف ہٹ جائیے۔ میں خود کچھ لیتے ہوں۔“
کلاؤ یوس کسی جیتے کی طرح چونکا ہوا گیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی شمشیر فضا میں اٹھی ہوئی تھی کہ وہ چاہتا تو دروازے میں قدم رکھنے والے شخص کی گردن پل بھر میں اڑا سکتا تھا۔ اسی اثنا میں کلاؤ یوس نے بوڑھی راہبہ کی آواز پھر سنی۔
”نہیں۔ تم تنہا تلواریں لے کر خدا کے گھر میں داخل نہیں ہو سکتے۔ یہ گناہ ہے۔ تم اگر چرچ میں آنا چاہتے ہو تو اپنی تلواریں رکھ دو۔“
بوڑھی راہبہ کی بات سن کر کلاؤ یوس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینک گئی۔ راہبہ بہت چالاک تھی۔ یکا یک کلاؤ یوس نے شیراز کی بات سن کر اس کا چہرہ رنگ گیا۔
”ٹھیک ہے۔ میں چرچ میں داخل نہیں ہوتا۔ آپ نے خدا کے جس بیٹے کو یہاں پناہ دے رکھی ہے۔ آپ اس تک میرا ایک پیغام پہنچا دیجیے گا کہ وہ اب زندگی بھر اس چرچ سے باہر نہیں آئیں گے۔“
انتا جہ کر شیراز یک دم مڑا۔ اپنے گھوڑے کی رکاب میں پیر رکھا اور اگلے لمحے وہ گھوڑے کی پشت پر تھا۔ کلاؤ یوس کھڑا دیکھتا ہوا گیا اور شیراز کی جھلاوے کی طرح ٹالی چٹانوں میں روٹوش ہو گیا۔ کلاؤ یوس ہاتھ ملتا ہی رہ گیا۔ لیکن روفیہ خوش تھی کہ چرچ میں کل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ شیراز سے باتیں کر کے روفیہ کچھ عجیب سامانوں لے رہی تھی۔ اسے اس نوجوان کی آنکھوں میں شرافت اور چال کی جھلک دیکھائی دی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے

پہرے کے ساتھ شیراز کو جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ جب شیراز کا گھوڑا سر پٹ دوڑتا ہوا بوڑھی راہبہ روفیہ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ کلاؤ یوس کی جانب مڑی۔
”دیکھو نوجوان! تم نے عیسائی ہو کر بھی چرچ کا احترام نہیں کیا اور گھوڑا چرچ میں باندھ دیا لیکن تمہارے تعاقب میں آنے والے نوجوان نے مسلمان ہو کر بھی چرچ کا احترام کیا اور برہنہ شمشیر لیے چرچ میں نہیں گھسنا۔ میری نظر میں وہ تم سے بہتر ہے۔ تم اپنی ماں کی طرح ہو لیکن نہیں۔ تم اپنی ماں کی طرح نہیں ہو سکتے۔ تم تھرو شیا کی طرح ہو۔ مفرد تھرو شیا۔“
ایک انجیلی راہبہ کے منہ سے اس طرح کی بات اور اپنی ماں کا نام سن کر کلاؤ یوس تو جیسے پاگل ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ بڑھیا کیا کہہ رہی ہے۔ وہ دیدے پھاڑے بوڑھی راہبہ کی آنکھوں اور جھریوں بھرے چہرے میں عہد رفتہ کا کوئی واقعہ دیکھ رہا تھا۔ اس کا دماغ سنسنے لگا۔ مقدونیہ سے اتنی دور مولد یوہا کے اس چرچ میں یہ بوڑھی راہبہ کلاؤ یوس کو اس کی ماں کا طعنہ دے رہی تھی۔ کیا یہ مادام تھرو شیا کو جانتی ہے؟ لیکن اس نے تو نہیں بتایا۔ کلاؤ یوس نے تو صرف اپنے باپ کا نام لیا تھا جبکہ مقدس سن اس کی ماں کو ایک مفرد عورت کہہ رہی تھی۔ بوڑھی راہبہ کا مادام کے ساتھ کیا تعلق تھا؟ کلاؤ یوس کو سب کچھ بھول گیا اور وہ مسلسل حیرت سے دیدے پھیلائے روفیہ کو نکلتا رہا۔
”مقدس سن! کیا آپ میری ماں کو جانتی ہیں؟ میرے کہنے کا مطلب ہے کیا آپ مادام تھرو شیا کو جانتی ہیں؟“
روفیہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ تھرو شیا کے بیٹے کو حقیقت بتا دی جائے یا چھپالی جائے۔ وہ کلاؤ یوس کے ہاتھ میں نئی تلوار دیکھ رہی تھی۔ اس لڑکے نے مادام تھرو شیا کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اگر روفیہ کی بات سن کر اس کا دماغ گھوم جاتا تو ممکن تھا کہ وہ بوڑھی راہبہ کی گردن پر تلوار ہی چلا دیتا۔ لیکن آج روفیہ رکنے والی نہیں تھی۔ وہ بیس سال سے جر اور صبر

کلاؤ یوس چہرے کا تھوہڑا گھوڑے کے منہ پر کس کر چڑھا چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گھوڑے کی خرخراہٹ یا جھنناہٹ کی آواز باہر سنائی دے۔
بوڑھی روفیہ ہکا بکا کھڑی کلاؤ یوس کی حرکتیں دیکھ رہی تھی۔ کلاؤ یوس اپنا کام ختم کر کے تیزی سے چرچ کے دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ اب برہنہ شمشیر اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ دروازے کے ساتھ پشت لگائے مستعد انداز میں کھڑا تھا۔ اس نے تیز لہجے میں روفیہ سے کہا۔
”مقدس سن! آپ اپنے کمرے میں چلی جائیے۔ دشمن کے دستک دینے پر آپ دروازہ کھولنے کے لیے وہاں سے چل کر آئیں گی تو اسے کوئی شک نہیں ہوگا۔ بس آپ کو یہ کرنا ہے کہ دشمن چرچ میں داخل ہونے لگے تو اس سے کہیں کہ چرچ کے احترام میں شمشیر نیام میں رکھ لے۔ بس باقی میں خود دیکھ لوں گا۔“
روفیہ عجیب نظروں سے کلاؤ یوس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اسے کلاؤ یوس کی باتیں اچھی ننگ رہی تھیں۔ اس نے دیکھا تھا کہ کلاؤ یوس خود تو گھوڑا لے کر ہٹ گیا تھا لیکن اپنے دشمن کو چرچ کے احترام کی تلقین کر رہا تھا۔ روفیہ جانتی تھی کہ کسی کو دھوکے سے مارنا اچھی بات نہیں پھر کلاؤ یوس تو چرچ کے فرش پر ہی خون بہانا چاہتا تھا۔ بوڑھی روفیہ کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ دعائیں مانگنے لگی کہ کلاؤ یوس کا دشمن اس کے تعاقب میں یہاں تک نہ آئے۔ لیکن اس کی دعا قبول نہ ہوئی۔ چند ہی ثانیے بعد چرچ کے دروازے پر دستک ہوئی۔
”ٹھک ٹھک ٹھک!“
روفیہ کا دل اچھل کر اس کے حلق سے آگیا۔ کلاؤ یوس تنگی تلوار سے دروازے کے پہلو میں پوری طرح تیار کھڑا تھا۔ اس کا منصوبہ بالکل درست تھا۔ وہ اپنے تعاقب میں آنے والے شخص کو آسانی سے موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔ اس نے روفیہ کی طرف دیکھا جو اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی خوف زدہ لگا ہوں

سے کلاؤ یوس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ بے بس تھی۔ وہ چرچ میں ہونے والا قتل نہ روک سکتی تھی۔ اس نے دروازہ کھولنے میں تھوڑی سی دیر کی تو دستک دوبارہ سنائی دی۔
”ٹھک ٹھک ٹھک۔“
اس مرتبہ دستک کی آواز قدرے بلند تھی۔ کلاؤ یوس کے اعصاب تن گئے۔ اب روفیہ دروازہ کھولنے جا رہی تھی۔ وہ بہت قدموں سے چلتی ہوئی دروازے کے پاس پہنچی اور اگلے لمحے اس نے کھڑی ہٹادی۔
”کون ہے؟“ خداوند کے دروازے پر دستک دینے والا مہمان کون ہے جو اتنی جگہ چرچ کی طرف آیا ہے؟“
کلاؤ یوس نے بوڑھی راہبہ کی آواز سنی۔ اگلے لمحے کلاؤ یوس جیسے مارے حیرت کے اچھل پڑا۔ اس کے کانوں سے نکلنے والی آواز جانی پہچانی تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔
”میں ایک ترک سپاہی ہوں مقدس سن! ایک مشکوک شخص کے تعاقب میں، میں یہاں تک آیا ہوں۔ آپ خداوند یسوع مسیح کی راہبہ ہیں۔ آپ یقیناً دروغ بیانی سے کام نہیں لیں گی۔ کیا یہاں کوئی مشکوک شخص آیا؟“
راہبہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ اندر کھڑے کلاؤ یوس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ شیراز کی آواز پہچان چکا تھا۔ اس کے دماغ میں بے پناہ آندھیاں چل رہی تھیں۔ یہ کیسا اتفاق تھا پروردگار؟ کلاؤ یوس نے دور دیوار پر لگی خداوند یسوع مسیح کی عظیم کود دیکھا۔ اس نے بحری سفر میں شیراز کے ساتھ کافی وقت گزارا تھا۔ وہ شیراز کی آواز کیسے بھول سکتا تھا۔ ابھی وہ دماغ میں چلنے والی آنکھوں کو سنبھال بھی نہ پایا تھا کہ اسے پھر شیراز کی آواز سنائی دی۔
”مقدس سن! آپ جانتی ہیں کہ یہ بستی اور تمام علاقہ ترک سپاہیوں کے قبضہ میں ہے اور آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ جنگی جاسوس کو پناہ دینا ترک افروں کی طرف سے کتنے غیظ و غضب کا باعث ہو سکتا ہے لیکن آپ کی بزرگی دیکھ کر میں انتہائی احترام سے پوچھ رہا ہوں کہ آپ کے چرچ میں کسی مشکوک فرد نے پناہ تو نہیں لی؟“
شیراز کی بات مکمل ہوتے ہی کلاؤ یوس نے بوڑھی

کر کے بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک ایسا راز سینے میں چھپائے اس نے وہ وہاں گزاردی تھیں جو اس کے دل پر کسی پتھر کی سل کی طرح دھرا تھا۔ آج تو وہ فیصلہ کرنے لیا تھا۔ اب وہ مزید برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے کلاڈیوس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
”میں تمہاری ماں کو بھی جانتی ہوں اور مادام تھریشیا کو بھی۔“

اتنا کہہ کر وہ فیصلہ، کلاڈیوس کے چہرے پر اپنی بات کے اثرات دیکھنے کے لیے رکی لیکن کلاڈیوس نہایت انجھی ہوئی نظر دوسرا رہا۔ یہ راہبہ کو کچھ رہا تھا۔ یہ راہبہ کیا کہہ رہی تھی۔ کیا اس بڑھی عورت کا دماغ چل گیا ہے؟ یقیناً یہ پاگل ہے۔ یہ عورت وہ عورتوں کا ذکر کر رہی ہے۔ کیا میں دو عورتوں کا بیٹا ہوں۔ کیا مادام تھریشیا اور میری ماں الگ الگ عورتیں ہیں؟ کلاڈیوس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اسے کچھ سب کچھ بھول رہا تھا۔ اسے صرف یہی یاد تھا کہ وہ ایک پاگل راہبہ کے سامنے کھڑا اس کی ہلکی ہلکی باتیں سن رہا ہے لیکن اس کا دل متواتر دھڑک رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے تھروں کی اطلاع دے رہی تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ بڑھیا یقیناً ایسا کچھ جانتی ہے جو کلاڈیوس نہیں جانتا۔ کلاڈیوس نے اچھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
”کیا مطلب۔ آپ میری ماں کو بھی جانتی ہیں اور مادام تھریشیا کو بھی؟ کیا میری ماں اور مادام دو الگ الگ عورتیں ہیں؟ لیکن پہلے یہ بتائیے کہ آپ کون ہیں۔ اور میں کیونکر آپ کی بات کا یقین کر لوں؟“

”ہاں۔ تمہاری ماں اور مادام تھریشیا الگ الگ عورتیں ہیں اور یہ بات دنیا میں صرف میں جانتی ہوں یا پھر مادام تھریشیا۔ تمہاری حقیقی ماں بھی نہیں جانتی کہ تم کہاں ہو؟ زندہ بھی ہو کہ مر گئے ہو۔ شاید تمہاری ماں بھی اب تک مر چکی ہوگی۔ بہت وقت بیت گیا ہے۔ سب کچھ بدل گیا ہے۔ میں شاید تمہیں دیکھنے اور تم سے ملنے کے لیے زندہ تھی۔ میں اپنے سینے پر کوہ الپس کے برابر پوچھ محسوس کرتی تھی۔ شب و روز خداوند سے دعا کرتی تھی کہ وہ

میرے دل کا بوجھ ہٹائے اور پھر جب آج تم نے مجھے بتایا کہ تم مقدونیا کے عارضی بادشاہ کارپس کے بیٹے ہو تو میں سب کچھ سمجھ گئی۔ میں سمجھ گئی کہ خداوند نے تمہیں میرے پاس اس لیے بھیجا ہے تاکہ میں اپنے دل کا بوجھ ہٹا کر کے سکون کے ساتھ مر سکوں۔ آج میں انہیں سب کچھ بتا دوں گی۔“

کلاڈیوس دروازے سے ہٹ آیا۔ وہ شیراز کی بات سن چکا تھا۔ شیراز نے کہا تھا۔ ”جس کسی نے بھی چرچ میں پناہ لے رکھی ہے۔ وہ اب یہاں سے نکل نہیں سکتا۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ دن چرچ سے باہر گھات لگا کر میٹھا ہے۔ جو اس کا کلاڈیوس باہر نکلا۔ وہ مار دیا جائے گا۔ شیراز کی یہ بات بوڑھی راہبہ بھی سن چکی تھی۔ اسے بھی یقین تھا کہ چرچ کے باہر کلاڈیوس کے لیے موت ہے اور وہ جانتی تھی کہ کلاڈیوس پر کوئی آج نہ آئے۔ وہ اسے زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ خود کو کلاڈیوس کا جرم سمجھتی تھی۔ وہ فیصلہ بری طرح گھبراتی ہوئی تھی۔ آج کلاڈیوس اس کے سامنے تو آیا تھا لیکن ایسی صورت حال میں کہ چاروں طرف موت کی پرچھائیاں پر پھیلے کھڑی تھیں۔ خداوند یہ کیا جرات ہے؟ وہ فیصلہ نہ دل میں سوچا۔

وہ کلاڈیوس کو اپنے ہمراہ لیے حضرت عیسیٰ کی شبیہ کے نزدیک آئی۔ اس نے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کی تصویروں کی طرف دیکھا۔ کلاڈیوس کا بدن جیسے شہ ہو گیا تھا۔ اسے کچھ بھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ چاہتا تو یہ تھا کہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس چوہے دان سے نکل بھاگے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ بوڑھی راہبہ نے اسے جھٹسے میں ڈال دیا تھا۔ وہ کیا کرتا؟ یہاں سے نکل بھاگتا تو شاید پیچھے مسلمان، راہبہ کوئل کر دیتے۔ کیونکہ راہبہ نے ایک جاسوس کو پناہ دینے کا جرم کیا تھا اور پھر ایک اور وجہ بھی تھی جس نے کلاڈیوس کے قدم روک رکھے تھے۔ منصوبہ کے مطابق طلوع آفتاب کے ساتھ ہی تھیوڈورا اور مادام تھریشیا یہاں آنے والی تھیں۔ انہیں اس چرچ میں آکر راہبائوں اور عورتوں جیسا حلیہ اختیار کرنا تھا۔ انہیں آنے والی

شب شہنشاہ روس اور ملکہ کیتھرائن کو تحفظ دینا تھا۔ یہ تھا کہ منصوبہ مادام نے خود بنایا تھا۔ آج سے کئی روز پہلے جب کلاڈیوس روسی شہنشاہ سے اجازت لے کر نکلتے ان کے غرض سے آسٹروی فوج کی طرف روانہ ہوا تو آسٹروی فوج میں اس کی ملاقات حسب توقع انی ماں کے ساتھ ہوئی۔ اس نے مادام تھریشیا کو روسی لشکر کی حالت زار اور بے بسی کے بارے میں بتایا تو تھریشیا جذباتی ہو گئی۔ کلاڈیوس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی ماں کو زندہ دیکھا تھا۔ مادام تھریشیا کیتھرائن سے ملنے کے لیے ہمیشہ بے تاب رہتی تھی۔ ان دنوں نے اب اسے بتایا کہ خدا اور بادشاہ جیسا کہ تھے میں چھٹ چلے جس تو تھریشیا کی حالت غیر ہو گئی۔ کلاڈیوس نے اسے بتایا کہ وہ ملک لینے کی غرض سے یہاں آیا ہے۔ مادام تھریشیا فوراً کلاڈیوس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی۔ اس نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا تھا۔

”تھیک ہے! ہم یہاں سے چار ہزار سواروں کا لشکر لے کر جائیں گے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ میں روس کی ملکہ اور شہنشاہ کو مسلمانوں کے چنگل سے نکالوں گی۔ کلاڈیوس! تمہیں میرے دماغ کی ضرورت ہے۔“

کلاڈیوس حسب عادت تھریشیا کے سامنے انکار نہ کر سکا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔

”لیکن تھیوڈورا کا کیا ہوگا۔ آپ کو اسے یہاں لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ مقدونیا میں محفوظ تھی۔“

”نہیں۔ میں اسے کالج کی گڑیا بنا کر نہیں رکھنا چاہتی۔ میں اسے جان بوجھ کر یہاں لاتی ہوں۔ وہ آسٹروی شاہی خاندان کی بیٹی ہے۔ اور پھر مقدونیا میں وہ اکیلے کیا کرتی؟“

اسی روز مادام تھریشیا آسٹروی شہنشاہ سے روسی لشکر کی مدد کے لیے کمک منظور کروانے میں کامیاب ہو گئی۔ اگلی صبح مادام تھریشیا کی زیر سرپرستی اور کلاڈیوس کی سپہ سالاری میں تھیر فائر آسٹروی دسے مولڈیو کی جانب روانہ ہو

گئے۔ مولڈیو یا کے نواح میں پہنچ کر منصوبہ کے مطابق کلاڈیوس نے سپاہیوں کو فرداً فرداً نکھر جانے کا حکم دے دیا۔ مولڈیو یا کے پورے علاقے میں ترک فوج کا راج تھا اور کسی عیسائی کے لیے اتنا برداشت نہ لے کر مولڈیو یا میں داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ ہر سپاہی کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ فرداً فرداً دشمن کی نگاہ سے بچتا ہوا دریائے پرتھ کی جانب بڑھے۔ کلاڈیوس کے پاس معلومات تھیں جو اس نے اب تک مختلف سپاہیوں اور عام لوگوں سے حاصل کی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ دریائے پرتھ شمال کی جانب بہتا ہے اور جس جگہ روسی لشکر حضور سے وہاں سے پتھ قسطلے پر ایک پھولی سی عیسائی بستی ہے۔ کلاڈیوس اپنی ماں اور بہن کے ساتھ بھییں بدل کر اس عیسائی بستی کے شمالی مضافات تک آیا تھا۔ یہیں چٹانوں کے پتھروں سے آسٹروی سپاہیوں کو اکٹھا ہونا تھا۔ یہ سارا منصوبہ مادام تھریشیا نے بنایا تھا اور مقامات کی رہنمائی کلاڈیوس کے علاوہ چند پرانے سپاہیوں نے کی تھی۔

ویران چٹانوں اور کھائیوں میں پہنچ کر یہ لوگ اپنے سپاہیوں کا انتظار کرنے لگے۔ تمام دن اور تمام رات ایک ایک کر کے آسٹروی سپاہی ان چٹانوں میں جمع ہوتے رہے۔ انہوں نے کوئی خیمے نہ لگائے اور نہ کوئی ایسی حرکت کی جس سے گشت کرتے ہوئے ترک دستے خطرے کو بھانپ لیتے۔ یہاں تک کہ چٹانوں میں پہنچنے والا ہر سپاہی اپنی منزل پر پہنچتے ہی گھوڑے کے منہ پر تھوڑا چڑھا دیتا تھا تاکہ اسے زیادہ گھوڑوں کی خرخراہٹ اور ہنہانہٹ پیدا ہونے سے روکی جاسکے۔

کلاڈیوس اور مادام تھریشیا کو معلوم تھا کہ چھوٹی سی عیسائی بستی سے چند سو قدم باہر کی جانب ایک چرچ ہے جسے ایک بوڑھی راہبہ سنبھالتی ہے۔ مادام تھریشیا یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ بوڑھی راہبہ اس کی پرانی شناسا رہی ہے۔ مادام نے اپنا منصوبہ اس طرح تجویز دیا کہ کلاڈیوس جو لشکر کا راستہ جانتا تھا۔ نصف شب کے وقت گھات کے مقام سے نکلے گا اور چھپتا چھپاتا روسی لشکر میں داخل ہوگا۔ وہ

کڑو تھی اور اس کے ایسا سوچنے کی وجہ تھی کہ اس نے یہ سانی ہستی میں اور نہ ہی چرچ کے آس پاس کسی ترک پای کو دیکھا تھا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ ترک اس طرف سے بے پروا ہیں اور اس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ آنے والی رات وہ شمالی پہاڑی کے سین اسی مقام پر قبضہ کرے گا جہاں سے دریا نرنا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے کلاڈیوس رات کے عقاب شیرازی انڈروں میں آگیا۔ شیراز اس مشکوک شخص کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا چاہتا تھا کہ یہ شخص کون ہے اور کس ارادے سے آیا ہے؟ شیراز کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ یہ شخص کلاڈیوس ہے اور اس کے ہمراہ آنے والے آئندہ دن و شبے شمال کی ویران چٹانوں میں خاموشی سے چپے بیٹھے ہیں۔ شیراز نے اس شخص کو گرفتار کرنے کی بجائے اس کا تعاقب کیا لیکن رات کی تاریکی اور اونچی پٹی چٹانوں کی وجہ سے شیراز کوئی واضح اندازہ نہ لگا سکا۔ مشکوک شخص کہاں چھپ گیا۔

چرچ میں کلاڈیوس نے بوڑھی راہبہ کی زبان سے اپنی ماں کا نام سننا تو اس کو تمام کام بھول گئے۔ بوڑھی راہبہ نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ اس کا بدن شل ہو چکا تھا اور اب وہ نہ باہر جا سکتا تھا اور نہ ہی اسے اندر قرا تھا۔ بوڑھی راہبہ کی زبان سے بیس سال پرانی کہانی سن کر کلاڈیوس کی حالت غیر ہو گئی۔ بوڑھی راہبہ نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ سب کچھ! بوڑھی روفیس نے اسے بتایا کہ وہ ایک غیر مقدونی مسلمان کا بیٹا ہے۔ اس کا باپ ایک معمولی لوہار تھا جسے مادام تھروڈیا کی بغاوت کے دوران چند اوہاشوں نے معذور کر دیا تھا۔ اس کی ماں مغربی مجبور تھی کہ اپنا بچہ بیچ دیتی۔ مادام تھروڈیا کی بیٹی کو لوہاروں کے گھر بیچا دیا گیا اور لوہاروں کا بیٹا مقدونیا کا وارث بنادیا گیا۔ روفیس نے کہا۔

”مادام تھروڈیا بہت ظالم عورت تھی۔ وہ کسی کو معاف نہیں کرتی تھی۔ وہ جب غصے میں آتی تو کسی نہ کسی کا خون بہا رہی اسے سکون ملتا تھا۔ وہ اپنے غلاموں کو اپنے ہاتھ سے کڑے مارتی تھی۔ جب وہ مقدونیا کی ملکہ بنی تو اس نے مسلمان رعایا کا جینا حرام کر دیا۔ تم اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ میں اتنا بڑا گناہ کرنے کے بعد مقدونیا میں رہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ چنانچہ میں وہاں سے چلی آئی۔ بیس سال تک میرے سینے پر گھبراہٹ کی ہانگ کی طرح بیٹھا رہا جو ہر پل مجھے ذستار بتاتا تھا۔ اب تم مل گئے ہو اور میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے تو میرے من کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔“

کلاڈیوس اپنے حواس میں نہیں تھا۔ اسے اتنا خیال بھی نہ آیا کہ ترک سپاہی کسی بھی وقت چرچ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ وہ خود شیرازی بات سن چکا تھا لیکن نہ جانے کیوں یہ جاننے کے بعد کہ وہ مسلمانوں کا بیٹا ہے اس کا تمام ڈر یک لخت کا فور ہو گیا۔ وہ تار تار ہوا تھا۔ بے حد حیران۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا اس نے بار بار یہ کہانی کے دوران اپنی پانی میں سر دیا۔ روفیس کی یہ عجیب سی بات نہ رہی تھی۔ کلاڈیوس بچہ نہیں تھا۔ اسے بھول گیا تھا کہ وہ شہنشاہ روس سے مل کر آ رہا ہے۔ اسے بھول گیا کہ اس کی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ البتہ اسے اتنا یاد رہا کہ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی مادام تھروڈیا اور تھوڈورایہاں آنے والی ہیں۔ نہ جانے کیوں کلاڈیوس نے روفیس کو مادام تھروڈیا کے بارے میں نہ بتایا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس نے روفیس کو کچھ بھی نہ بتایا تھا۔ روفیس کو تو ابھی یہ بھی علم نہیں تھا کہ شہنشاہ روس نے بھاگ نکلنے کے سلسلے میں کلاڈیوس کو کیا جواب دیا ہے۔ کلاڈیوس جب پہلی مرتبہ لشکر کی طرف جاتے ہوئے چرچ میں آیا تھا تو اس نے صرف شہنشاہ کو نکال جانے کے بارے میں بوڑھی راہبہ سے بات کی تھی۔ اور جب دوسری مرتبہ واپسی پر وہ چرچ میں داخل ہوا تو صورت حال ہنگامی تھی۔ وہ روفیس کو مادام تھروڈیا یا ملکہ اور بادشاہ کے بارے میں کچھ بھی نہ بتا سکا۔ ترک گھڑ سوار اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ شیراز کو قتل کرنا چاہتا تھا کہ اس کی موجودگی کی خبر ترکوں تک نہ پہنچ سکے۔ لیکن یہاں تو دنیا ہی الٹ گئی تھی۔ بوڑھی راہبہ اسے

جانیں گے۔ میں نے منصوبہ مکمل کر لیا ہے۔ آج صبح میری ماں اور بہن راہباؤں کے روپ میں اس چرچ تک پہنچیں گی جو دریائے ریحہ کے کنارے ایک چھوٹی سی عیسائی ہستی کے نزدیک واقع ہے۔ ہم کل رات کو یہاں سے نکلے گے۔ ہمیں اس چرچ تک پہنچنا ہے۔ وہاں آسرو کی فوج کا ایک جنگجو دستہ چھپا ہوا ہوگا۔ ہم آپ کو بڑی آسانی سے باہر نکال سکتے ہیں۔“

لیکن پھر نے صاف انکار کر دیا تھا اور محصور بادشاہ نے سینے پر ہاتھ مار کر یہ کہا تھا۔

”میں اپنے لشکر کو چھوڑ کر بھی نہیں جاؤں گا۔ مجھے یہاں سے نکلنے کے لیے چھپنے چھپانے کی یا تمہارا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔ میں جب چاہوں ایک زوردار دستے کے ساتھ ترک لشکر کو چیرتا ہوا یہاں سے نکل جاؤں۔ لیکن میں بزدل نہیں ہوں۔ میں بھاگنا نہیں چاہتا۔ جنگ میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ آج ہم ان کے زیر دام آگئے ہیں اور اگر ہم بچ گئے تو کل وہ ہمارے زیر دام جائیں گے۔ اور تم نہیں جانتے۔ ہم جانتے ہیں۔ بلطاجی بھی ہمارا قتل نہیں کرے گا۔ مسلمان جانتے ہیں کہ پٹر کی موت پوری عیسائی دنیا کی بے داری ہوگی۔ میں ترکوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ مجھے مارنے کی بے وقوفی نہیں کریں گے۔ تم چاہو تو اپنے آسرو کی مدد کے لیے لے کر واپس جا سکتے ہو اور چاہو تو روسی لشکر کی مدد کے لیے باہر رک سکتے ہو۔ تمہارے دستوں کی بدولت ممکن ہے رسل و رسائل کا سلسلہ چل جائے۔ تم ترکوں کے کسی بھی کمزور مقام کو ڈھونڈ کر ان پر حملہ کر سکتے ہو۔ مجھے بچانے کی بجائے کسی پہاڑی چوٹی پر قبضہ کرنے کی کوشش کرو۔ تم ہمت کرو تو ایسا ممکن ہے۔“

شہنشاہ نے کلاڈیوس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ صبح ہونے سے پہلے کلاڈیوس واپسی کے لیے چل پڑا تھا۔ اب وہ ایک نئے عزم کے ساتھ واپس لوٹ رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بہت جلد شمالی پہاڑی پر قبضہ کر لے گا کیونکہ اس کے خیال میں ترکوں کی صرف یہی سمت

رہتی تھی۔ تمام خطرات پر غور کرے گا تا کہ پٹر اعظم اور ملکہ کیستیرائن کو محفوظ طریقے سے نکالا جاسکے۔ منصوبے کے مطابق کلاڈیوس کو بوڑھی راہبہ کے چرچ میں رکنا تھا۔ یہی جگہ تھی جہاں کچھ وقت کے لیے روسی بادشاہ اور ملکہ کو چھپایا جاسکتا تھا۔ کلاڈیوس کو پٹر اعظم تک پہنچنا تھا اور روسی شہنشاہ اور ملکہ کو اس بات پر راضی کرنا تھا کہ وہ خفیہ طریقے سے نکلنے کے لیے تیار ہو جائیں اس کے علاوہ یہ طے پایا تھا کہ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی مادام تھروڈیا اور تھوڈورایہاں کے شخص میں اسی چرچ کی طرف بڑھیں گی۔ انہیں یہاں راہباؤں بن کر رہنا تھا۔ صرف ایک دن اور ایک رات کے لیے۔ اگر ملکہ اور بادشاہ مان جاتے تو انہیں رات کی تاریکی میں چرچ تک پہنچانے کا کام کلاڈیوس سنبھالتا۔ چرچ کے آس پاس اور ہستی میں چند آسرو کی سپاہیوں کو چھپایا جاتا جو بادشاہ اور ملکہ کو درپیش کسی بھی خطرے کی صورت میں اپنی جانیں تک غار کر دیتے۔ تھوڈورایہاں اور تھروڈیا راہباؤں بن کر ملکہ اور شہنشاہ کو تحفظ دیتیں۔ یہ منصوبہ اگرچہ بہت اچھا تھا لیکن شاید مادام اس علاقے میں اپنے دیرینہ دشمن شیرازی کی موجودگی سے بے خبر تھی۔ شیراز وہ عقاب تھا جس کی نگاہوں سے بچ کر نکلتا کسی کے بس کی بات تھی اور وہی ہوا۔

کلاڈیوس صبح ہونے سے پہلے پہلے شہنشاہ اور ملکہ کو قاتل کرنے کی کوشش کرتا رہا اس نے بڑے ذوق سے کہا تھا۔

”شہنشاہ اعظم! یہ بہت محفوظ راستہ ہے۔ دشمن کی توجہ ہر طرف ہے لیکن دریا کی طرف نہیں۔ ہم ایک طرح سے دریا کے بچوں چچ اور دریا کے بہاؤ کے رخ پر سفر کریں گے۔ یہ پہاڑی دریا ہے۔ جگہ جگہ بڑے بڑے پتھر دریا کی سطح سے ابھرے ہوئے ہیں اور پھر اس وادی کو جہاں دریا کاٹ کر باہر نکلتا ہے۔ وہ ایک چھوٹا سا درہ ہے۔ تیز پانی کی وجہ سے ترکوں کی توجہ اس درے کی طرف نہیں مگنی۔ درے میں دریا کے پہلو پر بالکل تنگ ایک قدرتی سا راستہ ہے۔ ایک گھوڑا یا آسانی اس جگہ سے گزر سکتا ہے۔ آپ بالکل غور نہ کریں۔ ہم آج رات نہیں

بتاریقی کہ وہ مسلمانوں کا بیٹا ہے۔

دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ شیروں کی طرح لڑکر جان دے گا۔ اس لیے مجھے آج رات ہی واپس آنا پڑا۔“
”اچھا کر یا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اتنی مشکل سے تو ہم نے یہ منصوبہ بنایا۔ کیا وہ خدا اور مسیحیت کا نقصان کرنا چاہتے ہیں؟ آئیں آ جانا چاہیے تھا۔“

مادام بائیس کر رہی تھی لیکن کلاڈیوس کی جگہ اس عورت کے چہرے پر بھی ہنسی تھی جس نے اس اپنی حقیقی ماں کی آغوش سے چھین لیا تھا۔ کلاڈیوس کے چہرے پر بدلے ہوئے تاثرات دیکھ کر مادام تھرویشا کا ہاتھ کاٹکا۔ تھیوڈورا بھی بری طرح چونک گئی۔ آج اسے اپنا بھائی بالکل مختلف دکھائی دے رہا تھا ایک بالکل ہی بدلا ہوا شخص۔ کلاڈیوس کا چہرہ مفید پتھر کی طرح سپاٹ تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں غم کے دیے جل رہے تھے۔ ایک ایسا غم جو کسی پتھر کو بھی پگھلا سکتا تھا۔ تھیوڈورائے اپنے بھائی کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے پانی کی بوندیں دیکھیں۔ اس کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ کچھ عجیب ضرور ہوا تھا۔ مادام تھرویشا کی حالت بھی یہی تھی۔ وہ تھیرنگ ہوں کے ساتھ کلاڈیوس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے تک کلاڈیوس کو سمجھنے کی کوشش کرنے کے بعد مادام نے کہا۔

”کلاڈیوس! بیٹا کیا ہوا؟ تم کچھ بدلے بدلے لگ رہے ہو۔“

کلاڈیوس کی نگاہیں مادام پر پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”خدا اور مسیحیت کا نقصان؟ کیا خدا کا نقصان بھی ہو سکتا ہے؟ اگر خدا کا بھی نقصان ہو سکتا ہے تو پھر وہ خدا کس لیے ہے؟“

تھیوڈورا ایک دم آگے بڑھ آئی۔ یکا یک اسے کسی کی یاد آگئی۔

کلاڈیوس کا لہجہ بالکل اٹکھا تھا۔ اس کے سینے میں درد کی شیمیں اٹھ رہی تھیں لیکن وہ بڑی سنجیدگی سے مادام کے ساتھ مخاطب تھا۔

اسے وقت گزرنے کا یہ بھی نہ چلا یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور سورج نکل آیا۔ وہ اکلوتی بھئی جس میں مادام تھرویشا آسرووی سوار دستوں کے ساتھ یہاں تک آئی تھی۔ طلوع آفتاب سے کچھ دیر بعد چرچ کے دروازے پر کی۔ مادام کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے کہ چرچ میں کیا کچھ بیت چکا ہے۔ اس کے منصوبے کے مطابق تو کلاڈیوس کو یہاں ہی رہنا چاہیے تھا۔ کلاڈیوس تو ملکہ اور شہنشاہ کے ساتھ اگلی رات کو آنے والا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ شہنشاہ نے کلاڈیوس کو تاہر اولیٰ کیا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ چرچ کی راہبہ اس کی برائی شناسا رہی ہے۔ مادام تو اس تحقیر کا کردار نبھنے کے لیے یہاں آئی تھی جو پیٹر اعظم کو فرار کروانے کے سلسلے میں رچائی جا رہی تھی۔

مادام تھرویشا، تھیوڈورا کے ہمراہ راہباؤں کے حلیے میں کھنسی سے آڑی۔ بظاہر وہ ایک ٹیک سیرت اور ٹیک صورت راہبہ دکھائی دے رہی تھی جو صبح چرچ میں عبادت کی غرض سے داخل ہو رہی تھی۔ جوئی مادام تھرویشا نے چرچ میں قدم رکھا تو چرچ میں بندھے گھوڑے کو دیکھ کر اس کے دل کو دھچکا لگا۔ وہ ڈر گئی۔ اس نے سوچا ترکوں نے چرچ پر قبضہ کر لیا ہے لیکن گھوڑے کے منہ پر چڑھا تھوڑا کچھ کر مادام کا ہاتھ ٹوکا۔ ساتھ ہی اسے تھیوڈورا کی آواز سنائی دی۔

”امی جان! یہ بھیا کا گھوڑا ہے۔ میرا خیال ہے بھیا یہیں ہیں۔“

اور پھر اگلے لمحے مادام تھرویشا کی نظر کلاڈیوس پر پڑ گئی۔ کلاڈیوس چرچ کے وسط میں کھڑا تھا۔ مادام کی پیشانی پر ہل پڑ گئے۔ کلاڈیوس کو یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تو کیا شہنشاہ نے فرار ہونے سے انکار کر دیا؟ اس نے سوچا۔ وہ تیزی سے کلاڈیوس کی طرف بڑھی۔

”کیا بات ہے کلاڈیوس؟ تم یہاں؟ تم تو کل آنے والے تھے شاہروس اور ملکہ کے ہمراہ۔“

”زار نے بزدلوں کی طرح بھاگ نکلنے سے انکار کر

”خدا کا نقصان تو ہے کہ کسی بھوکے کے منہ سے لقمہ چھین لیا جائے۔ کسی ننگے کے بدن پر نشوونما بھی نہ رہنے دیا جائے۔ خدا کا نقصان تو یہ ہے کہ جنگل ویران ہو جائیں۔ فطرت فنا ہو جائے۔ خدا کا نقصان تو یہ ہے کہ کسی نوسلودہ بچہ کو اپنی ماں کی آغوش سے الگ کیا جائے۔“

تھرویشا کو اپنے بیٹے کی دماغی حالت پر شک ہونے لگا۔ لیکن تھیوڈورا اپنے بھائی کی آنکھوں میں ایک نیا انسان دیکھ رہی تھی۔ وہ انسان جو اپنے محبوب شیراز کی آنکھوں میں دکھائی دیتا تھا۔ وہ کلاڈیوس کی باتیں سمجھ رہی تھی لیکن بے حد حیران تھی کہ آخر کلاڈیوس کو کیا ہو گیا تھا؟ مادام تھرویشا نے آگے بڑھ کر کلاڈیوس کو کندھوں سے تھام لیا۔

”بیٹا تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ ہمیں یہاں سے نکلتا چاہیے۔ تمہارا گھوڑا چرچ کے اندر بندھا ہے۔ اگر بستی کا کوئی بیٹا اس طرف نکل آیا تو چرچ میں بندھا گھوڑا دیکھ کر وہ بھڑک اٹھے گا اور مسلمانوں کی بجائے اپنے عیسائیوں کے ہاتھوں ہی قتل ہونا پڑے گا۔ پھر ترک دے جاؤ جگہ گشت کر رہے ہیں۔ تم ہوؤں کے ناخن لو۔ اتنے مشکل حالات میں کیا قضیہ لے کر بیٹھ گئے ہو؟“

لیکن کلاڈیوس فس سے مس نہ ہوا۔ اس نے اسی لہجے میں کہا۔

”اب مجھے مسلمانوں سے کوئی خطرہ ہے نہ عیسائیوں سے۔ میں تمام خطرات سے بہت دور جا چکا ہوں۔ گزشتہ رات میری زندگی کی سب سے مشکل رات تھی۔ میں نے

آپ کو ہمیشہ اپنا رہبر مانا ہے۔ میں کسی شہنشاہ کے دربار میں اپنا تعارف کروانا تھا تو اپنے عظیم باپ کا یوس کا نام لینے کی بجائے اپنی عظیم ماں، دام تھرویشا کا نام لیتا تھا کیونکہ میری ماں شاہی خاندان سے ہے۔ شاہی خاندان۔ جس کا خون خالص ہوتا ہے۔ جس میں کینک کی ملاوٹ نہیں ہوتی۔ میں نے ہمیشہ اپنے نسب پر فخر کیا لیکن آج مجھے معلوم ہوا کہ میری رگوں میں ایک مسلمان ادھار کا خون دوڑ رہا ہے۔ میں شاہی خاندان کا فرد نہیں

ہوں۔ میرے لیے کبھی بھی عیسائیت مقدس نہیں رہی۔ میرے لیے ہمیشہ میرا خاندان اور میرا خون مقدس رہا ہے۔ یہی ایک دولت تھی میرے پاس جس کے سہارے میں جیتا تھا اور آج مجھ سے چھین گئی۔ اب میں کیوں کسی خدا کے لیے لڑوں۔“

مادام تھرویشا کے پیروں تلے سے چرچ کا فرش سرک چکا تھا۔ وہ بری طرح لڑکھڑائی۔ اسے چکر آیا تھا۔ اس کی آنکھیں اپنی آخری حد تک پھیلی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ حیرت کی شدت سے اس کے دیدے پھٹ جائیں گے۔ لیکن کلاڈیوس بدستور بول رہا تھا۔

”اب میرا کوئی مذہب نہیں۔ کوئی خاندان نہیں۔ کوئی گھر نہیں۔ کوئی نظر نہیں، کوئی فرد نہیں، کوئی جماعت نہیں۔ اب میرا کوئی لکڑی نہیں، کوئی فوج نہیں۔ اب میری کسی سے لڑائی نہیں۔ کسی سے ناراضگی نہیں۔ میں خوش ہوں۔ بہت خوش۔ شاید میں نے خود کو ڈھونڈ لیا ہے۔ اب میں صرف ایک انسان ہوں۔ صرف ایک انسان۔“

تھیوڈورا کو بھی چکر آتے آتے رہ گیا۔ کیا یہ اس کا بدعزاج بھائی بول رہا تھا جو غریبوں کی بہو بیٹیوں کو اٹھواتا اور اپنے ساحلی قلعے میں ان کی عزتیں تار تار کرتا تھا۔ جو مسلمانوں کے خون کا پیا سا تھا۔ جو ظالم اور سفاک انسان تھا۔ تھیوڈورا کو آج کلاڈیوس نہیں دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس کے سامنے جو شخص کھڑا تھا یہ کلاڈیوس نہیں تھا۔ یہ کوئی اور ہی انسان تھا۔

مادام تھرویشا کا فشار خون بلند ہونے لگا۔ اس کی رگوں میں کسی انجانے خوف کا زہر سرایت کر گیا۔ وہ پتھر کی طرح گنگ اپنی جگہ پر کھڑی کلاڈیوس کو حسرت ناک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ تھیوڈورا ابھی تک ابہام میں مبتلا تھی۔ کلاڈیوس ایسا کیوں کہہ رہا تھا کہ وہ ایک مسلمان ادھار کا بیٹا ہے۔ وہ تو تھیوڈورا کا بھائی ہے اور یونانی سردار کارپوس کا بیٹا ہے۔ تھیوڈورا دو قدم آگے بڑھی اور کلاڈیوس کے سامنے نزدیک آگئی کہ اس کا جسم کلاڈیوس کے بدن کو چھونے لگا۔ وہ زندگی میں اپنے بھائی کے سامنے نزدیک کبھی نہ آئی

تھی۔ کیونکہ اسے اپنا بھائی پسند نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ کلاڈیوس سے ٹالاس رہتی تھی لیکن آج تھیوڈورا کو اس کی باتیں بہت عجیب لگ رہی تھیں۔ وہ بہت بدلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ تھیوڈورائے کلاڈیوس کی کلڈی تھام لی۔

”بھئی! تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ کیا تم نے اپنی رکھی ہے۔ مادام ہماری ماں ہیں۔ ہم دونوں کی ماں۔ تمہیں کسی نے بہکا دیا ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ میں سال بعد ہماری ماں بدل جائے۔“

”ایسا ہی ہوا ہے تھیوڈورا۔ آج میں سال بعد تمہاری نہیں میری ماں اچانک بدل گئی ہے۔ میں مقدونیا کے ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا۔ میری ماں کا نام مقدونی ہے۔ میرا باپ ایک لوہا تھا جو مادام تھرویشیا کی بغوت کے دوران جسمانی طور پر معذور ہو گیا تھا۔ میرے باپ کا نام ”ایجاز الدین“ تھا۔ بے شک! میں نسلاً یونانی ہوں لیکن عیسائی گھرانے میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ عورت جو اس وقت میرے سامنے کھڑی ہے میری ماں نہیں، اس عورت نے طاقت کے بل بوتے پر مجھے میرے غریب ماں باپ سے چھین لیا تھا۔ اسے بیٹیاں پسند نہیں تھیں اس نے اپنی معصوم ننھی سی بیٹی اپنی آنکھ سے جدا کر کے پھینک دی تھی۔ مقدونیہ کی نرس روفیس نے اس بیٹی کو میری حقیقی ماں صغریٰ کے حوالے کر دیا کیونکہ میری ماں کی چھاتیوں میں ایک بچے کو پرورش دینے کے لیے دودھ تھا۔ تھیوڈورا! یہ عورت کوئی اچھی عورت نہیں ہے۔“

لیکن تھیوڈورا تو وہاں بھی ہی نہیں اس کا مانعہ تو ایجاز الدین اور صغریٰ کا نام سنتے ہی بھٹک سے اڑ گیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ شیراز کی ماں کا نام صغریٰ اور بہب کا نام ایجاز الدین تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شیراز کا باپ بھی ایک لوہا تھا۔ جو بعد میں معذور ہو گیا اور پھر مر گیا وہ شیراز کی بہن نورین کو بھی جانتی تھی جو شیراز سے بڑی تھی اور شیراز ہر وقت تھیوڈورا کے ساتھ اپنی بہن کی باتیں کیا کرتا تھا۔

اسی اثناء میں بوڑھی روفیس نے جوں ہی چرچ کے

وسط میں قدم رکھا۔ سب کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی نزدیک آ رہی تھی۔ مادام تھرویشیا کی گھوڑی ہوئی نظریں روفیس پر لگی تھیں اور روفیس بھی مادام کو ہی دیکھتی ہوئی آگے بڑھی جی آ رہی تھی۔

بوڑھی راہبہ قریب آئی اور مادام کے سامنے رک گئی۔ مادام تھرویشیا کی حالت بہت بری تھی۔ اس کے جسم کا ہر ٹکڑا کچھل رہا تھا۔ آج اسے زندگی کی سب سے بڑی شکست ہوئی تھی۔ روفیس کو کچھ کر مادام تھرویشیا کو سب سے بچا دینا ہے۔ وہ جان لئی کہ کلاڈیوس کو روفیس نے ہی سب بچھڑا دیا ہے۔

مادام تھرویشیا بیٹیاں نظر میں ہی دیکھ کر پٹپٹ پٹپٹ ہو گئی۔ ایک ایک مادام کو یہ حال دیکھ کر ایسا چانک دیا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں کے گرد دیکھا کہ سیاہ حلقے دکھائی دینے لگے۔ بل بھر میں نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ وہ مادام تھرویشیا جو آج تک خود کو ایک جوان آسٹروی شہزادی سمجھتی تھی ایک ایک وہ اپنے آپ کو بوڑھا محسوس کرنے لگی۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی شہزادی نہیں بلکہ مقدونیا کی کوئی بوڑھی اور بے سہارا بوڑھی ہے۔ مادام کی نظریں روفیس کے چہرے پر پڑی ہوئی تھیں۔ وہ منہ سے کچھ نہ بول رہی تھی، کسی چٹان کی طرح کم صوم نہیں کھینچا تے ہوئے بدن کے ساتھ مادام مسلسل روفیس کو ہی دیکھے جا رہی تھی۔ روفیس نے مادام کے سامنے پہنچ کر کہا۔

”مجھے پہچانا۔ میں وہی زن ہوں جو تمہاری زوجگی کے وقت تمہاری دایہ بنی تھی۔ میں روفیس ہوں۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم بالکل بھی نہیں بدلی۔ اب بھی تمہاری آنکھوں میں خصلہ چہرے پر ٹکرا اور بدن میں خصلے کی شدت سے پکلی ہے۔ تم اس وقت بھی ایسی ہی تھی۔ میں نے تمہاری بیٹی کو مرے نہیں دیا تھا۔ میں نے اسے اسی مسلمان عورت صغریٰ کی گود میں ڈال دیا تھا جس کی گود سے میں نے اس کا چاند سا بیٹا چھینا تھا۔ میں نے کلاڈیوس کو سب کچھ بتا کر اپنے من کا بوجھ ہلکا کر لیا ہے۔“

تم بھی خدا کے گھر میں کھڑی ہو۔ خداوند سے معافی مانگو۔ خداوند بہت مہربان ہے۔ وہ ایک شفیق باپ ہے۔ وہ اپنے بچوں پر کبھی ناراض نہیں ہوتا۔ تم خدا سے معافی۔“

روفیس اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی کیونکہ اچانک ایک بہت بڑا حادثہ پیش آ گیا تھا۔ اچانک مادام تھرویشیا نے اپنے سفید لباس میں ہاتھ ڈالا اور جی کی تیز سی سے ایک لمبا ٹھنڈا کال کر بوڑھی روفیس پر حملہ آور ہوئی۔ مادام بری طرح چیخ رہی تھی۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر بوڑھی راہبہ کو گالیاں دے رہی تھی۔ کلتیا رنڈی اور نہ جانے کیا کیا۔ وہ پے در پے وار کر رہی تھی۔

بوڑھی راہبہ تو پہلا گھاؤ کھاتے ہی فرخ پر گر چکی تھی لیکن مادام تھرویشیا کے ہاتھ نہ دے۔ وہ یونان کی طرح وار سرتی تھی اور اس کے منہ سے مغلغات کا طوفان اُڑ رہا تھا۔

”کتیا، رنڈی راہبہ جیتی ہے، خدا کی بیٹی جیتی ہے۔ مریم کے گھر میں رہتی ہے تو مسلمانوں کی جاسوس ہے تو کیا ہے تو سوسکی۔“

کلاڈیوس نے آگے بڑھ کر مادام تھرویشیا کو مضبوطی سے پکڑ لیا لیکن مادام سننے کی کوندے رہی تھی۔ کلاڈیوس کو یوں لگا جیسے مادام تھرویشیا میں کسی سانڈ کی طاقت آ گئی ہے۔ وہ اتنی زور زور سے چیخ رہی تھی کہ تھیوڈورا کو چرچ کی چھت بلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ تھیوڈورا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ کلاڈیوس بوڑھی راہبہ کو پچا بھی نہ سکا۔ روفیس پر چل گئی۔ مادام تھرویشیا کے بے رحم واروں نے اسے ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ چرچ کا فرش خون سے لٹ پٹ ہونے لگا۔ چینی اور دھڑائی ہوئی مادام تھرویشیا کو لاش پر مزید وار کرنے سے روکنے کے لیے مجبوراً کلاڈیوس کو اپنی مشیر اٹھانی پڑی جو اس نے کچھ دیر پہلے دل گرفتہ ہو کر ایک طرف پھینک دی تھی۔ وہ اس پاگل عورت کے نزدیک آیا اور تلوار سونٹ کر کہنے لگا۔

”بس کرو مادام! بس! وہ کب کی مر گئی ہے۔ پیچھے بہت جاؤ اور خنجر پھینک دو!“

کلاڈیوس کو اپنے اوپر تلوار تانے دیکھ کر مادام یک

لخت ساکت ہو گئی۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”کک..... کک..... کک..... کلاڈیوس! تم مجھے مارو گے؟ میں نے تمہیں پالا ہے۔ میں تمہاری ماں ہوں۔“

تھیوڈورا کے آنسوؤں کے کام نہ لے رہے تھے۔ یہ منظر اس کے لیے روح فرسا تھا۔ وہ تیزی سے دوڑ کر کلاڈیوس کے پاس پہنچی۔

”بھئی! بھئی! ماں کو مت مارو۔ خدا کے لیے ماں کو مت مارو۔“

وہ کلاڈیوس سے لپٹ گئی۔ مادام تھرویشیا نے خنجر ایک طرف پھینک دیا۔ کلاڈیوس نے اپنی تلوار پیچھے ہٹائی اور اپنی آنکھوں سے آنسو چھپانے کے لیے اپنا منہ دوسری طرف پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ آج کلاڈیوس کو بہت بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔

تقدیر کے تماشے بھی بہت عجیب تھے۔ دریائے تھو کے کنارے واقع یہ چرچ شاید اسی کہانی کا انجام دیکھنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ بوڑھی راہبہ کا بہتا ہوا لوبو یک لکیر کی صورت دروازے کی طرف سرکنے لگا۔ کلاڈیوس کے گھوڑے نے سر جھکا کر بستے ہوئے لوبو کو سونگھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی ناک پر ٹھوہڑا پڑھا تھا۔ وہ محض دم جھٹک کر رہ گیا۔

اچانک چرچ کے دروازے پر کھٹکا ہوا۔ مادام کسی ڈرے ہوئے جانور کی طرح پلٹی لیکن دروازے میں اپنے کو جوان کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف کی لہر مدھم پڑ گئی۔ وہ بھی تھی کہ شاید ترک سپاہی آ پہنچے ہیں۔ اس نے خود اپنے کو جوان کو چرچ کے گرد و احاطہ کا جائزہ لینے کے لیے ہر بھیجی تھا۔ کو جوان جو دراصل ایک آسٹروی سپاہی تھا۔ چرچ میں بندھے کھڑے اور ایک بوڑھی عورت کی لاش کو دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ اس نے استفہامیہ نظروں سے کلاڈیوس کی جانب دیکھا لیکن کلاڈیوس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ دنگ رہ گیا۔ اس نے حیرت پھری نظروں سے مادام کی طرف دیکھا تو مادام تھرویشیا نور اُبل گئی۔

”یہ مسلمانوں کی جاسوس تھی۔ میں نے اسے مار دیا۔“

www.pdfbooksfree.pk

جب شیراز نے سمجھا کہ چرچ میں زیادہ لوگ ہوں گے تو وہ بات غلط تھی۔ وہ مشکوک سایہ کلاڈیوس ہی تھا اور گھوڑے سمیت چرچ میں چھپ گیا تھا۔ اپنے دونوں دشمنوں کو ایک جگہ دیکھ کر شیراز کو بہت خوش ہوئی۔ گویا قدرت اس پر مہربان ہو چکی تھی۔ اس کی بہن کا قاتل اس کے سامنے تھا۔

اچانک شیراز جیسے سکتے سے باہر آ گیا۔ کیونکہ کلاڈیوس اب گھوڑے پر سوار ہو کر اسے ایڑھ لگا چکا تھا۔ شیراز بری طرح ہٹا گیا۔ وہ ایک گھڑ سوار کے پیچھے پھیل تو نہ دوڑ سکتا تھا چنانچہ اپنا گھوڑا حاصل کرنے کے لیے وہ دوبارہ چٹانوں کی طرف دوڑنے لگا۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ تیز دوڑ رہا تھا۔ جلد ہی وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں دشمنوں کی نظروں سے چھپنے کے لیے اس نے اپنا گھوڑا باندھا تھا۔ لیکن شیراز کا گھوڑا یہاں نہیں تھا۔ کوچوان نے سچ مچ اسے گھول کر ہانک دیا تھا۔ شیراز باگھوں کی طرح چٹانوں کے پتھروں سے دوڑنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے گھوڑے کو آوازیں بھی دے رہا تھا۔

اب چرچ کا دروازہ اس کے سامنے نہیں تھا۔ اور اس کے دل میں یہی خوف تھا کہ کلاڈیوس کے بعد مادام تھروشا بھی چرچ سے نکل جائے گی۔ وہ ہر چیز سے بے پروا ہو کر اپنے گھوڑے کو آوازیں دینے لگا۔ اس کی آواز خاصی بلند تھی۔ آج شیراز کے اضطراب کی حد ہو گئی تھی۔ وہ بے حد مضطرب تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر اپنے دیرینہ دشمنوں کے تعاقب میں چلا جائے۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ وہ ہر رات گھوڑے کی پیٹھ پر گزرتا تھا لیکن آج ایک چھوٹی سی مسافت کی وجہ سے وہ اپنا گھوڑا کھو بیٹھا تھا۔ وہ چٹانوں کی بھول بھلیوں میں کافی دور تک نکل آیا۔ اور پھر اچانک اس کی نظر اپنے گھوڑے پر پڑ گئی۔ بے اختیار شیراز کی پانچیں کھل اٹھیں۔ وہ کسی چھلاوے کی طرح فضا میں چھلٹیں لگاتا ہوا اپنے گھوڑے کے پاس پہنچا اور پھر اس نے گھوڑے پر سوار ہونے اور چٹانوں سے نکلنے میں زیادہ دیر نہ لگائی۔

جونہی وہ چٹانوں سے باہر آیا اور اس کی نظر چرچ پر پڑی تو اس کے دل نے کہا کہ پرندے اڑتے ہیں۔ اس کے دل نے کہا کہ مادام تھروشا بھی بھاگ نکلے گی۔ اس کا سبب ہو گیا ہے۔ کیونکہ اسے چٹانوں میں اپنا گھوڑا اچھوٹنے میں خاصا وقت لگ گیا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک موزوں سی امید کے سہارے شیراز چرچ کی طرف بڑھنے لگا۔

پرندے سچ مچ اڑ گئے تھے۔ شیراز چرچ کے دروازے پر ہی گھوڑے سے اتر آیا۔ برہنہ شیراز اس کے ہاتھ میں تھی لیکن اب اسے کوئی ڈر نہیں تھا کیونکہ اب چرچ میں اس کا کوئی دشمن متفرق نہیں تھا۔ شیراز نے سوچا کوئی بات نہیں، وہ بوڑھی راہبہ سے سب کچھ اگوا لے گا۔ لیکن چرچ میں داخل ہوتے ہی وہ بری طرح الجھ گیا۔ اس کی پیشانی پر غلٹیں نمودار ہو گئیں۔ یہ کیا ماجرا تھا؟ چرچ کے فرش پر خون۔ سامنے بوڑھی راہبہ کی لاش پڑی تھی۔ شیراز چرچ میں داخل ہو گیا۔ بوڑھی راہبہ کو کسی نے بڑی رندہ کی کے ساتھ قتل کیا تھا۔ اس کا چہرہ، آنکھیں، ناک اور پیٹ سب کچھ تھدا کرنا پڑا تھا۔ اس کا سینہ پھٹن تھا اور پیٹ سے آنتیں باہر نکل آئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے راہبہ کو کسی درندے نے پھاڑ کھایا ہو۔ راہبہ کے قریب ہی شیراز کو وہ چھرا نظر آیا جس سے راہبہ کو قتل کیا گیا تھا۔ یہ ایک زمانہ طرز کا ہتھیار تھا۔ شیراز کے دل نے کہا کہ بوڑھی راہبہ مادام تھروشا کے ہاتھوں قتل ہوئی ہے۔ لیکن کیوں؟ مادام تھروشا تو عیسائی راہبوں کو بہت مقدس درجہ دیتی تھی۔ آخر یہ سب کیا تھا؟ شیراز کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا لیکن وہ مزید دیر نہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ سب کچھ وہیں چھوڑ کر چرچ سے باہر نکل آیا۔ اب وہ ایک مرتبہ پھر اپنے گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا۔ شیراز کا رخ اس طرف تھا جس طرف سے اس نے مادام تھروشا کی بھٹی آتے دیکھی تھی۔ یقیناً وہ اسی طرف کو لوٹی ہوئی۔ شیراز نے اپنا گھوڑا اسی راہ پر ڈال دیا۔ اگلے لمحے اس کا گھوڑا ہوا سے ہاتھیں کر رہا تھا۔ دوپہر تک شیراز، مادام تھروشا کو تلاش کرتا رہا اور پھر اچانک ایک جگہ اسے حیرت کے سمندر میں بے پناہ

نوٹے کھانے پڑے۔ وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں اس کے خیال میں ایک ساتھ سیکڑوں یا ہزاروں گھوڑے باندھے گئے تھے۔ جگہ جگہ انسانوں کے رہائش پزیر ہونے کے آثار بھی دکھائی دے رہے تھے۔

شیراز کے دیدے پھیل گئے۔ اسے لگا جیسے کوئی پورا لشکر چند گھنٹے پہلے تک یہاں مقیم رہا تھا۔ ایک دو جگہ آگ کے آؤٹے اٹھتا ہوا دھواں دیکھ کر شیراز نے دل میں کہا کہ وہ لوگ یا لشکر ابھی یہاں سے زیادہ دور نہ گیا ہوگا۔ شیراز کا اندازہ تھا کہ کم از کم چار ہزار گھڑ سوار اس جگہ عارضی طور پر مقیم ہے۔ تھے۔ اب شیراز کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایک لحظہ اسے خیال آیا کہ چار ہزار جنگجو اتنے اطمینان کے ساتھ ترک فوج کے قریب میں موجود تھے کہ وہ کسی بھی وقت کسی دشمن کو تباہ کر کے رہی ٹکڑے کے لیے راستہ کھول سکتے تھے۔ یہ یقینی خطرناک بات تھی۔

شیراز نے مزید وقت ضائع کرنا حماقت جانا اور دشمن کے پیچھے جانے کی بجائے اپنے گھوڑے کی نگاہیں عثمانی پڑاؤ کی جانب موڑ دیں۔ اسے دشمن کو دکھنا تھا۔ ورنہ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ شیراز کو کلاڈیوس اور مادام تھروشا بھول گئے۔ اسے صرف یاد رہا تو یہ کہ عثمانی لشکر شدید خطرے کی زد میں ہے۔ شیراز کو پڑاؤ میں ملنے والی چیزوں سے اندازہ ہوا تھا کہ مادام تھروشا کے ساتھ آنے والے دستے آسٹروی فوج کے تھے۔ اب شیراز یہ خبر بلا جی تک پہنچانا چاہتا تھا کہ چاروں پہاڑیوں پر فوجوں کو مستعد کیا جائے اور کسی بھی اچانک حملے سے بچنے کے لیے تیار رہا جاسکے۔ خفیہ آسٹروی دستے یہاں موجود تھے۔ عثمانی فوج جیتی ہوئی جنگ ہارنے والی تھی۔ شیراز کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ اپنے گھوڑے کو ایڑھ پر ایڑھ اگا رہا تھا۔ وہ آج ہی تمام کام مکمل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ نصف گھنٹے بعد وہ بلا جی کے سامنے تھا۔

.....

مادام تھروشا کا لشکر بھر لیا گیا۔ یہ لوگ زیادہ دور نہ جا سکے تھے کیونکہ مادام تھروشا نے انہیں واپس جانے سے

روک دیا تھا۔ آسٹروی سالاروں نے مادام تھروشا کے ساتھ احتجاج کیا کہ ان کا سپہ سالار کلاڈیوس جب تک نہیں آج تا وہ پڑاؤ نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن مادام نے انہیں یہ کہہ کر ڈرا دیا تھا کہ عثمانیوں کو ہماری موجودگی کا پتہ چل چکا ہے اور جب آسٹروی ایسے ڈرے کہ اب مولد یویا سے بے نکل جانا چاہتے تھے لیکن مادام نے انہیں ایک چھوٹے سے پہاڑی درے میں روک لیا۔

”ہم یہاں محفوظ ہیں۔ یہ قدرتی پناہ گاہ ہے، ہمیں اپنے سالار کا انتظار کرنا چاہیے۔“

حالانکہ خود مادام کو کلاڈیوس کا اتنا نہیں تھا۔ وہ باقی تھی کہ کلاڈیوس اب بھی واپس نہیں آئے گا لیکن پھر بھی اس کے دل میں ایک جھٹیلا تھا۔ شاید اسے میری یاد ملے۔ آخر میں اسے اس لاڈلیارے پالا ہے۔

تھیوڈورا بالکل چپ تھی۔ گم گم اور خاموش۔ مادام اس سے کچھ پوچھتی جب بھی نہ بولتی۔ مادام کے قلم پر لشکر کے گرد پہرہ لگا دیا گیا۔ دشمن کے حملے کا بے حد خضر تھا۔ سب آسٹروی سپاہیوں کے لیے قلم تھا کہ وہ ہتھیار باندھ کر دیں۔ آسٹروی لشکر کے سالاروں نے بار بار مادام سے اپنے سپہ سالار کلاڈیوس کے بارے میں پوچھا لیکن مادام نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔

”وہ ابھی تک روی لشکر سے واپس ہی نہیں آیا۔“

بعض آسٹروی سالار تھیوڈورا کی خاموشی کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ وال میں ضرور کچھ کالا ہے لیکن انہیں زیادہ سوچنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس وقت سہ پہر ڈھس رہی تھی جب شیراز کے شاہین بے وقوف مادام تھروشا کے لشکر تک پہنچے۔ آخر ایک جنگ سے دورے میں چھپ پھٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ مسلمان درے میں ہر طرف سے داخل ہوئے اور اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے ہوئے آسٹروی جنگجوؤں کے ساتھ ٹکرائے۔

آسٹریا کے یہ سپاہی مایہ ناز شمشیر زن تھے۔ چنانچہ جنگ سے دورے میں میدان کارزار جگمگا گیا۔ دونوں طرف کے تلوار باز ایک دوسرے پر جھپٹ جھپٹ کر وار کرنے لگے

سے مادام کو دیکھنے لگا۔ وہ مسلسل بول رہی تھی۔

”وہ دیکھو میری بیٹی مجھے بلا رہی ہے۔ میں آ رہی ہوں میری بیٹی! ارموت، میں آ رہی ہوں۔ میں آ رہی ہوں میری جان! میں نے تمہیں بہت دلایا۔ اب نہیں رلاؤ گی۔ دیکھو میں آ رہی ہوں۔“

مادام تھوڈشیا اچانک اپنی جگہ سے اچھلی اور اپنے نزدیک کھڑے ایک ترک سپاہی کی کمرے کا کھنکھال کیا۔ اس سے پہلے کہ شیراز یا دوسرے لوگ کچھ سمجھتے۔

مادام دودھاری ججز اپنے پیٹ میں گھونپ چکی تھی۔ وہ آخر دم تک یہی کہتی رہی۔

”میری بچی ارومت۔ میں آرہی ہوں“
 مدام تھر ویشا رہتی تھی۔ لیکن شیر اور چھوٹے بچہ پایا۔ شیر راز
 اس کی ایک بات سمجھ نہ سکا۔ وہ چھوٹے بچے کی آغوشوں
 بھری نگاہوں سے مدام کی آغوش دیکھتا رہا اور پھر رنجیدہ
 میں جھڑے آسٹروی افسروں کی جانب بڑھ گیا۔
 ”مدام تھر ویشا کی بچی تھیو ڈور اور اس کا بیٹا کلاؤس
 کہاں ہیں؟ تم میں سے جو بتائے گا اسے چھوڑ دیا جائے
 گا باقی سب قتل کر دیا جائے گا۔“

آسٹریائی افسر ایک دوسرے کا منہ تھکے لگے اور پھر اچھے لمحے تقریباً سب ہی شیراز کو بتانے کے لیے تیار تھے۔ شیراز کو بتایا گیا کہ کلادیس روئیںسٹر کی جانب گیا لیکن لوٹ کر نہ آیا اور مادام اسٹر و سکا کی بیٹی چند چھٹوں کے ساتھ آسٹریا کی طرف روانہ کر دی گئی ہے۔ آج دوپہر کے وقت ہی تھیوڈورا کو حفاظت کے نقطہ نظر سے مادام اسٹر و سکا کی طرف بھیج دیا ہے۔ ہم لوگ یہاں رہ گئے تھے کیونکہ ہم ترکوں کے شمالی حصار پر حملہ کرنے والے تھے۔ ہمیں صرف اسے سپہ سالار کا انتظار تھا۔

غروب آفتاب کے بعد شیراز نے کوچ کا حکم دیا اور تیز رفتار عثمانی دستہ چند روزہ سوئیسی قیدیوں کے ہمراہ بلطجی کے پڑاؤ کی طرف لوٹنے لگا۔

انہیں جنگل میں رات آگئی تھی۔ یہ ان کے سفر کی پہلی

اب شیراز نے کھاؤ پس کوڑھونڈنا ترک کر دیا اور مادام کی طرف بڑھنے لگا۔ چاروں طرف دونوں فریقین کے فوجی قطاروں میں کھڑے تھے۔ عیسائی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور مسلمان برہنہ قمیضیوں کے ساتھ۔ شیراز اداشوں کے اوپر سے گزرتا ہوا مادام تھروٹیا کے بالکل سامنے آ رہا۔ مادام نے سر اٹھایا اور شیراز کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ شیراز نے مادام سے سوال کیا۔ ”تمہاری بیٹی اور بیٹا کہاں ہیں؟“

مادام کی سچھت نہ ہوئی۔ آج شیراز کو وہ وہی مادام دکھائی دے رہی تھی جسے اس نے پہلے روز ایک حادثے کے موقع پر دیکھا تھا۔ مادام کی کھنٹی نے ایک طالبہ کو چل دیا تھا اور وہ دھوم کے پتوں میں سچھت ہوئی تھی۔ شیراز نے پھر ہنسا۔

۱۵۰ چوں اوتھو دوڑا کہاں جس سے کہ کر تم میری بہن کے قاتل کو میرے حوالے کر دو تو میں تمہاری بیٹی کی زندگی واپس کر دوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں مادام کہ تمہوؤں کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔“

مادامِ خنی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ اس نے شیراز سے ایک عجیب سوال کر دیا۔

”تمہاری بہن کیسے تھی؟“ سختی بڑی ہوئی۔ تم سے بڑی؟ خوب صورت تھی ہوئی، میری طرح۔ جیسے جوانی میں میں خوب صورت تھی۔ وہ کیسے چلتی تھی؟ کیسے باتیں کرتی تھی؟ تم لوگوں نے اس کا نام کہا کیا تھا؟ نورین؟۔ نہیں! یہ نام اچھا نہیں۔ میں اپنی بہن کا نام کلاؤ یہ رکھوں گی۔ میری بھی پتی کہاں ہے؟ کہاں ہے۔ کہاں ہے میری بچی۔ کہاں ہے۔ میری بچی لا کر دو۔ ہاں۔ ہاں۔ میری بچی لا کر دو۔ تمہاری ماں کے پاس ہے میری بچی۔ وہ رو رہی ہے۔ وہ دیکھو۔ وہ۔ میں اس کی آواز سن رہی ہوں۔ وہ رو رہی ہے۔ وہ مجھے بلارہی ہے۔“

شیراز کو یقین ہو گیا کہ مادام تحریر و شیا اپنا دامغا تو ازل
کھو چکی ہے۔ وہ بھی مہس رہی تھی تو بھی رورہی تھی۔ نہ
جانے کون سی بیچی کو پا کر رہی تھی۔ شیراز بتا سف نظروں

لیکن قیود اور ان سے ہمیشہ اپنا بھائی ہی سمجھا تھا۔
 کلاؤٹس آج حرج سے ایسے ٹکا تھا جسے آنکھ سے آنسو
 نکل جاتا ہے۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ ابھی وہ
 کلاؤٹس کے صدمے سے باہر نہ آئی تھی کہ ماں نے اسے
 آسٹر بیا جانے کا حکم دے دیا۔

تھوڑا کے لیے آسٹریا میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو مقدونیا میں رہنا چاہتی تھی۔ اس نے ماں سے لاکھ کہا کہ وہ مقدونیا میں جانا چاہتی ہے۔ اس نے ماں کو بتایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ اپنے باپ جیسے استاد پاتھے اڈریا کے ہاں رہے گی لیکن مادام ہندو کی تھوڑا آسٹریا کے شاہی محل میں جا کر رہے۔ اسی طرح کی بہت سی بے چاریاں اس کے دل میں گزریں لے رہی تھیں۔ مقدونیا میں اسے امید تو تھی کہ بھی نہ تھی شیراز سے مل پائے گی۔ شیراز سے پیار کرتی تھی۔ اس نے اسیٹیم میں شیراز کے ساتھ اپنی محبت کا بھی انکشاف کیا تھا لیکن یہ از کے چہرے نے بعد اسے احساس دیا کہ وہ اپنے محبوب سے بھیچ رہی تھی۔ شیراز اس سے دوست تھا، اور ایسا دوست کہ جس کے ساتھ وہ اپنے ذہنی اور فنی پرور بات کر سکتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔

خیمے میں لیٹا اکیلی تھوڑا سا چنے حالات پر آنسو بہا رہی تھی۔ آج دن بھر وہ رول رہی تھی۔ طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک ایک لمحے کے لیے بھی اس کے 'نوسوں' نہ رکے تھے۔ وہ اس بھی رو رہی تھی۔ کالج کی وہ گڑیا 'نوسوں' کی شکل میں چمکتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اکیلی تھی۔ بچے مروں اور بیابان جنگل میں بالکل اکیلی۔ دن بھر روتے رہنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ بستر میں منہ چھپائے روتی ہوئی تھوڑا سا آنکھ لگ گئی۔ گویا اس کے دل کے سمندر میں اٹھنے والی 'نوسوں' کی موجوں کو قہر آ گیا۔ شاید فرشتوں نے اسے لوہیاں دی تھیں لیکن آدھی رات کے وقت اجاگم اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ شاید کھٹکے کی آواز تھی۔ تھیوڈورا نے چہرے سے مکمل ہٹا کر دیکھا تو مارے خوف سے اس کی چیخ نکل

رست تھی۔ پانچ مردوں میں ایسی تھوڑا بہت ڈور رہی
تھی۔ بے شک سب آسرو کی عیسائی فوجی تھے لیکن ان
کی نظروں میں تھوڑا کرکٹ انسانیت کے لیے احترام نہیں
تھا۔ بے شک وہ تھوڑا کو بھی مادام مارم کہہ کر مخاطب
کرتے ہوئے یہاں تک آئے تھے لیکن تھوڑا مطمئن
نہیں۔ وہ ایک انتہائی حسین و شیرازہ تھی۔ وہ مادام تھریشیا کی
حقیقت بنی تھی۔ پورے لائیکسم میں کوئی لڑکی بھی تھوڑا کرکٹ
ہم پلہ نہ تھی۔ تھوڑا کرکٹ مسکور کردینے والی آنکھیں اور اپنی
ماں سے ورثے میں ملا انتہائی مناسب بدن ان پانچ
عیسائی سپاہیوں کے شعلہ ہوس کو ہوا دے رہا تھا۔ آج کا
سورج طلوع غمی آرام و مصائب کے ساتھ ہوا تھا۔ آج صبح
دریائے پرچھ کے چرچ میں جو کچھ ہوا، تھوڑا اسے بھلا
نہ پائی تھی۔ تھوڑا کرکٹ ماں سر پہنکی تھی۔ لیکن تھوڑا اس
بات سے بے خبر تھی۔ وہ آخری مرتبہ ان ماں کو نہ وہی
دستوں کے ساتھ آیا۔ جب ان دو ماں نے جڑیں تو ان کے
زیر تعلیم قرار دے کر پابند رہے۔ روبروب پیپ جڈرمان
اور تھوڑا آسرو مقیم دستوں کو صرف نکال کر لے گیا۔
جڈرمن نے میں ہی ان پر قابو پا لیا۔

تھیوڈورا کے محافظ سپاہی تھے، مادام تھرڈیشیا کی خودکشی سے باخبر تھے۔

انہوں نے لاؤ روشن کر دیا۔ ایک بڑا خیمہ نصب کیا گیا اور اس خیمے کے عین سامنے تھیموؤں کے لیے ایک لگ چھوٹا سا مضبوط خیمہ لگایا گیا۔ دو دو پہرے داروں و رات بھر جاگ کر تھیموؤں کے خیمے کے گرد پہرہ دینا تھا تاکہ مادام تھریشا کی بیٹی انتہائی سکون کی نیند سو سکے۔ جبکہ بچپنوں سپاہیوں کا سالار پہرے داروں میں شامل نہیں تھا۔ اسے رات بھر سونا تھا تاکہ اگلی صبح تیز رفتار سفر کے لیے خود کو تیار کر سکے۔

نہ جانے کیوں تھوڑا کال بہت ڈر رہا تھا۔ شاید یہ اس کے ساتھ پیش آنے والے دن بھر کے واقعات کا اثر تھا۔ وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کر رہی تھی۔ آج اس کا بھائی اس سے پوچھ گیا تھا۔ وہ جیسا بھی تھا۔ برا بھلا۔

تھا۔ بالکل ایسے جیسے کوئی نازک چیز یا کسی گلدے کے نیچے آ گئی ہو۔ تھیوڈورا کی فلک شکن چٹخیں پورے جنگل کو لرزا رہی تھیں لیکن سائڈ نمائند بخت شخص خوب صورت تھیوڈورا کے حسین جسم کو ہر طرح نوج رہ رہا تھا۔

تھیوڈورا کی چھتیں باہر کھڑے سے پہلے دار بھی سن رہے تھے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کھجور مسکرا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی شراب کی بوتلیں تھیں اور وہ بڑی بے چینی سے اپنی باری کی منتظر تھے۔ اچانک باہر کھڑے پہرے داروں کو دوڑتے ہوئے گھوڑوں کے

قدروں کی آواز سنائی دی۔ چاروں سپاہیوں نے اپنی ساریں ہتھ لیں۔ اچھے کئے ایک چھوٹا سا ان کے سامنے تھا۔ تاریکی کے درمیان سے بچنے والی سپاہیوں کے سامنے تھا اور سوار کوں تھا جو ایک تپتی ہوئی کرن چاروں پہنچے تھا اور

اس نے آپاں واحد میں چاروں میں سے دو کے سر اڑا دیے۔ قتل ہونے والوں کی دلدوز چیخ فضا میں گونجی تو خیمے کے اندر ساکنہ غماض کے ہاتھ رک گئے۔ وہ تھوڑا دیر کو اُٹے آبرو کرنے کے بہت ہی قریب تھا کیونکہ وہ تھوڑا دیر کے جسم سے اس کا لباس چھیننے کی شکل میں اڑا دیا تھا۔ تھوڑا دیر کی رانیں مشعل کی روشنی میں برہنہ دکھائی دیے مری تھیں لیکن ابھی وہ اُنساں اُنساں نہ اتار پایا تھا کہ اسے قتل

ہونے والے سپاہیوں کی چیخ سنا دی۔ باقی کے دو سپاہی حملہ آور کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ تلواروں سے تلواریں نکلنے کی آواز سن کر سائنڈ ٹیچس بھی پھرتے سے اٹھا اور پٹی تلوار سونت کر خم سے باہر کی جانب چل دیا۔ تھوڑوڑا کی آہو چیخ کی بھی۔ تھوڑوڑا نے جس خدا سے دعا کی تھی۔

حق خدا نے آسمان سے ایک فرشتہ بھیج دیا تھا۔ اب پراسرار گھر، سارا اپنے گھوڑے سے اتر کر زور دیا تھا۔ اس نے ایک دوپٹے پر کوئل کر دیا تھا۔ اس میں اب سپاہیوں کا سردار اس کے مقابل تھا۔ پراسرار دروگر نے اپنا چہرہ نقاب سے چھپا رکھا تھا۔ اب ساتھ نما سرور علیٰ نقاب بازی کے جوہر دکھا رہا تھا۔ اس کا تمام شام ہرن ہو چکا تھا۔ اس کے سر سے جنیت کا بھوت بھی اتر چکا تھا۔ اب تو اس کے سر

خوشی سر بھی لیتی تو تب بھی ٹھک تھا۔ لیکن ابھی تو اسے لڑائی کے جسم کی ضرورت تھی۔ وہ کسی لاش کے ساتھ جنسی ہوس پوری نہ کر سکتا تھا۔ سپاہیوں کا سردار بڑی احتیاط کے ساتھ چلتا رہے۔

تھیوڈور اسے خبر دے اپنے دونوں بھائیوں میں تمام کیوں
 اور پھر اٹھ کر اگلی لمحے وہ ایک ہی وار میں اسے اپنے
 پیٹے میں سمیٹ کر رکھتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے
 ٹوکاؤں پر لکیریں بناتے ہوئے تجڑ میں پر رورہے تھے
 اور وہ قہقہے شگاف جیٹوں کے ساتھ بار بار ہنس رہی تھی۔

”خبردار! میرے نزدیک مت آنا، ورنہ میں خود کو مار دوں گی۔ خبردار میرے نزدیک مت آنا ورنہ میں اپنی جان لے لوں گی۔“

ساتھ نما سہا ایک بار پھر رک گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں کچڑی شراب کی بوتل میں سے آخری گھونٹ پیا اور بوتل ایک طرف پھینک دی۔

”الزکی! اتم میری بات مان لو تو فائدے میں رہو گی۔
ایا تم چاہتی ہو کہ میں تمہاری لاش کے ساتھ اپنی مرضی
وکی ہو کر کروں؟ کیا تم اپنی لاش کی بے حرمتی چاہتی ہو؟
جیسا خنزیر جینک دو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ وعدہ کرتا
ہوں۔ چھوٹیں کہوں گا۔“

اتنا کہہ کر سائڈ ٹراپس نے تھوڑا کواکب عجیب دیکھا۔
 - اے! اس نے تھوڑا کواکب کے عقب میں یوں اچانک چھپتی
 ہوئی نگاہ دوڑائی جیسے لڑکی کے پیچھے اس نے کوئی اور شخص
 دیکھا ہو۔ وہ لڑائی بھڑائی کا ایک عام سارہ تھا۔ تھوڑا
 لڑکی جال میں آگئی اور کسی خوف زدہ غزال کی طرح

بپ کر اپنے پیچھے دیکھنے لگی۔ یہی دوسرا تھا جب سائلہ نما
س نے تھوڑا سا تازہ کلاں لٹکا کر اپنے لوہے جیسے
تھوں میں جکڑ لیا۔ اس کی گرفت گویا آہنی پھنکڑیوں کی
گرفت تھی۔ اب تھوڑا سا خون کو نہ پا سکتی تھی۔ وہ یہی طرح
پانے اور کسمائے نے لگی۔ سائلہ نما شخص نے اس کی نازک
پاں میں دو کرفجر اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور تھوڑا سا کو
ٹھکانے پر بستر پر ڈال دیا۔ اگلے لمحے وہ خود بھی تھوڑا سا کو

فیہوداورانے خودکشی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے آج تک اپنا جسم محض اس لیے محفوظ رکھا ہوا تھا کہ وہ اسے شیراز کی امانت بسجستی تھی۔ وہ شیراز کے علاوہ کسی اور کا ہاتھ نہ چنے یا کچھ دہود پر برداشت نہ کر سکتی تھی۔

تھیوڈورا تیزی سے اٹھ اڑھٹھ گھنٹیں دوڑا لے لی۔ یہ
بچھنے کے لیے کہ اگر بھاگ نکلے گا کوئی راستہ ہو تو وہ
بھاگ نکلنے کی کوشش کرے۔ لیکن اسے تمام راستے
مسدود دکھائی دیے۔ خیمے کے باہر چاروں آسٹری سپاہی
بے چین اور مضطرب کھڑے تھے کہ کب ان کا سردار اپنی
بوسن مٹاکر باہر آئے اور وہ اپنی درندگی کا مظاہرہ کرنے
کے لیے اندر جائیں۔ تھیوڈورا کے بھانجے کا جیج سچ کوئی
راستہ نہیں تھا۔ چنانچہ مرنا کیا نہ مرنے کے مصداق اس نے
چنانچہ ختم ہوا۔

اس سے قبل وہ اس سائڈ جیسے آدمی کے خوف سے بھر نکلتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ حالانکہ یہ لمبا خنجر شروع سے ہی تھپو ڈورا کے لباس میں چھپا تھا۔ تھپو ڈورا کے ہاتھ میں چمکتا ہوا لمبا خنجر دیکھ کر سڈ ٹھٹک گیا۔ وہ کچھ دیر تک تھپو ڈورا کو کھڑکھڑاتا تھا اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔

”میری تھپی سی گڑبایہ کھلوتا تمہارے لیے تھپک نہیں۔
خاصی سے لگ گیا تو ریتیم جیسا اماںم جسم کٹ جائے گا۔ یہ
مجھ سے دو شاہاں! اچھے بچوں کی طرح بات مانو۔“
تھیوڈورا ایک نلت خنجر دونوں ہاتھوں میں پکڑے
اے بستر پر اٹھ کھڑی ہوئی اور ہڈیانی انداز میں جیج جیج کر
کہنے لگی۔

”خبردار۔ میرے نزدیک مت آتا۔ ورنہ میں اپنے آپ کو مار دوں گی۔ اپنی جان لے لوں گی۔ خبردار جو آپ کے قدم بھی آگے بڑھایا تو۔ نکل جاؤ یہاں سے ذلیل کمینے! میری ماں نے تم پر افتخار کیا اور تم؟ تم انسان نہیں جانور ہو۔ خبردار، دھور ہو مجھ سے۔“

محض چند گھنٹے مرنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ بعد میں وہ

گئی۔ تھیوڈورا کے خیمے میں سپاہیوں کا سردار موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی اور اس کے قدم بری طرح ڈول رہے تھے۔ تھیوڈورا سمجھ کر کہ وہ یقیناً برے ارادے سے اس کے خیمے میں آیا تھا۔ تھیوڈورا کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ آخر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔ اب اسے اس بیابان جنگل میں کون بچانے کے لپٹا سکتا تھا۔ وہ دہلی دلی میں خدا کو پکارتی تھی۔ شرابی افسر بری طرح ڈول رہا تھا۔ وہ ایک لمبا بڑا اور کسی سینڈ کے کی طرح گھٹھے ہوئے جسم کا مالک شخص تھا۔ تھیوڈورا کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے اس نے نشے کی حالت میں خیمے سے باہر کی طرف منہ کر کے کہا۔

”ہاں ہاں۔ میں نے سن لیا۔ تم سب ہی بادی آئے گی لیکن میرے بعد۔ پہلے میں اور پھر تم چاروں۔ آج رات ہم عشا کریں گے۔ ہا ہا ہا!“

وہ قہقہہ اگرا رہا تھا۔ نشے میں عرق ساٹھ جیسا آستری
سپاہی تھیوہو اور اکی جانب بڑھ رہا تھا تھیوہو اور اکی چڑیا کے
بچے کی آستری میں بیٹھی تھیوہو کے پیچھے تھیوہو کی۔ اسی ملک
سانڈرک کی اور اسی ملک پر چبھتے ہوئے لٹے تھے۔

”اگر ہم تمہیں مار دیں اور یادام سے یہ کہہ دیں کہ تمہیں دشمنوں نے قتل کر دیا۔ دکن زیادہ تعداد میں تھے لہذا ہم بچائیں پائے تو تمہاری ماں کو یقین کرنا پڑے گا۔ بہتر یہی ہے کہ تم میرے ساتھ تعاون کرو۔ تم اپنا جسم آج رات کے لیے ہمیں دے دو تو ہم تمہیں بخیر و عافیت آسٹریا تک پہنچا دیں گے لیکن اگر تم اپنا نازک اندام بدن ہم سے دور رکھو گی تو ہم زبردستی کریں گے اور آخر میں تمہاری جان لے لیں گے۔“
”نہ رہو گی نہ ہمیں کوئی خطرہ ہو گا۔ میں بھوکا ہوں میری جان! میں پیاسا ہوں میری جان! مجھے پیاس بجھانے دو۔“

تھیوڈورا کا بدن خراں رسیدہ تھے کی طرح لڑنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ آج کی رات اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔ یہی سوچ کر اس نے فیصلہ کیا کہ آبرو برباد ہونے سے پہلے ہی کیوں نہ جان دے دے۔

پناہ گزین ہوئے تھے؟ شیراز کو یاد آیا اس جزیرے پر پہلے روز ملنے والے بچوں نے شیراز اور اس کے ساتھیوں کو روک کر کہا تھا۔

”کیا تم ہمارے دود کو لینے آئے ہو؟ ہم اپنا دود تمہیں نہیں دیں گے۔“

ہاں، وہ ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ ایک چھوٹی سی بچی جس نے یہ الفاظ کہے تھے۔ قدرت کے اتفاق پر شیراز نگ رہ گیا۔ وہ سکندر کے قریب جا کر پلٹ آیا لیکن انہیں سکندر کے زندہ ہونے کی خبر نہیں تھی۔ سکندر اور شیراز اندر گھر میں داخل ہوئے تو شیراز کی نظر سب سے پہلے اپنی ماں پر پڑی اور شیراز کی حیرت ایک خوش گوار جھج میں بدل گئی۔

”امی جان! آپ یہاں؟“

لیکن صفائی تو در رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے دوڑی اور شیراز کے سامنے آ کر گر گئی۔ صفائی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ وہ اپنے لڑے بیٹے کو زندہ اپنے سامنے دیکھ رہی تھی۔ اس نے تیزی سے اپنے دونوں ہاتھ شیراز کے چہرے پر پھیرنے شروع کر دیے جیسے شیراز کے ہونے کا یقین کرنا چاہتی ہو۔ وہ والہانہ انداز میں شیراز کے رخساروں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور آنسو تھے جبکہ زبان آپ ہی آپ تھوڑ رہی تھی۔

”میرا بیٹا! میرا بچہ! میرا شیراز! میرا شیراز آ گیا۔ ارے دیکھو میرا بیٹا آیا ہے۔ ارے طاہرہ جلدی سے باہر آؤ دیکھو شیراز آیا ہے۔“

اور پھر اچانک جیسے وہ پھوٹ پڑی۔ اس نے شیراز کو اپنی بانہوں میں بھر لیا اور زور زور سے رونے لگی۔ مدتوں بعد ماں کے سینے سے لگ کر شیراز کو یوں لگا جیسے کائنات کے تمام بادل چھٹ گئے ہوں۔ جیسے من کی مضرط موجوں کو قرار آ گیا ہو۔ آج شیراز مدتوں بعد ایک عجیب طرح کی طمانیت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے انسان مندی کے جذبات سے لبریز ہو کر سکندر کی طرف

سکندر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لیکن شیراز کی حیرت آسمانوں سے بھی بلند تھی۔ دونوں بالکل سانس و جامد کھڑے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ گویا کسی فرشتے نے ان کی جائیں نکال لی ہوں۔ شیراز کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ سکندر بہت کمزور تھا۔ اس کا چہرہ ہلکی سی طرح زرد اور آنکھیں باہر نکلتی ہوئی تھیں۔ بچی نظر میں تو شیراز سے پہچان بھی نہ پاتا تھا۔ آخر سکندر کو کیا ہوا تھا؟ دونوں سانس و جامد کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ کئی لمحوں کے بعد آخر شیراز اپنی جگہ سے اچھلا اور سکندر کے سینے سے جا لگا۔ سکندر نے بھی چارے دلوں کے ساتھ اسے سخت کیا۔ اب دونوں دوست ہنس بھی رہے تھے اور رو بھی رہے تھے۔ وہ بار بار ایک دوسرے کو چھوڑتے، ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے اور پھر سے نغمہ گیر ہو جاتے۔ کافی دیر تک یہی ہوتا رہا پھر شیراز نے پوچھا۔

”ارے سکندر! یہ تمہیں کیا ہو گیا۔ تم تو بالکل بیمار دکھائی دے رہے ہو۔ خدا کے لیے مجھے بتاؤ تمہیں کیا ہوا؟ تمہارا چہرہ ہلکی سی طرح زرد کیوں ہے؟“

سکندر مسکرا رہا تھا۔ اس نے بڑے ہنسمندانہ کے ساتھ شیراز کو جواب دیا۔

”اب تو میں ٹھیک ہوں۔ چلتا پھرتا ہوں۔ دروازے تک بھی آ جاتا ہوں اور کبھی کبھی گلی میں بھی نکل جاتا ہوں۔ مگر اسود کے اس طوفان میں مجھے رہنے کی ندری پر چوٹ لگی تھی۔ پھر نہ جانے کیسے شرفی مگر اسود کے ایک چھیرے نے میری جان بچائی۔ وہ مجھے اپنی کشتی میں ڈال کر اپنے گھر لے گیا جہاں ان لوگوں نے میرا علاج کیا اور میں ایک لمبا عرصہ ان کے اندرونی کمرے میں بیمار پڑا رہا۔ اس چھیرے کے بچوں نے مجھے بیمار سے ”دودو میاں“ کہنا شروع کر دیا تھا۔ تقریباً ایک ماہ پہلے میں گھر لوٹا ہوں اب تو پہلے سے بہتر ہوں۔“

اچانک شیراز کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ کہیں سکندر اسی جزیرے پر نہیں تھا جہاں یہ لوگ کچھ وقت کے لیے

اپنے سر پکٹان الفانسو اور اپنی بیوی صوفیہ کو لے کر استنبول چلا آیا۔

استنبول میں پکٹان الفانسو اور صوفیہ کو ان کے گھر چھوڑ کر شیراز کو بلقان کی جانب چلا گیا۔ یہاں طاہرہ بھی۔ شیراز کے جاں نثار ساتھی سکندر پاشا کی بیوی حارہ کو بلقان کی جانب جاتے ہوئے شیراز کا دل بہت رنجیدہ تھا۔ انہی پہاڑیوں پر پہلی مرتبہ شیراز نے زندگی کا دوسرا روپ دیکھا تھا۔ تمام راستے وہ خاص پاشا اور سکندر پاشا کو یاد کرتا رہا۔ شیراز اور زریاب بھی اسے بہت یاد آئے۔ بار بار اس کی آنکھوں میں نمی آ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ طاہرہ کو سکندر کی موت کی خبر کس طرح سنائے گا۔ یہ ایک بہت مشکل کام تھا۔ کبھی وہ سوچتا کہ یہاں سے واپس چلا جائے اور سکندر کی شہادت کی خبر پکٹان الفانسو کے ذریعے کو بلقان بھیجے لیکن پھر اس نے اپنے دل پر پتھر رکھا اور پنا سفر جاری رہنے دیا۔

آج وہ خاص بابا کے گاؤں میں ایک عرصے بعد داخل ہو رہا تھا۔ گاؤں کے باہر اچھی تہی چٹانوں میں کھیلنے ہوئے بچوں کو دیکھ کر شیراز کو کھلی ہوئی کمرہ دار خاص پاشا کی ہستی ابھی آتا ہے۔ نہ جانے کیوں غم کے باوجود اس کے چہرے پر مسکراہٹ رہنے لگی۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ وہ طاہرہ اور اس کے بوزھے ماں باپ کا سامنا کیسے کرے گا۔ سکندر چند راتوں کے لیے ہی دوبہا بنا تھا۔ شیراز کے دس پر گھونٹے پڑ رہے تھے۔ نہ جانے کیوں وہ اپنے آپ کو سکندر کا مجرم سمجھ رہا تھا۔ بالآخر سکندر کا گھر آ گیا۔ شیراز گھوڑے سے اتر اور اس نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی۔ سہ پہر کا وقت تھا اور دیواروں کے سائے لمبے ہو کر گلیوں کے عرض کو پاٹ چکے تھے۔ شیراز دستک دے کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی تمام تر توجہ دروازے کی جانب تھی اور اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ معاذ دروازہ چرچا ہوا کھس گیا۔ سامنے سکندر کھڑا تھا۔

زنگی کے شب و روز یونہی گزرتے جا رہے تھے کہ ایک دن صغریٰ کی نظر دور سے آتے ہوئے ایک گھڑ سوار پر پڑی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل جھڑکنے لگا۔ وہ اپنے چھانچے سے زیتون کے دانے پھلک رہی تھی۔ زیتون کے صاف دانے ایک برتن سے دوسرے برتن میں منتقل کرتے ہوئے وہ ایک آدھ دانہ منہ میں ڈال کر چبانے لگتی۔ وہ اپنے گھر سے باہر ایک کھلے چبوترے پر زنگی زیتون کے دانے صاف کرنے میں مصروف تھی کہ اس نے ایک اجنبی گھڑ سوار کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ صغریٰ کے ہاتھ رک گئے۔ اسے فوراً شیراز کا خیال آیا لیکن یہ سوچ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا کہ شیراز تو آج گھر پر نہیں تھا۔ آج وہ مقدمہ نیا گیا تھا۔ اپنے استاد پانچھو ایسا کھڑے تھک۔

صغریٰ گھبرا گئی۔ صوفیہ گھر کے اندر تھی۔ گویا دونوں عورتیں وسیع چھتوں میں بنے اگوتے مکان میں ایٹلی تھیں۔ صغریٰ اب اپنی جنت میں کسی کی مداخلت نہ چاہتی تھی۔ گزشتہ دنوں کی وجہ سے اس کے دل میں ہمیشہ ایک دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کچھ نہ ہو جائے۔

تو منہ گھڑ سوار کو اپنی جانب آ کر دیکھ کر صغریٰ کے دل میں یہی خیال آیا کہ کہیں وہ کوئی دشمن نہ ہو۔ کہیں وہ امام تھرو شیا کا بیٹا کلاڈیوں نہ ہو جس نے اس کی چاند جیسی بیٹی کو اپنی درندگی کا نشانہ بنا کر بے دردی سے ہلاک کر دیا تھا۔ صغریٰ نے چھانچے ایک طرف رکھ دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے صوفیہ کو بلانا چاہا لیکن یہ سوچ کر رک گئی کہ صوفیہ جوان ہے، اس کے ہونے والے پوتے کی ماں بننے والی ہے۔ اسے اجنبی کے سامنے نہ بنانا ہی بہتر ہوگا۔ لیکن صغریٰ کے اپنے ہاتھ پاؤں بری طرح پھولنے لگے تھے۔

اب اجنبی گھڑ سوار نزدیک آ چکا تھا۔ یہ شیراز کے قد سے متا جتا ایک خوب رو جوان تھا۔ وہ صغریٰ کے سامنے آ کر گھوڑے سے اتر لیکن اس کی نگاہیں صغریٰ پر ہی تھیں۔ وہ ان کے گھر آتے اور وہ دونوں اپنے استاد کی خوب دل کھول کر خدمت کرتے۔

تمہارے ساتھ آنے والا نہیں ہے۔“

شیراز بھی سچی سوچ رہا تھا۔ وہ کیتان کا مزاج جانتا تھا۔ دیر تک شیراز، سکندر اور صغریٰ باتیں کرتے رہے اور آدھی رات کے قریب کہیں جا کر وہ سو گئے۔

شیراز نے چند روز بلقان میں قیام کیا اور پھر آئندہ ہفتے ملنے کا وعدہ کر کے بلقان سے استنبول کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس بار شیراز کے ہمراہ اس کی ماں بھی تھی۔ ہفتہ بھر پہلے جب وہ اسی راستے کو وہ چلتا تھا تو اسے یوں لگتا تھا جیسے دنیا کی سب طقیتیں اس کے پاس آ گئی ہوں۔ ہاں یہ سچ تھا۔ کیونکہ آج اس کی ماں اس کے ساتھ تھی۔ شیراز نے پیادہ پھری نظروں سے اپنی اہلیز عمر ماں کے چہرے کی جانب دیکھا اور دل ہی دل میں خوش ہونے لگا۔

تین ماہ بعد شیراز ایک ماہر و ہقان بن چکا تھا۔ وہ اپنی زندگی کی کہانی بھی لکھ رہا تھا اور اپنے کھیتوں میں فصلیں بھی اگا رہا تھا۔ صوفیہ اس کے ہمراہ تھی اور دونوں مل کر دن بھر پھولوں کی کیاریاں بناتے۔ بنزریاں کا شت کرتے اور گہری گہری باتیں کرتے رہتے۔ صوفیہ بھی جلد ہی ماں بننے والی تھی۔ وہ شیراز کے ساتھ بے حد خوش تھی۔ وہ اپنی ساس اور شوہر کے ساتھ اس چھوٹی سی جنت میں شب و روز اپنے پروردگار کا شکر ادا کرتی رہتی۔ سر سبز چھتوں کے نیچوں بیچ ان کا ایک کھلا مکان تھا جس میں گائے بھینسیں اور بکریاں موجود تھیں۔ کچے کھن میں دن بھر مرغیاں کت کت کرتی رہتیں اور صوفیہ انہیں دیکھ دیکھ کر نہال ہوتی رہتی۔ صوفیہ نے یہاں آنے کے بعد مصوری پھر سے شروع کر دی تھی۔ اب وہ دیو، دیوتاؤں کی تصویروں نہیں بناتی تھی۔ اب وہ اندھے سے نکلے ہوئے مرقی کے پتوں اور کھیتوں میں مل چلاتے ہوئے بیلوں کی جوتی کو کپڑوں پر اتارتی تھی۔ ہر ہفتے لائسیم کے پائتھے اویس ان کے گھر آتے اور وہ دونوں اپنے استاد کی خوب دل کھول کر خدمت کرتے۔

سکندر کہنی کے بل اٹھ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ ”یہ آپ کی فرما رہے ہیں جناب! کیا تم ہمارے ساتھ نہیں رہو گے؟ میں تو خوش تھا کہ اب ہم ہمیشہ اکٹھے ہیں گے۔“

”نہیں سکندر! مقدمہ نیا یہاں سے دور نہیں۔ ہم ہمیشہ اچھے دوستوں بلکہ رشتہ داروں کی طرح ملتے رہیں گے۔“

شیراز اور سکندر ہاتھوں میں مصروف تھے کہ کمرے پر دستک ہوئی، دروازہ کھلا تھا۔ سکندر نے آواز دی۔ ”کون ہے آ جاؤ!“

آنے والی صغریٰ تھی۔ اس نے کمرے میں آتے ہی سکندر سے کہا۔

”بیٹا! اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بھی یہیں سو جاؤں؟ اب شیراز آ گیا ہے تو دوسرے کمرے میں نیند نہیں آ رہی۔“

سکندر تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ماں جی! آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ یہی ایک دور امتیں ہی تو ہیں جو یہ آپ کے پاس سوئے گا اور نہ پھر تو ساری میری بیوی کے کمرے میں ہی سوئے گا۔“

صغریٰ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس نے دل کھول کر قہقہہ لگایا اور پھر ہنستے ہنستے کہنے لگی۔

”ہاں ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔ ویسے ایک بات بتاؤں۔ میں آئی ہی اپنی بہو کی باتیں سننے کے لیے ہوں۔ آج میں شیراز کو سونے نہیں دوں گی۔ اس سے کہوں گی کہ مجھے میری بہو کی ساری باتیں بتائے۔“

شیراز ہنس رہا تھا۔

”امی جان! ایک دو دن کی ہی تو بات ہے۔ پھر ہم سارے اکٹھے رہیں گے۔ میں کوشش کروں گا کہ کیتان الفاسو بھی ہمارے ساتھ مقدمہ نیا آ جائیں۔“

سکندر نے شیراز کی بات سنی تو پہلے حیرت کا اظہار کیا اور پھر مت یسور تے ہوئے کہنے لگا۔

”کیتان تمہارے ساتھ آنے والا نہیں، تم دیکھ لینا۔ وہ آئے باسنورس کے کنارے کو چھوڑنا پسند نہیں کرے گا۔ اس کے ساتھ اس کا وفادار ملازم سامکن ہے۔ وہ

دیکھا۔ سکندر کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اسنے میں طاہرہ بھی آگئی۔ وہ سکندر کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ شیراز نے طاہرہ کو دیکھا تو یک آنخت مسکرائے لگا۔ اسی اثاء میں سکندر کی آواز سنائی دی۔

”ماں جی کو میں نے یہاں بلوایا۔ میں نے اپنا آدمی بھیجا تھا۔ مجھے تمہارے بارے میں کچھ کچھ معلومات ملی تھیں۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ تم دریائے پر تھ کے کن رے ہلچل جی کے لشکر میں ہو۔ تب میں نے سوچا کہ ماں جی کو یہیں بلوایوں۔ مجھے یقین تھا کہ تم فارح بن کر آؤ گے شیراز! کچھ کا دور گزر چکا ہے۔ ریزہ کی بڑی کی وہ سے میں مایوس ہو گیا تھا۔ پھر یہاں آ اور طاہرہ کو دیکھا تو میرے زندہ رہنے کی آرزو جاگ اٹھی اور میں چلنے پھرنے لگا۔ لیکن آج تمہیں صحیح سلامت دیکھ کر میں محسوس کرتا ہوں کہ اب میں بالکل تندرست ہو گیا ہوں۔“

آج شیراز بہت خوش تھا۔ زندگی میں اتنی ساری خوشیاں اس نے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ وہ اپنی ماں سے تو الگ ہوئی نہ رہا تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد کھانے کے دسترخوان پر شیراز نے اپنی کہانی سب کو سنائی اور آخر میں کہا۔ ”میں اس ساری داستان کو کسی تنہا گوشے میں بیٹھ کر م کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں بہت سے لوگوں کے لیے نصیحت ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ سب کے سامنے آئے۔“

سب مسکرا کر شیراز کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ رات کو سونے سے پہلے شیراز نے سکندر سے کہا۔ ”اب میں کبھی بازی کرنا چاہتا ہوں۔ میں جنگ و جدل کو پسند نہیں کرتا اور پھر ہلچل جی جیسے شخص کو سلطان نے معزول کر دیا ہے۔ میرے لیے اب ترک فوج میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں ذہنی طور پر ایک فلسفی ہوں۔ سہی نہیں۔ یہ تو حالات نے مجھے ایسے مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ گوار اٹھائے بغیر بات نہیں بنتی تھی۔ میں مقدمہ نیا کے مضامات میں ہی تھوڑی سی اراضی خرید کر باقی ماندہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ شاید اسی طرح میں کچھ لکھ سکوں۔“

ساختم کہا۔
”ہاں ہاں میرے بچے! میں کیسے بھول سکتی ہوں۔
مجھے سب یاد ہے۔ تم کہاں تھے تھے تھے سال۔ کہاں تھے تم؟“
صغریٰ کے ہاتھ بڑی تیزی سے کلاڈیوس کے
رخساروں کو چھو رہے تھے۔ وہ پھر یک دم صغریٰ نے
کلاڈیوس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ کلاڈیوس کو یوں لگا جیسے
دنیا کے دہکتے جہنم میں اچانک کسی ٹھنڈے سائبان کی
چھاؤں میں آگئی ہو۔ جیسے اس کے دہکتے ہوئے دل پر
کسی نے ٹھنڈے پانی کی پھوار چھڑک دی ہو۔ جیسے
صدیوں کی مسافت طے کر کے کسی آرام دہ بستر پر چو
استراحت ہو۔ جیسے جہر کے چھالوں پر کسی نے برف رکھ
دی ہو۔ جیسے اس کے سارے دکھ یک نخت ختم ہو گئے
ہوں۔ کلاڈیوس کے سینے سے ایک لمبی سانس نکلی اور پھر وہ
اگلے لمحے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ بالکل ایک سال
کے بچے کی طرح ہلکے ہاتھوں سے صغریٰ کی بار بار اس کی پیچھے پر
ہاتھ چھیر رہی۔ اس کا ہاتھ، سر، گردن، کندھا اور کان پونجی
اور پھر رونے لگی۔

آج کلاڈیوس زندگی میں پہلی بار رو رہا تھا۔ یوں
پھوٹ پھوٹ کر تو وہ مدام تھرو شیا کے پالنے میں بھی نہ
رو یا ہوگا۔

صوفیہ کے کانوں تک ایک رو تے اور پکٹتے ہوئے مرد
کی صدا چلتی تو مارے حیرت کے اچھل کر کھڑی ہوئی۔
اگلے لمحے وہ دوڑتی ہوئی گھر سے باہر آ رہی تھی۔ صوفیہ
زور سے پتلی تو اس نے سنا صغریٰ کہہ رہی تھی۔

”تم کہاں تھے بیٹا؟۔ آج تک تم کہاں تھے؟۔ مجھے
اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم نے مجھے کیسے ڈھونڈا؟۔ تم مجھ
تک کیسے پہنچے؟“

نوجوان پر نظر پڑتے ہی صوفیہ کے پیروں تلے سے
زمین سرک گئی۔ یہ تو کلاڈیوس تھا۔ وہ اسے اچھی طرح سے
جانتی تھی۔ وہ کلاڈیوس کو کیسے بھول سکتی تھی۔ بحر اسود میں
آنے والے طوفان کے بعد اسی نے سب سے پیسے بے
بوش تیرتے ہوئے کلاڈیوس کو دیکھا تھا۔ ان لوگوں نے

چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر اس لڑکے کو سینے سے لگائے۔ لیکن
ایک اجنبی نوجوان کو وہ سینے سے کیسے لگا سکتی تھی؟ اس نے
اپنے چہرے پر بے پناہ حیرت طاری کرتے ہوئے
نوجوان سے پھر پوچھا۔

”تم کون ہو؟ اور اس طرح کیوں کہڑے ہو؟“
”میں آپ کا کھویا ہوا بیٹا ہوں۔ آج سے برسوں
پہلے کسی نے مجھے آپ کی کوکھ سے جدا کر دیا تھا۔ میں آپ
کا خون ہوں۔ اچھی زلدین لو بار کا پہلا بیٹا۔“

صغریٰ کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ وہ سمجھ نہ پا رہی
تھی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ ایسا تو اس نے بھی
خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ اس کی زبان لٹک ہوئی اور
ہونٹ بے آواز تر کئے گئے۔ صغریٰ نے فی الفور چہرے پر آگے
بڑھ کر اپنے لخت جگر کو سینے سے لگنا چاہتی تھی لیکن اس نے
برسوں کی اجنبیت بچ میں دیوار بن کر حائل ہوئی۔ اس
نے اپنے بڑھتے قدم روک لیے۔ کلاڈیوس دو قدم مزید
آگے بڑھ آیا۔ اب وہ صغریٰ کے بالکل قریب تھا اور ہاتھ
بڑھا کر اپنی ماں کو چھو سکتا تھا۔ اب کلاڈیوس کا چہرہ صغریٰ
کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ اس کے چہرے میں اپنے
مرحوم شوہر کی ایک ایک نشانی صاف دیکھ رہی تھی۔
کلاڈیوس نے پھر کہا۔

”یکساں اس کی آنکھیں چمک چمک رہی تھیں۔ وہ آگے
بڑھ کر اپنے لخت جگر کو سینے سے لگنا چاہتی تھی لیکن اس نے
برسوں کی اجنبیت بچ میں دیوار بن کر حائل ہوئی۔ اس
نے اپنے بڑھتے قدم روک لیے۔ کلاڈیوس دو قدم مزید
آگے بڑھ آیا۔ اب وہ صغریٰ کے بالکل قریب تھا اور ہاتھ
بڑھا کر اپنی ماں کو چھو سکتا تھا۔ اب کلاڈیوس کا چہرہ صغریٰ
کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ اس کے چہرے میں اپنے
مرحوم شوہر کی ایک ایک نشانی صاف دیکھ رہی تھی۔
کلاڈیوس نے پھر کہا۔“

”ماں! کیا اپنے بڑے بیٹے کو اس کے حصے کا پیار
نہیں دو گی؟ میں تمہارا بیٹا ہوں ماں! نورین تمہاری بیٹی
نہیں تھی۔ تم تو جانتی ہو ماں! ماں جانتی ہو نا؟“
اب صغریٰ خود کو مزید نہ روک سکتی تھی۔ اس نے بے

کون سا احساس تھا جو اس کے قلب و جاں میں سرایت
کر رہا تھا۔ آج وہ اپنی حقیقی ماں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے
صغریٰ کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ اسے صغریٰ کی آنکھوں میں
اپنی آنکھیں نظر آئیں۔ کلاڈیوس کی رگوں میں اس کا لہو
ایک نئی طرز کی ٹھانسی مارنے لگا۔ وہ گھوڑے کو وہیں کھڑا
چھوڑ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا مٹی کا پیوڑا اچڑھنے لگا۔
صغریٰ کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ شیراز نے اپنی کہانی میں
کلاڈیوس کا حلیہ بتایا تھا۔ اس شخص کا بالکل وہی حلیہ تھا۔
صغریٰ نے سمجھا کہ آج موت اس کے سر پر آ چکی ہے۔ وہ
سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ یہ میں اس کا کوئی اور بیٹا بھی ہے۔
میں بائیس سال پرانی یادیں وہ بھلا بھگی تھیں۔

کلاڈیوس اپنی ماں کے سامنے آ کر۔ کیا۔ اس
کا سینہ جذبات سے لبریز تھا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں
سے بھر چکی تھیں۔ وہ بڑی بیتابانہ نظر سے اپنی ماں کا چہرہ
دیکھ رہا تھا۔ کلاڈیوس کو دل میں غرور ہونے لگا کہ جس عورت
نے اسے جنم دیا وہ مٹی عظیم ہے۔ کلاڈیوس کی آنکھوں میں
پکٹتے آنسو دیکھ کر ڈری ہوئی صغریٰ اپنے آپ میں اٹھتی
یہ کیا ماجرا ہے؟ اس نے سوچا۔ پڑکا کھنکھن نہیں ہو سکتا۔
اس کی آنکھوں میں صرف آنسو نہیں، میرے لیے بے
پناہ محبت کے جذبات بھی ہیں۔ دل کے کسی کونے میں
اسے ممتا بھری ایک مٹس جانتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ اپنے
جذبات کو نہ سمجھ سکتی لیکن اس کا خوف یک دم کانور ہو گیا۔
اس نے بڑے شوق سے لکھتے میں نوجوان سے پوچھا۔

”کون ہو تم بیٹا! اور کس سے ملنے آئے ہو؟“
کلاڈیوس تو جیسے تڑپ کر رہ گیا۔ صغریٰ نے اسے بیٹا
کہہ کر رکا رہا تھا۔ اس کی دونوں آنکھوں میں رے آنسوؤں
نپ نیچے گر گئے۔ وہ بھرائے ہوئے گھٹے کے ساتھ بولا۔
”آہ! ماں! میری ماں۔“

صغریٰ کچھ نہ سمجھ سکی۔ لیکن نہ جانے کیوں اسے کچھ
کچھ ہورہا تھا۔ کچھ ایسا جیسے وہ سمجھ نہ پا رہی تھی۔ اس کے
بدن کا ہر بریشہ جھلنے لگا تھا۔ اس لڑکے نے اسے ماں
کیوں کہا؟ بلا کسی وجہ کے صغریٰ کا دل بھر آیا۔ اس کا جی

کلاڈیوس کی جان بچائی اور صوفیہ نے بڑے پیار سے اس کی تیاری کی تھی۔ صوفیہ کلاڈیوس کو کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کلاڈیوس اس سے محبت کرتا ہے۔ یہی سوچ کر صوفیہ ڈر گئی کہ کہیں کلاڈیوس اسے حاصل کرنے کی غرض سے تو نہیں آیا۔ اسے کلاڈیوس کا دھوکا یاد تھا جب جزیرے پر محض صوفیہ کو حاصل کرنے کے لیے کلاڈیوس نے احسان فراموشی کی تھی۔ نہ جانے کیوں صوفیہ کا ہاتھ اپنے پیٹ پر جھکا۔ بالکل ایسے جیسے اپنے بچے کو وہ کلاڈیوس کے ہاتھ سے بچانا چاہتی ہو۔ لیکن کلاڈیوس خود کسی بچے کی طرح بلکہ رہا تھا۔ صوفیہ کچھ نہ سمجھ پائی کہ ایسے موقع پر وہ کیا کرے۔ کبھی اس کے دل میں آتا کہ اندر سے شمشیر اٹھا لے اور کلاڈیوس کا سر کاٹ دے۔ اور کبھی وہ سوچتی کہ وہ تو بڑے کلاڈیوس کو مارا۔ اور اس سے پوچھنے کہ کیا ہوا کلاڈیوس؟ تم کیوں رو رہے ہو؟ اسی اثناء میں کلاڈیوس کی نظر بھی صوفیہ پر پڑ گئی لیکن اس نے کسی حیرت کا اظہار نہ کیا جیسے وہ پہلے سے جانتا ہو کہ صوفیہ یہیں پر ملے گی۔ دونوں کی آنکھیں چارہویں تو فضا میں ایک عجیب سی سنسنی پھیل گئی۔ اسے صوفیہ نے بھی محسوس کیا اور حیرت سے دونوں کا منہ ٹپکنے لگی۔ صوفیہ نے زیر لب کلاڈیوس کا نام لیا۔

”کلاڈیوس!“

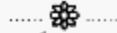
صوفیہ کی زبان سے اجنبی نوجوان کا نام سن کر صوفیہ گرتے گرتے چلی۔ تو یہ کلاڈیوس تھا جسے وہ اپنا بڑا بیٹا سمجھ کر اپنی برسوں کی پیاس بجھا رہی تھی۔ کلاڈیوس؟ کلاڈیوس تو مادام تھروشیا کا بیٹا تھا۔ صوفیہ کی معصوم بیٹی کا قاتل۔ اسی اثناء میں اسے صوفیہ کی آواز پھر سنائی دی۔

”کلاڈیوس! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تم یہاں کیوں آئے ہو۔ تم جانتے نہیں کہ شیراز تم سے کتنی نفرت کرتے ہیں۔ بلکہ ہم سب تم سے کتنی نفرت کرتے ہیں۔ کیا تم مرنے کے لیے یہاں آئے ہو؟ میں چاہوں تو ابھی تمہارا سر کاٹ کر چھین دوں لیکن میں اپنے پاک کھیتوں کو تمہارے گندے خون سے آلودہ نہیں کرنا چاہتی۔ تم

چلے جاؤ۔ میں کہتی ہوں تم ابھی اور اسی وقت چلے جاؤ۔“ لیکن کلاڈیوس اپنی جگہ سے نہ ہلا رہا تھا اس نے اپنا سر جھکا لیا اور پھر محسوس کے لیے جھکے میں کہنے لگا۔

”میں قتل ہونے کے لیے ہی آیا ہوں۔ میں اپنے گناہوں کی سزا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے میں اپنی درخواست کروں گا کہ میرے خون کو گندامت ہو۔ میرا خون گندائیں۔ کیونکہ میرے جسم میں میری اس عظیم ماں کا خون دوڑ رہا ہے جو تمہارے شوہر شیراز کی بھی ماں ہے۔ مجھے سب پتہ چل چکا ہے۔ وہ دبائے چھ کے کنارے ایک چرچ میں اچانک ایک بوڑھی راہبہ میرے اور میری پرورش کرنے والی ماں یعنی مادام تھروشیا کے سامنے آئی۔ آپ دونوں کو شیراز نے سب کچھ بتا دیا۔ کیا شیراز نے چرچ کے فرش پر بوڑھی راہبہ کی لاش نہیں دیکھی تھی؟ وہ روئیہ تھی۔ بوڑھی روئیہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ مادام تھروشیا اپنی ذلت برداشت نہ کر سکی اور اس نے اس بے گناہ راہبہ کو قتل کر دیا۔ تب سے میں نے عیسائیت کو چھوڑ دیا۔ میں اور میری بہن مینوں سے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ہم آپ کو لوگوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ میں اپنی حقیقی ماں سے ملنے کے لیے تپ رہا تھا جس کی کوٹھ سے میں نے جنم لیا تھا۔ چند روز میں روزفل جب ہم پاتھے اوڈیسا کے پاس آئے تو آپ لوگوں کے بارے میں پتہ چل گیا۔ لیکن پاتھے نہیں جانتے تھے کہ میں شیراز کے سامنے آؤں۔ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں شیراز مجھے قتل نہ کر دے لیکن میں تو قتل ہونا چاہتا تھا۔ اپنے گندہ کی سزا چاہتا ہوں۔ پاتھے اوڈیسا نے ہمیں اتنے دن روکے رکھا۔ آج انہوں نے شیراز کو اپنے گھر بلایا اور مجھے یہاں بھیج دیا۔ کیونکہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں مزید انتظار نہ کر سکتا تھا۔ آج میری ماں مجھے مل گئی۔ اب مجھے کوئی ڈر نہیں۔ صوفیہ! تم میرے بھائی کی بیوی ہو اور چھوٹے بھائی کی بیوی، بھول چکی ہوئی ہے۔ تم مجھے جو چاہو سزا دے دو۔ میں آف نہیں کروں گا کیونکہ میں اپنے گناہ کا یہی کفارہ چاہتا ہوں۔“

صوفیہ اور صوفیہ کا بکا کھڑی کلاڈیوس کی باتیں سن رہی تھیں۔



”وہ تمہارے بغیر نہیں جی سکتی۔ اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو تنہی واپس قریب پایا تمہیں یاد ہے؟“

”جیسے تم میں وہ کس قدر تمہارے نزدیک تھی۔ تم کیسے بھول سکتے ہو؟ تم بھی تو دل ہی دل میں اسے چاہتے تھے۔ کیونکہ تم نہیں چاہتے تھے؟ شیراز! تم بے شک شادی شدہ ہو لیکن کیا اس کو بے سہارا چھوڑ دیا جائے؟ تمہارے بغیر وہ اسلام قبول کر چکی ہے۔ اس کا بھائی بھی اسلام قبول کر چکا ہے شیراز! کلاڈیوس بالکل بدل گیا ہے۔ میں تمہیں ان دونوں کی پوری کہانی سنا چکا ہوں۔ کیا تم نے چرچ کے فرش پر بوڑھی راہبہ کی لاش نہیں دیکھی تھی؟ اسے مادام تھروشیا نے نہیں کیا تھا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ قہر دور تو ہر وقت روتی رہتی ہے۔ منہ سے تو کچھ نہیں کہتی۔ اس نے مجھے نہیں کہا کہ میں تم سے بات کروں۔ میں اپنے طور پر تم سے بات کر رہا ہوں۔ تم قہر دور کو سہارا دو۔ اسے تمہاری ضرورت ہے۔ وہ ایک لائق لڑکی ہے۔“

پاتھے اوڈیسا ایک گھٹنے سے مسلسل بول رہا تھا۔ اس نے شیراز کو اپنے گھر بلوایا تھا اور کلاڈیوس کی کہانی حرف بہ حرف شیراز کو کہہ سناتی تھی۔ شیراز کے دل پر ایک کے بعد ایک بجلی گرتی رہی۔ جب اسے پتہ چلا کہ کلاڈیوس اس کا حقیقی بھائی ہے جبکہ نورین مادام تھروشیا کی حقیقی بیٹی تھی تو شیراز کا بدن سن ہو گیا۔ کچھ دیر تک اسے کچھ بھائی نہ آیا تھا۔ اس کی ماں نے بھی اس راز سے پردہ نہ اٹھایا تھا۔ صوفیہ کی تو اسی روز سے چپ لگ گئی تھی جب اس کا پہلا بیٹا اس سے جنم لیا گیا تھا۔ درمیان کا سارا عرصہ وہ بہت کم بولی تھی۔ شیراز نے اپنی ماں کو زیادہ بات کرتے ہوئے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور پھر نورین کی موت کے بعد تو وہ اکثر غلاموں میں گھومتی رہتی۔ شیراز کو پاتھے اوڈیسا کی باتوں کا یقین آ گیا اور وہ قدرت کے اس کرشمے پر دنگ رہ گیا۔ قدرت نے اس کی بہن کو سوا نہیں کیا تھا بلکہ کلاڈیوس

کے ہاتھوں بے آبرو ہونے والی معصوم نورین مادام تھروشیا کی حقیقی بیٹی تھی۔

شیراز کو اچانک مادام تھروشیا کا آخری وقت یاد آ گیا۔ تب شیراز کے ذہن میں سے بہت سی گریں ٹھٹھنے لگیں۔ چرچ میں ہلاک ہونے والی راہبہ کے پاس جو خنجر بڑا اتحادہ ایک زنا نہ تھیا رہا تھا۔ یقیناً بوڑھی راہبہ نے مادام تھروشیا کا بھانڈا چھوڑ دیا ہوگا۔ شیراز پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ پاتھے اوڈیسا نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ آخر میں پاتھے اوڈیسا نے ایسی بات کہی جسے سن کر شیراز بے حد بے قرار ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہو گیا۔ پاتھے اوڈیسا نے کہا تھا۔

”آج میں نے تمہیں اپنے گھر اس لیے بلوایا تھا کہ کلاڈیوس کو تمہارے گھر بھیج سکوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم دونوں کا آمناسا مانا ہو۔ شیراز! وہ تمہارا حقیقی بھائی ہے۔ وہ بالکل بدل چکا ہے۔ تمہیں یقین نہ آئے تو تم قہر دور سے پوچھ لو۔“

شیراز کے دل میں خوف تھا کہ کہیں کلاڈیوس اس کی ماں یا بیوی کو قتل نہ پہنچا دے۔ لیکن پاتھے اوڈیسا سے بار بار سلی دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ شیراز کے اپنے دل میں بھی کلاڈیوس سے ملنے کی آرزو پیدا ہونے لگی۔ کلاڈیوس کے لیے شیراز کے جذبات کو نرم ہوتا دیکھ کر پاتھے اوڈیسا کو کسی ہوئی اور وہ مسکرائے لگا۔

”ہاں! اب ٹھیک ہے۔ اب تم مطمئن ہو۔ اب تم کلاڈیوس کا خون نہیں کرو گے۔“

اتنا کہہ کر پاتھے اوڈیسا اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر جاتے ہوئے کہنے لگا۔

”تم یہیں کو نہیں لائیں گے سب سے ہونہار طالبہ اور تمہاری دوست قہر دور کو یہاں بھیجتا ہوں تمہارے پاس!“

(ختم شد)

وہ اپنی کین کو اس کی سالگرہ کے موقع پر تحفہ دینا چاہتا تھا کوئی ایسی چیز جو ریز مرہ زندگی میں نہ خریدی جاتی ہو۔
جس اٹلیس سے پھر پوئیا ایک ایسی چیز خریدے ہوئے آپ اپنا ساس روک لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

جو واقعہ میں یہاں بیان کرنے جا رہی ہوں اس کے حیرت انگیز انجام کی اسے اس وقت خبر نہیں ہو سکی تھی جب تک یہ واقعہ اپنے انجام کو نہیں پہنچ گیا تھا۔ وہ دکان ایک چھوٹی سی گلی میں واقع تھی۔ شروع میں اسے اندازہ ہوا کہ اس دکان میں کوئی خاص بات ہے ایسی بات جو دوسری دکانوں میں نہیں لیکن وہ فوراً ہی اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔

پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایکس کے لیے ایک انسانی ڈھانچا خرید کر اسے سالگرہ کے تحفے کے طور پر پیش کرے۔ آج اس کی کزن ایکس میڈیکل کی طالبہ تھی اور اسے اس ڈھانچے کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ یہ ڈھانچا سالگرہ کا تحفہ بھی ہو سکتا تھا اور اس کے لیے کارآمد بھی ثابت ہو سکتا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسا انسانی ڈھانچا کہاں سے خرید سکتا ہے۔ سالے کے مضمون میں لکھا تھا کہ ایسی چیزوں کی مارکیٹ میں قلت بھی ہے اور خاص طور سے انسانی ڈھانچے جو میڈیکل کے طلبہ کے لیے بہت ضروری ہوتے ہیں انہیں حاصل کرنا طلبہ کے لیے بہت ضروری ہوتے ہیں انہیں حاصل کرنا طلبہ کے لیے بہت مشکل مرحلہ ہوتا ہے اور جو کھوپڑیاں یا ڈھانچے ملتے

اپنی اس تحقیقات کے نتیجے میں اسے جوائڈریس
ملے ان میں سے پہلی دکان پر وہ ایک صبح پہنچا یہ دکان
میریلین کے علاقے میں تھی۔

عجیب و غریب بناوٹ کی چیزیں رکھی تھیں۔ اس کے علاوہ پوری دکان میں ایک عجیب قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی اس ماحول میں اسے عجیب سی بے چینی کا احساس ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے ایکس کی خوشی کا خیال آتے ہی وہ مطمئن ہو گیا۔

اس نوجوان نے جو کاؤنٹر پر موجود تھا بڑے دھیمے انداز میں اس کی آمد کا مطلب پوچھا تھا۔
 ”میں..... میں چاہتا ہوں۔ میں ایک چیز خریدنا چاہتا ہوں۔“ اس نے اپنی گہرے اہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”در اصل میں وہ شے اپنے لیے نہیں خریدنا چاہتا تھا میرا مطلب سمجھ رہے ہو..... وہ چیز میں ایک دوست کے لیے لینا چاہتا ہوں..... اپنی کزن کے لیے..... دراصل میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ چیز مجھے کہاں مل سکتی ہے یا.....!“ وہ ہوکھلا ہٹ میں اپنا مدعا صحیح طور سے بیان نہیں کر پا رہا تھا اور اس کی متلاشی نظرس پوری دکان کا جائزہ لے رہی تھیں پھر اسے دکان کے ایک کونے میں ایک شوکیس میں وہ چیز رکھی نظر آ گئی جس کی اسے متلاشی تھی اسے دیکھتے ہی اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی اور چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی تھی پھر وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا تھا۔

”کیا آپ کو ایک ڈھانچا چاہیے جناب!“
 نو جوان نے حیرت زدہ آواز میں پوچھا اور اسے یوں
 لگا جیسے ایک اس کے اور اس نو جوان کے خیالات
 ایک ہی ڈگر پر چل نکلے ہوں۔

”یہ یقیناً آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔“ اس نوجوان نے کہا۔

”ہاں۔“ اس نے بھی اثبات میں سر ہلایا اسے
رسالے کے اس مضمون کا خیال آ گیا جس میں یہ

جس نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔
”کیا پلاسٹک کا بنا ہوا ڈھانچہ بھی نہیں ملے گا۔“
اس نے پُر امید انداز میں نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کے علم میں تھا کہ ٹیلنڈ میں کسی جگہ پلاسٹک کے انسانی اعضا اور ڈھانچے بنانے کی فیکٹری لگی ہوئی ہے۔ جہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مزدوری کرنے جاتے تھے۔ وہ ہر صبح سائیکلوں پر انہیں جاتے دیکھتا تھا۔
”یہ بھی بہت مشکل ہے جناب۔“ نوجوان نے معذرت طلب انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”اچھا کیا یہ ممکن ہے کہ اس شوکیس میں جو ڈل رکھا ہے وہ.....“ اس کی بات اذیتوری ہی تھی کہ نوجوان نے قدرے غصے میں اس کی طرف دیکھا۔
”میں معافی چاہتا ہوں جناب یہ ڈھانچا صرف نمائش کے لیے ہے یہ ہمارے پاس اس وقت سے ہے جب ہم نے اپنا یہ کاروبار شروع کیا تھا اور میں آپ کو صرف اتنا اور بتا سکتا ہوں کہ یہ ڈھانچا اس شخص کا ہے جس نے ہمارے اس کاروبار کی بنیاد رکھی تھی اور اس نے وصیت کی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے ڈھانچے کو یہاں شوکیس میں رکھا جائے میں اس کے علاوہ آپ کو اور کچھ نہیں بتا سکتا جناب اب آپ جانتے ہیں۔“ نوجوان نے کہا اور وہ سر جھکائے ہوئے دکان سے باہر آ گیا۔ اس نے مڑ کر کھڑکی سے دکان سے اندر دیکھا تھا وہ نوجوان حیرت سے اب بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ نوجوان اس شوکیس کی طرف مڑا تھا۔ جہاں ڈھانچا رکھا تھا اور جھک کر اس ڈھانچے کی تعظیم بجا رہا تھا اسے یہ منظر دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔
اس کے بعد وہ بہت سی دکانوں پر گیا لیکن اسے اپنے مقصد میں کہیں بھی کامیابی نہیں ہوئی اتنی دکانوں پر جانے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ صرف کھوپڑیاں بازو ڈنگلیں یا جسم کے دوسرے حصے الگ الگ تول سنسے تھے لیکن ایک مکمل ڈھانچا ملنا مشکل تھا وہ مزید کئی دکانوں پر مارا مارا پھرا پھر ایک ہول سیل ڈیلر نے اسے بڑی عجیب بات بتائی۔
”میں اس تجارت میں اس وقت سے ہوں جناب جب میں صرف چودہ سال کا تھا مجھے اس شعبے میں کام کرتے ساٹھ سال ہو گئے ہیں لیکن ایسی مثالیں صرف ایک زمانے میں دیکھنے میں آئیں اور اس زمانے کو ہم ٹریڈ ہیومن آرٹ کہتے ہیں۔“
”اس کا کیا مطلب ہے؟“ اس نے پوچھا اور رشوت کے طور پر ایک۔ گار اس ہول سیل ڈیلر کی طرف بڑھایا۔
”یہ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے پرانے وقتوں میں ہم نے ہیومن آرٹ کی تجارت میں بہت کمایا تھا۔ ہم لاوارث اشیاء کو تیزاب میں ڈال دیتے اور جب وہ گل کر سکر کر چھوٹے چھوٹے ڈھانچوں میں تبدیل ہو جاتیں تو انہیں شیشے کے چھوٹے مرتبانوں میں رکھ دیتے۔ یہ مرتبان ہم سستے داموں جام جینی بنانے والی فیکٹریوں سے حاصل کر لیتے تھے۔ ہمیں صرف ان شیشے کے مرتبانوں کے لیبل بدلنے پڑتے تھے۔ شاید تمہیں اس بارے میں کچھ علم نہ ہو یہ بہت پرانے وقتوں کی بات ہے۔“
”نہیں میں نہیں جانتا۔“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا وہ حیرت سے ہول سیل ڈیلر کو دیکھ رہا تھا۔
”جب تم نیچے اتر کر باہر جاؤ گے مجھے امید ہے کہ تم اس بارے میں ضرور سوچو گے پچھلے زمانے میں لوگ اپنی بہت سی چیزیں گروی رکھتے تھے اپنی

تعریفی الفاظ ایک ڈھانچے کے لیے استعمال کیے تھے پھر ایکس نے بھی ایک بار یہی الفاظ استعمال کیے تھے۔“
”آپ اسے اس انداز سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔“
اس نوجوان نے کہا اور شوکیس میں رکھے ہوئے اس انسانی ڈھانچے کی طرف بڑھا پھر اس نے چند تار جھوٹے تھے جو اس ڈھانچے سے گزر کر پیچھے کی طرف چلے گئے اور وہ انسانی ڈھانچا جو کچھ دیر پہلے بے حس و حرکت بڑا تھا۔ حرکت میں آ رہا تھا اور اب اس کا زاویہ بدل گیا اس ڈھانچے کا ایک ایک عضو حرکت کر رہا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ کچھ نفوس محسوس کر کے پیچھے ہٹا تھا دکان کا نوجوان خوش گوار لہجے میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔
”خوب صورت..... ہے نا خوب صورت کتنا متناسب اور متوازن ڈھانچا ہے۔ اس پر بہت محنت کی گئی ہے یہ بہت خوب صورت ہے۔“ وہ نوجوان انسانی ڈھانچے کی تعریف کر رہا تھا پھر اس سے پہلے کہ اس انسانی ڈھانچے کا قصہ ختم ہوتا وہ نوجوان اس کی طرف مڑ کر بولا۔
”میں معافی چاہتا ہوں جناب مجھے بہت افسوس ہے کہ ہمارے پاس اسٹاک بالکل ختم ہو گیا ہے۔“
اس نوجوان نے معذرت طلب لہجے میں کہا۔
”یعنی تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے۔“
”نہیں جناب۔“ دراصل ہماری سیلائی بہت محدود ہے۔ جب کہ پچھلے دنوں ان چیزوں کی ڈیمانڈ بہت رہی ہے۔“ نوجوان نے کہا۔
”تو پھر آپ نے سیلائی کی اس کی کوپورا کرنے کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا۔“ اس نے پوچھا۔
”یہ کام بہت مشکل ہے جناب ہمیں جتنے بھی

ڈھانچے یا میڈیکل کاسمان سیلائی کرنا ہوتا ہے اس سب کو ہم اس دکان میں اتنی ہی جگہ میں رکھ نہیں سکتے ہم یوں کرتے ہیں کہ چیزوں کا آرڈر بک کر لیتے ہیں اور مقرر تاریخ پر ان کی ڈلیوری کر دیتے ہیں ہمارے لیے یہ ذرا آسان ہوتا ہے کہ ہم کسی بھی چیز کے خواہش مندوں کے الگ الگ گروپ بنا دیتے ہیں اور ان کے مطلوبہ سٹاک مکمل کر کے انہیں بیک کر کے ڈلیور کر دیتے ہیں۔ اس طرح ہمیں سہولت ہوتی ہے۔“ نوجوان نے کہا اور اس نے سوچا کہ اس دکان کا اسٹاک روم جہاں سارا سامان رہتا ہوگا۔ کیوں نہیں آس پاس یا نیچے تہ خانے کی صورت میں موجود ہوگا۔
”تو کیا تمہارے پاس اس وقت کوئی.....!“
”نہیں جناب اس وقت کوئی ڈھانچا نہیں ہے۔“ اس نوجوان نے جواب دیا۔
”یوں سمجھ لیں کہ اب صحت مند لوگ زیادہ ہیں اور صحت کا محکمہ اچھی کارکردگی دکھا رہا ہے۔ چنانچہ لوگوں کی عمریں طویل ہوتی ہیں۔“ نوجوان نے ذہنی انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔
”ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں۔“ اس نے کہا۔
”اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس مریض کسی نامعلوم وارڈ پر مرنے سے زیادہ اپنے گھر کے بستر پر مرنا پسند کرتے ہیں پہلے ہم اسپتالوں سے رابطہ رکھتے تھے اور وہاں سے ہمیں چند لاوارث جسم مل جاتے تھے لیکن اب خود کشی کرنے والوں کی بھی تعداد کم ہو گئی ہے جو اکثر گم نام ہی مرتے تھے اب زیادہ تر لوگ اپنے رشتے داروں یا دوستوں کے درمیان مرتے ہیں جن کی تجویز و تحقیق ان کے رفقا کر دیتے ہیں۔“ نوجوان کی آواز میں ناگواری کا تاثر نمایاں تھا جیسے موجودہ نظام سے اسے اتفاق نہ ہو۔
”یہ سب باتیں تو زمانے کے ساتھ ساتھ جاتی

”پرانے سامان کی دکان؟“
”ہاں جناب پرانے سامان کی دکان یا کوئی ایسی دکان جہاں کچھ کپڑے بکتے ہو یعنی کسی کپڑے کی دکان ایسی دکانیں سڑک کے دوسری جانب ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ جب آپ جیسا کوئی شخص بازار میں آتا ہے جس کی کزن کو کسی انسانی ڈھانچے کی اتنی شدید ضرورت ہو تب وہ یہاں آ کر انکل سے ملتا ہے انکل کا نام اس کی دکان پر ہی لکھا ہے۔ انکل پرانی چیزوں کو اچھی قیمت پر بیچنے کا بہت تجربہ رکھتے ہیں لوگ اپنی پرانی چیزیں بھی انکل کو فروخت کر جاتے ہیں اور ان سے پرانی چیزیں خریدنے بھی یہاں آتے ہیں۔ اچھی ان کے پاس کوئی نئی چیز بھی مل جاتی ہے۔ چنانچہ ہمیں انکل کے پاس جانا چاہیے۔ وہ ایک چھوٹی سی دکان ہے اور ان کے پاس تو وہاں نہیں اس دکان کا پتہ بھی دے سکتا ہوں وہ دکان کافی عرصے سے قائم ہے اور خوب چلتی ہے اگر تم وہاں جا کر میرا نام لو گے تو وہ تمہاری بات بڑی توجہ سے سنے گا اور تمہارا کام بھی کرنے کی کوشش کرے گا۔“

یہ کہہ کر ڈیلر نے اسے پتہ دے دیا اور وہ ”جیمیر وین“ کی طرف چل دیا۔ ڈیلر نے دکان کا یہی نام بتا دیا تھا جب وہ وہاں پہنچا تو اس کی ملاقات انکل سے ہوئی جن کا نام پتہ تھا۔

دکان میں داخل ہو کر اس نے چیزیں دیکھنے کے لیے دکان کا چکر لگایا وہ اپنے اندر عجیب سی باتیں محسوس کر رہا تھا۔ انکس کی سالگرہ کا دن قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا اور اسے اپنی کامیابی کی بات تم امید نظر آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور بات اسے پریشان کر رہی تھی اور وہ یہ کہ اسے اچانک ہی خیال آیا تھا کہ وہ ترکیب جس سے اس کے خیال

یہ کام کرنے لگے پھر ان اسپتالوں میں مقابلہ شروع ہو گیا پھر ایسے لوگوں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی جو رقم مل جانے کی وجہ سے دھڑا دھڑا اسپتالوں میں جانے لگے وہ اسپتال جاتے تھے فارم بھرتے رقم لے کر آ جاتے تھے پھر اس شخص کو مزید رقم کی ضرورت ہوتی تو وہ کسی دوسرے اسپتال جا کر پھر فارم بھرتا اور رقم لے لیتا تھا اس کے بعد جب کوئی شخص مرتا تھا تو یہ اندازہ لگا: مشکل ہوتا تھا کہ دراصل اس کا حلق کس اسپتال کی ممبر شپ سے ہے چنانچہ جلدی یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا اور اب ہم اس حال کو پہنچ گئے کہ ضرورت کے وقت ہمیں ایک ڈھانچا بھی مشکل سے ملتا ہے۔“ اس نے ایک خضدی سانس لیتے ہوئے کہہ دیا۔ ”ویسے ایک بار پچھلے دنوں یہ ہوا پھر چل نکلی تھی کیونکہ پچھلے دنوں خود بخود کرنے کا فیشن سا ہو گیا تھا لیکن اب پھر یہ سلسلہ ختم ہو گیا ہے اب لوگوں کی دلچسپی اپنے گھروں اور رشتہ داروں میں زیادہ ہو گئی ہے اس کے علاوہ صحت کے اداروں کی کارکردگی بھی پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔“

اس گفتگو کے بعد وہ بہت بد دل سا ہو کر وہاں سے لوٹ آیا اور اس نے سوچا کہ ایسا خوش قسمت دن شاید ہی اس کی زندگی میں آئے جب وہ انکس کے لیے سالگرہ کا تحفہ خرید سکے۔ جب کہ سالگرہ کا دن قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔

ہول سیل ڈیلر نے اپنی ساری گفتگو میں ایک بات ایسی کہی تھی جس سے اسے کچھ امید بندھ گئی تھی۔ ”میرا مشورہ مانیں جناب تو اب آپ کسی بھی میڈیکل سپلائر کے پاس مت جائیں ہم سب ایک ہی قسمی کے سوز ہیں اب آپ کسی ایسی دکان پر جائیں جہاں پرانا سامان ملتا ہو وہاں آپ کی کامیابی کی کچھ امید ہو سکتی ہے۔“

گھر یاں اپنے اوپر کوٹ اپنے سونے کے لاکٹ جن میں ان کے رشتہ داروں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں صرف ایک چیز رہ جاتی تھی جسے گروی رکھ جاسکتا تھا اور وہ اپنا آپ تھا۔ ”اپنا آپ؟“ اس نے حیرت سے دہرایا۔

”جی ہاں اپنا آپ جناب اس کے لیے اس وقت کے لوگوں کو سینٹ ولیم ہسپتال میں جانا پڑتا اور صرف یہ کہنا پڑتا کہ میں جو بھی کچھ باقی بچا ہوا ہے وہ اسے خرید سکتے ہیں اس پر اس شخص کو ایک فارم دیا جاتا جس پر اس شخص کو دستخط کرنے پڑتے تھے اس کے بعد اس شخص کو پانچ پاؤنڈ کا نوٹ دیا جاتا اس کے بدلے میں انہیں اختیار ہوتا تھا کہ وہ لوگ اس شخص کے جسم کو میڈیکل تجربات کے لیے استعمال کر سکتے تھے اس کے علاوہ اگر وہ دوسرا فارم دستخط کرے جس میں یہ شرط لگائی جاتی تھی کہ نہ تو اس نے کبھی سیرٹ پیا ہو نہ ہی شراب اور آئندہ بھی ان چیزوں سے دور رہے گا تو پھر اس شخص کو پانچ پاؤنڈ اور دیے جاتے تھے۔ اس طرح دس پاؤنڈ لے کر وہ شخص چلا جاتا تھا اور اپنی ضروریات پوری کرتا تھا۔ پھر اگر خدا اس کا وقت بدل دے تو وہ رقم واپس کر کے اپنا نام اس اسپتال سے کنوا بھی سکتا تھا جیسے افراد ہوتے تھے ویسے ہی معاوضہ ہوتا تھا اگر غریب لوگ ہوں اور بیمار ہوں تو انہیں معاوضہ زیادہ دیا جاتا کیونکہ ان کا جسم جلد ملنے کے امکانات ہوتے تھے دوسری صورت میں رقم کم دی جاتی تھی کیونکہ صحت مند شخص کے جلد مرنے کے امکانات کم ہوتے تھے۔“

”پھر یہ سارا سلسلہ کیسے ختم ہوا؟“ اس نے پوچھا۔

”اس کام میں اتنا منافع تھا کہ بہت سے اسپتال

اندرا داخل ہو گیا۔

جیسے ہی وہ دکان میں داخل ہوا تھا ایک ٹوٹی پھوٹی گھنٹی کی آواز اندر گونگی پھر اندر دکان کے طلوعی اندھیرے میں سے ایک سایہ جس نے سیاہ رنگ کا اور کوٹ اور ہیٹ پہنا ہوا تھا سامنے آیا تھا اور اس نے بڑے انتہائی انداز میں اس کے سامنے اپنا مدعا بیان کیا نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کا جی چادر ہاتھ کا کہ کسی طرح جلد از جلد یہاں سے واپس چلا جائے وہ دوبارہ دروازے کی طرف مڑنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیونکہ اسے توقع تھی کہ یہاں بھی اسے انکار ہی سننے کے لیے ملے گا پھر اسے پیٹر کی باریک اور تیز آواز سنائی دی تھی۔

”اوہ کیوں نہیں جتا۔ میرا خیال ہے کہ میں آپ کی ضرورت پوری کر سکتا ہوں لیکن پہلے آپ کو مجھے چند معلومات دینا ہوں گی۔“ پیٹر نے کہا اور اسے یوں لگا جیسے اسے ساری دنیا کے خزانے مل گئے ہوں۔

پیٹر اپنی دکان کے کاؤنٹر پر اوندھا ہو کر اس کی طرف جھک گیا تھا اور وہ بھی جس کرسی پر بیٹھا تھا اس سے آگے کی طرف جھک گیا لیکن پیٹر کا چہرہ دیکھ کر اس کے رگ و پے میں خوف سرایت کر گیا تھا اس نے اتنا کر بہہ چہرہ اب تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی انسانی کھوپڑی ہو اس کے ہونٹ بہت پتلے اور بھٹے ہوئے تھے اور اس کے دانت نظر نہیں آ رہے تھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بالکل سیاہ ہوں اس کی جلد اس کے گالوں اور چہرے کی دوسری ہڈیوں پر اس طرح منڈھی ہوئی تھی کہ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کھال کا ایک تار بہت باریک غلاف چڑھا ہوا پھر پیٹر نے ایک پتلی سی انگی عجیب سے انداز میں اس کی طرف اٹھائی ہوئی تھی۔ پیٹر کی

خریدنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتا۔“

انگل کی بات اس کی بھی سمجھ میں آئی اور اس کے دل میں امید کی ایک کرن نمودار ہوئی پھر الیکس کے معاملے میں اسے معلوم تھا کہ زیادہ مہنگا انسانی ڈھانچا الیکس خریدنے کے قابل نہیں ہے۔ اس کے پاس اب تک صرف انسانی جسم کا ایک ہی حصہ دیکھنے میں آیا اسے پورے ڈھانچے کی شدید ضرورت تھی وہ خود بھی سے ڈھونڈ رہی تھی اس دکان سے نکل کر نہ جانے کتنی دکانوں کے چکر مار کر اسے کوئی پرانا استعمال شدہ ڈھانچا کم قیمت میں مل سکے گا اور اب جو حالات اسے معلوم ہوئے تھے ان کے پیش نظر تو اسے یہ کام ہوتا ممکن ہی نہیں نظر آ رہا تھا۔

وہ پیٹر کی دکان سے نکل کر پھر سڑکوں پر آ گیا اور بہت سے ملاقاتیوں میں پرانے سامان کی دکانوں پر گیا لیکن اس کا مقصد کہیں چل نہیں ہوا پھر وہ ایک دکان پر گیا جس کی مالک ایک عورت تھی۔ اور عورت نے اس کی بات سننے کے بعد اسے ایک پتلا لکھ کر دیا لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ پتلا اس کے ہاتھ سے لے کر بھاڑ دیا اور وہی پتلا سرگوشی میں اسے یوں سمجھایا جیسے کوئی راز کی بات بتا رہی ہو۔

وہ دکان ایک چھوٹی سی گلی میں تھی جس میں جگہ جگہ کوڑا پڑا تھا۔ پھر اسے دکان کا نام دیکھ کر بہت حیرت ہوئی تھی اس پر بھی پیٹر کا نام لکھا تھا۔

”ڈبلیو پیٹر جنرل ڈیلر۔“ اسے انگل پیٹر کی دکان پر جس ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا اس کے پیش نظر اس نے بڑے ڈرتے ہوئے اور احتیاط سے دکان میں قدم رکھا وہ جگہ الیکس کے کمرے سے بہت قریب بھی اور بہت ممکن تھا کہ یہاں بھی اس کی ڈبھیٹ ہو جائے جب اس نے دکان میں نظر مار کر اطمینان کر لیا کہ وہاں الیکس نہیں ہے تو

بے ترتیبی سے چھت تک ٹکا ہوا تھا اسے کہیں دور دور تک بھی کوئی انسانی ڈھانچا نظر نہیں آیا تھا پھر اس نے اپنی مطلوبہ چیز کے بارے میں دکان کے ڈیلر سے بات کی تھی۔

”نہیں جناب میں نے خود دو سال سے ایک بھی انسانی ڈھانچے کی شکل نہیں دیکھی ہے تمہیں اس ہول سیل ڈیلر نے ٹھک ہی پٹا ہوا تھا کہ تمہاری چیز تمہیں یہاں سے مل سکتی ہے لیکن اس کے لیے تمہیں تقریباً ہر روز یہاں آتے رہنا ہوگا تاکہ تازہ صورت حال کا تمہیں علم رہے ویسے فی الحال یہ ناممکن ہی نظر آتا ہے کہ کوئی انسانی ڈھانچا یہاں آئے میں تو اب تقریباً ناامید ہو چکا ہوں۔“

”اچھا میں ایک بات جاننا چاہتا ہوں آپ مجھے یہ بتائیں کہ ابھی جو طالبہ باہر گئی ہے اس کا کیا نام ہے دراصل میرا خیال ہے میں اسے جانتا ہوں۔“

”ارے جناب مجھے بھی اس بات پر حیرت ہے اور میں خود ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ بعض اوقات ہمیں پتا بھی نہیں چلتا اور دوسروں سے ہمارے کام کس قدر مطابقت پا جاتے ہیں دراصل وہ طالبہ بھی ابھی اسی سلسلے میں یہاں آئی تھی میں بھی اب انسانی ڈھانچے کی بڑھی ہوئی مانگ کے پیش نظر یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ کیوں نہ یہ منافع بخش کام پھر سے شروع کر دیا جائے اس سلسلے میں صرف مال میرے ہاتھ لگنے کی دیر ہے لیکن اس کے لیے زیادہ مال درکار ہوگا۔“

”کیوں؟“

”بھئی دیکھو اگر میرے ہاتھ ایک یا دو انسانی ڈھانچے لگ بھی جاتے ہیں تو میں انہیں چالیس یا پینتالیس لاکھوں کے درمیان کیسے فروخت کر سکتا ہوں پھر میرا ہر گاہک طالب علم ہے مجھے ڈھانچے

میں اس کی کزن کو خوشی نصیب ہو سکتی تھی اس کی کزن کی برہمی کا سبب بھی بن سکتی تھی۔ ممکن تھا کہ اس کی کزن کو اس کا یہ تحفہ پسند ہی نہ آتا۔

وہ اب تک کتنی دکانوں میں گیا تھا وہاں اس کوئی جانے پہچانے چہرے نظر آئے وہ چہرے تقریباً ہر دکان کے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے وہ ایک انچھٹی سی نظر ان پر ڈالتا ہوا دکان میں داخل ہوتا یا دکان سے نکلتا پھر اسے ایک بار ایک دکاندار سے یہ پتا چلتا تھا کہ وہ لوگ بھی اسی کی طرح کسی خاص چیز کی تلاش میں تھے۔ ان میں ایسے بھی نوجوان تھے جو میڈیکل کے طالب علم تھے اور وہ بھی انسانی ڈھانچوں کی تلاش میں تھے وہ میری طرح ہی ایک دکان سے دوسری دکان پر مارے مارے پھرتے پھرا چاک ہی اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ بہت ممکن ہے ان لوگوں کی طرح الیکس بھی اپنی ضرورت کی چیزیں ڈھونڈتی پھر رہی ہو اور ایسا ہونے کے بہت زیادہ امکانات بھی تھے اس خیال سے ہی اسے ہول آنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ الیکس کے امتحانات بہت نزدیک آ چکے ہیں اور ایسے میں الیکس کو اپنی پڑھائی کے لیے ایک انسانی ڈھانچے کی شدید ضرورت ہو سکتی تھی اسی وجہ سے اسے شروع ہی سے احساس تھا کہ اس کا دیا ہوا تحفہ اس کی کزن کے لیے کتنی اہمیت کا حامل ہوگا۔

جیبر وال کی دکان میں وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا جب وہ دکان میں داخل ہوا تو اس نے الیکس کو دکان سے باہر جاتے ہوئے دیکھا وہ اسے دیکھ کر چند لمحے کے لیے راستے میں کھڑا رہ گیا تھا اور پھر دکان کے اندر چلا گیا۔ دکان چھوٹی اور قدرے تاریک تھی جہاں مختلف النوع اشیاء بھی ہوئی تھیں اور ایک کمرے کی اس بدبودار دکان میں سارا سامان

”فحشک ہے یہ بھی منظور ہے۔“ اس نے کہا۔
 ”شکریہ جناب اب میرا خیال ہے آپ بھی اس
 سوے سے بالکل مطمئن ہیں آپ آج سے ایک
 ہفتے بعد اتوار کے روز صبح گیارہ بجے اپنا کس لے جا

ہوئے تھے۔ شاید اس ڈھانچے کا چہرہ نہیں تھا یا اس نے ادھر دیکھا نہیں تھا کیونکہ ایک ڈھانچے کا چہرہ بہر حال خوب صورت نہیں ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی باقی پورا ڈھانچا بہترین تھا۔

”کیا آپ اس ڈھانچے کو قریب سے دیکھنا پسند کریں گے؟“ پیٹر نے اس سے پوچھا۔ ”یہ آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا وہ اپنی نا تجربہ کار رائے میں یہی اندازہ لگا رہا تھا اسے اتنی مہارت سے محفوظ کیا گیا تھا پھر اس کی اجازت سے پیٹر نے بکس پر ہاتھ رکھا اور اسے سفید چمک دار فیتے سے باندھنے لگا تھا خود اس نے معاوضہ ادا کرنے کے لیے اپنی جیب سے نکال کر نوٹ گنتا شروع کر دیے تھے جو وہ یہاں آتے ہوئے اپنے بینک سے لیتا آیا تھا پھر اس نے پیٹر کو معاوضہ ادا کر دیا تھا اور اس نے جب اسے باقی رقم واپس کی تھی تو وہ خوشی سے ملے جلے جذبات لیے اس کی طرف مڑا تھا۔

”اس کی کوئی ضرورت نہیں یہ تم رکھو مسٹر پیٹر۔“ اس نے خوش دلی سے کہا۔

”تم نے محنت کی ہے اور یہ تمہارا اھٹھتا ہے۔“ اس نے کہا۔ بکس میں رکھا ہوا انسانی ڈھانچا اسے پہلے کے مقابلے میں زیادہ چھوٹا محسوس ہو رہا تھا اور وہ بہت ہلکا بھی تھا یہ بات پیٹر نے پہلے ہی بتادی تھی وہ اسے بڑی آسانی سے اٹھا کر باہر کھڑی ٹیکسی تک لے جاسکتا تھا۔

”جناب میں نے اس پر نشانی کے طور پر ”ایچ“ لکھ دیا ہے۔“ پیٹر نے اس کے لیے دکان کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”ایچ“ کا یہ نشان میں نے پنسل سے بکس کے کھوپڑی والے حصے پر لکھا ہے چنانچہ آپ اسے

اٹھاتے وقت اس کا نشان اوپر ہی کی طرف رکھیے گا اس طرح آپ اسے حفاظت سے گھر تک لے جاسکیں گے۔“

پیٹر کی یہ بات چھوٹی سی تھی لیکن اس میں دو تہانہ انداز تھا کم از کم اس نے تو یہی محسوس کیا تھا پھر جب پیٹر نے آخری بار اسے رخصت کرنے والے انداز میں ہاتھ بلایا تھا تو اس نے بھی مسکرا کر اس کا جواب دیا تھا۔

وہ تختہ لے کر سیدھا الیکس کے گھر پہنچا اور گھر کا دروازہ الیکس کی اس دوست نے کھولا تھا جو اس کے ساتھ وہاں رہتی تھی۔ وہ ایک سیدھی سادی خوب صورت سی لڑکی تھی اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اسے ہمیشہ مریم کہہ کر پکارا کرے وہ اپنا بکس لیے ہوئے گھر میں داخل ہو گیا تھا اس نے اس کا سر والا حصہ اوپر ہی رکھا تھا۔ وہ مریم کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا اور اس بات سے اب تک بے خبر تھا کہ لڑکی کے چہرے پر پریشانی کتنا عار تھی۔

”الیکس تو گھر پر نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور وہ اپنی ساری خوشی سے ہاتھ دھو بیٹھا اسے اب یہ احساس ہوا تھا کہ اس نے اپنی خوشی میں یہ بات بھلا ہی دی تھی کتنے سے پہلے فون کر کے یہ معلوم کر لیتا کہ اس کا تختہ وصول کرنے کے لیے اس کی کزن گھر پر موجود ہوگی پھر اس نے سوچا تھا کہ وہ واپس چلا جائے اور کچھ دیر بعد آئے یا پھر وہ لڑکی سے پوچھ لے کہ وہ وہاں کچھ دیر تک الیکس کا انتظار کر سکتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ جو تختہ لایا ہے وہ خود الیکس کو دے نہ کہ وہ لڑکی کو دے جائے اور لڑکی اسے الیکس کو دے پھر وہ لڑکی کی طرف مڑا ہی تھا کہ اس سے کچھ کہے کہ وہ خود ہی بول پڑی۔

”میں بہت زیادہ پریشان ہوں آپ جانتے ہیں

کہ میں اور الیکس ساتھ ہی رہتے ہیں لیکن پھر بھی میں الیکس کی تمام مصروفیات کے بارے میں پوری طرح نہیں جانتی وہ بہت عرصے سے گھر سے غائب ہے اور مجھ سے کچھ کہہ کر بھی نہیں گئی ہے۔“ مریم نے کہا وہ اس کے ساتھ کارڈ بورڈ سے گزر کر اسے کمرے تک لائی تھی۔

”کافی عرصے سے۔“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں تقریباً ایک ہفتے سے اور وہ مجھ سے ایک لفظ بھی کہہ کر نہیں گئی۔“ مریم نے بتایا اور اس نے حیرت سے اس بکس کی طرف دیکھا جسے وہ ساتھ لایا تھا وہ بھی اسے ایک ہفتہ بعد ہی ملا تھا۔ یوں اس بکس کے ملنے کی مدت اور الیکس کے کھونے کی مدت یکساں تھی وہ ہستہ ہستہ اس بکس کی طرف بڑھا تھا جسے اس نے پہلے ہی بچہ رکھا تھا۔

”اس کی سالگرہ آج ایک ہفتہ ہے۔“ اس نے کہا اور مریم مسکرائے گی۔

”اوہ بالکل..... کیوں نہیں دراصل میں تو الیکس کی سالگرہ کی تاریخ ہی بھول گئی تھی مجھے یقین ہے کہ الیکس اپنی سالگرہ کے دن تو ضرور گھر واپس آئے گی کیا آپ اسے یہاں چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں۔“ مریم نے پوچھا۔

”ہاں میں اسے چھوڑ جاؤں گا۔“ اس نے کہا اور واپسی کے لیے مڑا اب اس کے انداز میں کوئی غلٹ نہیں تھی بلکہ اب غلٹ کی جگہ اداسی نے لے لی تھی۔ اسے پچھلی راستہ چھوٹی وہ کہانیاں یاد آگئی تھیں جنہیں پڑھ کر وہ ہنستا رہا تھا اس موجودہ دنیا میں جو روشنیوں کی دنیا بھلائی تھی اب بھی شاید سو ڈھ سو سال پرانی کہانی دہرائی جانی تھی اس نے الیکس کو پیٹر ہی کی ایک دکان میں ایک ہفتہ پہلے دیکھا تھا اور تب سے

وہ غائب تھی اسے ڈر تھا کہ اس نے جو اندازہ لگایا ہے وہ درست ہے وہ واپس جاتے ہوئے ایک لمحے کو دروازے پر رکھا تھا اسے یقین تھا جو وہ واقعہ الیکس کے ساتھ ہوا ہے وہ کچھسے زمانے میں ہونے والے ڈھانچوں کے کاروبار ہی کی ایک کڑی ہے وہ سوچ رہا تھا کہ اوہنری نے اپنی کہانی میں یہ بات کتنی صحیح کہی تھی کہ بعض اوقات ہم بڑی لگن سے کچھ تھنے کچھ لوگوں دینے کے لیے جمع کرتے ہیں لیکن جب ان شخصوں کے دینے کا وقت آتا ہے تو وہ اپنے وصول کرنے والے کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

”اگر آپ کو الیکس کہیں ملے تو اس سے کہیے گا کہ وہ کم از کم مجھے یہ تو بتا دے کہ وہ کب گھر واپس آئے گی۔“ مریم نے تقریباً چیختے ہوئے کہا وہ روہاسی ہو رہی تھی۔

وہ آہستہ سے مڑا تھا اور بکس کے قریب چلا گیا تھا۔ پھر اس لمحے وہ بکس سے ہٹ کر کھڑا ہوا مریم کے قدموں میں جا گرا تھا اور وہ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تھا۔

”الیکس۔“ اس نے آہستہ سے کہا تھا۔ ”وہ گھر آ چکی ہے۔“ اس نے اتنے مدھم لیجے میں کہا تھا کہ اس کی آواز مریم بھی نہیں سن سکی تھی۔ پھر وہ تیزی سے مڑا تھا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا الیکس کے گھر سے نکل گیا تھا۔ جہاں اب الیکس ایک انسانی ڈھانچے کی صورت میں موجود تھی ایک انسانی ڈھانچا جو وہ الیکس کو تھنے میں دینا چاہتا تھا لیکن قسمت نے اس کی چہیتی کزن الیکس ہی کو ایک ڈھانچے میں تبدیل کر دیا تھا۔



حالت حالت بعثت جمیل

وہ ایک ٹارگٹ کلر تھا۔ پیسے لے کر قتل کرنا اس کا پیشہ اور شوق تھا ایک روز اس کے دونوں بھائی اسے یہی ٹارگٹ بتانے کی سہاری نہ دی۔

ایک پرانی مبین موجود حالات کی عکاسی کرتی ہندی کہانی کا ترجمہ

چاہے وہ جس طرح بھی کمائے جائیں اور دوسرا شوق تھا فوٹو گرافی کا۔ ماسٹر دیوار کے سہارے کھڑا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا کہ تب ہی شانتی لال نے پیچھے سے آکر اس کے کندھے کو تھپتھپایا اور کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گیا۔ ماسٹر بھی چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے ریسٹوران کے دروازے کی جانب چل پڑا۔

ریسٹوران کے ہال روم میں آکر وہ دونوں کونے میں پڑی ہوئی ایک خالی میز پر آئے سانسے میٹھ گئے۔ شانتی لال نے ویٹر کو اشارے سے چائے کا آرڈر دے دیا پھر جب تک چائے نہیں آگئی اس وقت تک دونوں ابھرا دھڑکی رہی باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ویٹر چائے کی ٹرے رکھ کر چلا گیا۔ ماسٹر نے دونوں پیالیوں میں چائے انڈلی اور پھر ایک پیالی دھیرے سے شانتی لال کی جانب بڑھا دی۔ شانتی لال ذرا دیر تک چائے کی پیالی میں سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھتا رہا پھر پیالی ہونٹوں سے لگا کر ایک ہلکی سی چٹکنی لی اور بے حد دھیمے لہجے میں بولا۔

”اس بار تمہیں شہر سے باہر جانا نہیں پڑے گا ماسٹر!“

ماسٹر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن وہ شانتی لال کے چہرے کو ہی تک رہا تھا۔ شانتی لال نے شاید اس کی آنکھوں کا سوال پڑھ لیا تھا۔ اس لیے وہ پھر دھیمی آواز میں بولا۔

ماسٹر ہر نام سنگھ کو ایک اور نیا کام مل گیا تھا لیکن کام کی نوعیت پہلے سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی اسے شملہ ریسٹوران میں شانتی لال نامی شخص سے ملنا تھا۔ اسی ریسٹوران کے ایک کونے والی میز پر بیٹھ کر اکثر وہ دونوں دھندے کی بات کرتے تھے۔

ہر نام سنگھ کا پورا نام تو کرتا رہا ماسٹر ہی تھا لیکن شانتی لال اسے ہمیشہ ماسٹر کہہ کر ہی بلاتا تھا اس کے علاوہ سنڈکیٹ کے دوسرے اہم ممبران بھی ہر نام سنگھ کو ماسٹر کے نام سے ہی جانتے تھے۔ سنڈکیٹ نے کئی اہم معاملات میں ماسٹر کی خدمات حاصل کی تھیں اور ماسٹر نے سنڈکیٹ کی طرف سے ہر نام سنگھ کو معاوضہ بھی اچھا دیتا تھا۔ شانتی لال اس سنڈکیٹ کا ایک اہم رکن تھا۔ شانتی لال کے ذریعے ماسٹر کو احکامات دیئے جاتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ کام پورا ہونے کے بعد ماسٹر کو معاوضے کی ادائیگی بھی شانتی لال ہی کیا کرتا تھا۔

ماسٹر مقررہ وقت پر شملہ ریسٹوران کے باہر پہنچ گیا تھا اور اس وقت وہ باہری ایک دیوار کے سہارے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کا فلیش گن کیمرہ حسب معمول اس کے کندھے سے لٹکا ہوا تھا۔ یہی کیمرہ اس کا ٹریڈ مارک تھا کیونکہ ماسٹر کو زندگی میں دو ہی شوق تھے جس میں پہلا شوق تو تھا پیسے کمانے کا

سے ایک چھوٹی سی فٹنل نکالی اور میز پر رکھے ہوئے ایٹش ٹرے کے نیچے دبا ہوا ٹشو پیپر کھینچ کر اس پر کچھ لکھا اور پھر ٹشو پیپر کو ماسٹر کی جانب کھسکا دیا۔ ماسٹر نے اس پر لکھا ہوا نام اور پتا دھیان سے پڑھ لیا اور اسے دھیرے دھیرے مندر بانی یاد کرنے لگا۔ ذرا دیر بعد اس نے اس ٹشو پیپر کو اپنی منگنی میں مسل دیا۔ اپنی انگلیوں سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد اس نے اسے اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لیا اور پھر شانتی لال کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی اور ہونٹوں پر بڑی گہری مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ شانتی لال نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر بولا۔

”اس میں شنتی کی کیا بات ہے؟“

”اس لیے کہ یہ شخص میرے بھوکانے سے صرف سوڑے فاسٹے پب۔ آپ اتنے میز پر بیٹھ ہی جاتی کچھ سنتے ہیں۔ نا ماسٹر!“

”تب تو تم اس اچھی طرح سے جانتے ہو گے؟“ شانتی لال نے پوچھا۔

”نہیں!“ ماسٹر نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں سب ٹھیک کر لوں گا۔“

دونوں اپنی اپنی چائے ختم کر چکے تھے۔ ویٹر بل لے کر آیا تو شانتی لال نے چائے کا بل ادا کیا ویٹر بل لے کر چلا گیا تو شانتی لال نے کہا۔

”ٹھیک ہے مگر تم مجھ سے ملتے رہنا۔“

”ضرور!“ ماسٹر نے کہا۔ ”اسی جگہ۔“

اس کے بعد دونوں اپنی اپنی کرسیوں پر سے اٹھ کر چل پڑے۔ ریسٹوران کے باہر نکل کر شانتی لال نے جب ہاتھ ملانے کے لیے اپنا ہاتھ ماسٹر کی طرف بڑھایا تو اس کی انگلیوں میں دبا ہوا ایک لفافہ ماسٹر کی

”ہاں ماسٹر! اس بار یہاں کا ہی کام ہے اور سہیل قسم ہو جائے گا۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔“ ماسٹر نے دھیرے سے کہا۔

”لیکن اس کام میں کافی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔“ شانتی لال نے اسی دھیمی آواز میں کہا اور پھر چائے کا ایک گھونٹ بھرنے کے بعد آگے بولا۔

”لیکن معاوضہ ٹھیک ٹھاک ملے گا۔“

ماسٹر اس کے چہرے کی طرف تکتا رہا لیکن اسے شانتی لال کے چہرے پر مذاق جیسے کوئی تاثرات نظر نہیں آئے تو اسے لگا کہ یہ کام سچ سچ ہی بہت گہرے سمجھتا ہے پھر پھر بھی اس نے پوچھ ہی لیا۔

”تو اپنے پاس جائیں گے۔“

”نہیں!“ شانتی لال نے جواب دیا۔

”اگر آپ ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔“ ماسٹر نے کہا۔

”کیا آدمی رقم مجھے ایڈوانس مل سکتی ہے؟“

”کیوں! آدمی رقم کیوں؟“ شانتی لال نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کچھ ضرورت ہے۔ آج کل اسٹوڈیو میں کام زیادہ نہیں آ رہا ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا اس کا خیال تھا کہ یہ بات شاید شانتی لال کو منظور نہیں ہوگی اور وہ آدمی رقم ایڈوانس میں دینے سے انکار کر دے گا لیکن اس کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔

”ٹھیک ہے!“ شانتی لال نے اپنی خالی پیالی میں اور چائے انڈلیتے ہوئے کہا۔ ”اس کام کے لیے ہمیں بہت جلدی نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ تمہاری طرف سے تاخیر ہوئی رہے۔“

”نہیں! ایسا نہیں ہوگا۔“ ماسٹر نے چائے کا آخری گھونٹ بھر کر کہا۔ ”مگر وہ ہے کون؟“

جواب میں شانتی لال نے اپنے کوٹ کی جیب

منہمی میں چلا گیا لیکن ماسٹر کو کچھ کہنے یا پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ ایڈوانس کی رقم ہی ہوگی۔

”ہزار ہزار کے پانچ نوٹ ہیں۔“ شائق لال نے دھیرے سے کہہ کر اس کے اندازے کی تصدیق کر دی۔ ”اچھا اب میں چلتا ہوں۔“

”بہت بہت شکریہ!“ ماسٹر نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دیا اور آگے بولا۔ ”سند کیٹ کے سب لوگوں کو میرا سلام کہیے گا۔“

”ضرور... ضرور...“ کہہ کر شائق لال تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

ماسٹر ہر نام سنگھ اسی وقت شائق لال کے بتائے ہوئے پتے کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس جگہ کو ڈھونڈنے میں اسے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ یہ شہر کی ایک بارہا کیہ مارکیٹ تھی اور ماسٹر ہر نام سنگھ اس مارکیٹ میں دوایک بار پہلے بھی آچکا تھا۔

مارکیٹ کی پہلی سڑک کی دونوں جانب ہارڈویئر کی چھوٹی بڑی دکانیں تھیں۔ لوگوں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ ماسٹر ادھر ادھر دیکھتا ہوا فٹ پاتھ پر سے گزر رہا تھا تو اچانک ایک جگہ اس کی نگاہیں چپک کر رہ گئیں۔ یہ ایک ہارڈویئر کی چھوٹی سی دکان تھی۔ جس کے دروازوں پر گلہ بازی، پیٹیلے، تھوڑے چاقو،

چھری اور کنار جیسی لوہے کی بنی ہوئی دوسری چیزیں لٹک رہی تھیں اور فرش پر ہتھی ہوئی ایک گڈی پر ایک قدرے موٹا سا آدنی بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بول تھا، ہونٹوں پر گہری منہمی سوچیں تھیں لیکن سر پر بال نہیں تھے۔

سرسری نگاہ سے اس دکان اور دکان دار کا جائزہ لینے کے بعد ماسٹر نے فوراً ہی وہاں سے اپنی نگاہیں ہٹائیں اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ فٹ پاتھ پر چلتے چلتے

وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا ہارڈویئر مارکیٹ لوہے کی بنی ہوئی چیزوں کی دکان اور اس دکان کا مالک کتنی موچھوں والا ایک ایرانی بالکل ٹھیک... یہی وہ شخص ہے جس آج کے لیے احتیاجی کافی ہے۔ آج کے لیے اس قدر معلومات ہی بہت ہے پتا بھی مل گیا اور مطلوب شخص کا چہرہ بھی دیکھ لیا ہے اب اگلا قدم ایک دو دن میں سوچ سمجھ کر اٹھایا جائے گا کیونکہ اگر جلد بازی میں کوئی غلط کام ہو گیا تو اسے شک ہو جائے گا اور وہ چونکا ہو جائے گا ویسے بھی شائق لال نے اسے پہلے ہی بتا دیا ہے کہ سند کیٹ کو کوئی جلدی نہیں ہے اور اس کام میں احتیاج کرنے کی بدایت بھی اسے دی گئی ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ بہت سوچ سمجھ کر ہی اسے قدم اٹھانا چاہیے اس نے تو اس سے پہلے اچھے اچھوں کو ٹھکانے لگا دیا ہے ان کے مقابلے میں بھلا اسے کمال منول ایرانی کی بساط ہی کیا ہے؟

یہ ساری باتیں سوچ کر وہ بہت خوش تھا اور اس خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے وہ کھومتے کھومتے سمندر کے کنارے جا نکلا وہاں اس نے اپنے کمرے سے کئی خوب صورت مناظر کی تصویریں اتاریں اور کنارے پر کھینچے ہوئے بچوں کے بھی چند فوٹو کھینچے ایک سی فوڈ ریستورنٹ میں جا کر اس نے دوپہر کا کھانا کھایا پھر چائے کے ساتھ اس نے دو تین سگریٹ بھی پھونک ڈالے۔

تین چار گھنٹے کی اس تفریح کے بعد اسے کچھ تھکن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے اپنا کمرہ کندھے پر لٹکایا اور گھر کی جانب چل پڑا۔

لیکن جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اچانک اس کا ہاتھ ٹھٹک گیا اور تین چار گھنٹے پہلے سے وہ جس خوش فہمی کے جھولے میں بیٹھا ہے فکری اور اطمینان کے جھولے جھول رہا تھا اس جھولے کی رسی اچانک ہی

ٹوٹ گئی تھی اور وہ خود دھڑام سے فرش پر آ گرا تھا پہلے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا لیکن جب دوسری بار اس نے دھیان سے دیکھا تو اسے یقین کرنا ہی پڑا کہ اس کا شکار وہ گول منول ایرانی کچھ دور ایک گاڑی کی اوٹ میں کھڑا اس کی طرف تاک رہا ہے۔ اس نے تڑپھی نظر کر کے دو ایک بار پھر اس طرف دیکھا اب شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی کیونکہ وہ موٹا ایرانی اس کی جانب نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔

ایرانی اس کی غمراہی کیوں کر رہا تھا یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن باہر کھڑے کھڑے اس کی وجہ تلاش کرنا کچھ مناسب نہیں تھا اس لیے اس نے جلدی سے تالا کھولا اور گھر کے اندر داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر لیا، اندر آ کر دروازہ بند کرنے تک اس نے اپنی گھبراہٹ کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا حالانکہ دو ایرانی کو اپنی غمراہی کرتے دیکھ کر ہی گھبرا گیا تھا مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایرانی کو یہ شک ہو جائے کہ اس نے اسے دیکھ لیا ہے اور اس سے ڈر کر جلدی سے گھر کے اندر گھس گیا ہے۔

اسنے کمرے میں آ کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی چھوٹی چھوٹی ہوندیں چپک رہی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ ایسا ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ کیا سچ ہی ایرانی کو یہ معلوم ہو گیا کہ وہ اس کا خون کرنا چاہتا ہے؟ مگر کیسے ایرانی کو اس پر کیسے شک ہوا؟ وہ تو ایک بار بھی ایرانی سے ملا نہیں ہے اور نہ ہی ایرانی نے پہلے کبھی اس کی شکل دیکھی ہے پھر وہ اس کے گھر تک کیسے پہنچ گیا؟

طرح طرح کے سوالات تھے جو اس کے ذہن میں اٹھ رہے تھے مگر وہ مضبوط قوت ارادی کا مالک تھا اسے اپنے اعصاب پر قابو پانا آتا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اس نے فوراً ہی ذہن میں اٹھتے ہوئے سوالات کو

دبا دیا۔ دن و نسل رہا تھا اور شام کا اندھیرا پھیلنے والا تھا وہ اپنی جگہ سے اٹھ وہ تھوڑی دیر تک دکان کھول کر بیٹھنا چاہتا تھا اور اپنے کمرے کے اندر سے ایک پیوز فلم کے رول کو نکال کر ڈارک روم میں ڈھونڈا بھی تھا۔ اس کا فوٹو اسٹوڈیو گھر کے باہر کھلنے والے دروازے کے ساتھ ہی تھا۔ ویسے دکان کے پچھلے حصے میں بھی ایک چھوٹا سا کمزری کا دروازہ تھا جس کے ذریعے گھر کے اندر آ جایا جاسکتا تھا۔

دکان کے اندر آ کر اس نے نیوٹ بکس کے مین ایک ایک کر کے دباے تو اسٹوڈیو تیز روشنی میں نہا گیا اور دیواروں پر لگے ہوئے تصویروں کے فریم جگمگانے لگے۔ ماسٹر فوٹو اسٹوڈیو کا سائن بورڈ بھی رنگین روشنی سے چمکنے لگا۔ باہر سڑک پر شام کا اندھیرا اب کچھ گہرا ہو گیا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے تک وہ دکان میں بیٹھا تیار شدہ تصویروں کی کٹ چھانٹ کر کے انہیں گاہکوں کو دینے کے لیے لفافوں میں رکھتا رہا۔ اس وقت تک صرف دو ہی گاہک آئے تھے جو اپنی ڈیولپ کی ہوئی تصاویر لے گئے تھے پھر تقریباً ساڑھے نو بجے اس نے دکان بند کر دی اور گھر کے اندر اپنے کمرے میں آ گیا اور کپڑے تبدیل کرنے لگا۔

اس رات وہ دیر تک بستر پر پڑا جاگتا رہا۔ اسے کسی طرح بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ مونے گول منول ایرانی کا چہرہ بار بار اس کی آنکھوں کے آگے گھومتا رہا تھا اور وہ مسلسل یہ ہی سوچے جا رہا تھا کہ یہ ایرانی اس کی تلاش میں ہے اور وہ ایرانی کی تلاش میں ہے..... آخر اس کا مطلب کیا ہے؟ مطلب تو صاف ہے کہ ایرانی اسے قتل کرنا چاہتا ہے اور وہ ایرانی کا خون کرنا چاہتا تھا۔ سوچتے سوچتے اچانک ہی اسے یاد آ گیا کہ چھ سات ماہ پہلے اس نے شائق لال کے منہ سے

جانب سرکتا ہوا دکھائی دیا۔ خنجر ایرانی کے مضبوط ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور ایرانی دبے پاؤں ڈارک روم کے اندر داخل ہو رہا تھا۔

وہ جیسے ہی اندر آیا ویسے ہی ہر نام سنگھ نے بڑی پھرتی سے ایک لات مار کر ڈارک روم کا دروازہ بند کر دیا۔ جس کی وجہ سے ڈارک روم کے اندر اندھیرا چھا گیا۔ صرف زبرد پاور کا لال بلب ہی جل رہا تھا۔ ماسٹر ہر نام سنگھ کی آنکھیں تو اس اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں۔ اس لیے اسے تو سب صاف نظر آ رہا تھا لیکن ایرانی تو ایک دم ہی بوکھلا کر رہ گیا۔ اسٹوڈیو کی بجگلی روکنی سے کس کر وہ اپنا تک ہی اندھیرے میں آ گیا تھا۔

ایرانی نے جیسے ہی اپنے پیچھے ڈارک روم کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تو تیزی سے پلٹ کر ایرانی کی جانب لپکا اور ساتھ ہی اس نے پوری طاقت سے اپنا چمک دار گھبراہٹوروازے کی جانب اٹھا دیا۔ ماسٹر ہر نام سنگھ اندھیرے میں بھی صاف دیکھ رہا تھا۔ ایرانی کا خنجر لکڑی کے دروازے میں پیوست ہوا تو ٹھیک اسی وقت ماسٹر ہر نام سنگھ نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی اور اسے پوری طاقت سے سروڑ کر مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ایرانی شدید تکلیف سے گھبرا گیا لیکن اب وہ کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

ماسٹر ہر نام سنگھ نے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی اور اب دوسرے ہاتھ سے اس نے دروازے میں گھسا ہوا ایرانی کا خنجر بھی کھینچ نکالا تھا۔ ایرانی اب پوری طرح سے اس کے قابو میں آ چکا تھا۔

”اب ڈارک روازہ کھول دو میرے دوست! مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“ ماسٹر ہر نام سنگھ نے اونچی آواز میں کہا۔ اتنا کہہ کر اس نے زور سے اس

میں قلم لوڈ کر کے آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر کیمرہ لے کر ڈارک روم میں چلا گیا۔ ماسٹر ہر نام سنگھ نے اندر جاتے وقت جان بوجھ کر ڈارک روم کا دروازہ تھوڑا کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اندر آ کر اس نے سرخ روشنی والا زبرد پاور کا بلب جلا کر میز اوپر لکڑی کے ریک وغیرہ پر رکھی ہوئی چیزوں کو بلاوجہ ہی ادھر ادھر کرنا شروع کیا۔ جس سے کھٹ پٹ کی تھوڑی بہت آوازیں ہونے لگی تھیں۔ پھر زبرد پور بعد اس نے اندر سے ہی آواز دیتے ہوئے کہا۔

”معاف کیجئے گا بتا آپ کہ قہر کی تکلیف تو ہوئی مگر آپ کو پانچ منٹ اور انتظار کرنے پڑے گا۔ فلم کے رولز ایسی باتیں میں دے رہے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں!“ دکان میں بیٹھتے ہوئے ایرانی نے وہیں سے جواب دیا۔ ”آپ آرام سے فلم ڈھونڈ لیں مجھے جلدی نہیں ہے۔“

”شکریہ!“ کہہ کر ماسٹر ہر نام سنگھ دھیرے سے مسکرا دیا اور چیزوں کو ادھر ادھر کرتے ہوئے کھٹ پٹ جاری رکھی پھر اچانک وہ دروازے کی جانب جھپٹا اور دروازے کے ساتھ والی دیوار سے چمک کر کھڑا ہو گیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ ایرانی اس پر حملہ کرنے کا اتنا بہترین موقع اپنے ہاتھ سے جانتے نہیں دے گا اور اس کا یہ اندازہ درست ہی ثابت ہوا کیونکہ ٹھیک اسی وقت اسٹوڈیو کے اندر سے آتی ہوئی سرسراہٹ کی آواز اس کی سماعت سے نکلنی اور وہ مزید چونکا ہوا گیا۔

شاید ایرانی کمری پر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے ڈارک روم کا دروازہ دھیرے سے کھل گیا، جس کی وجہ سے اسٹوڈیو کی تیز روشنی اس اٹھ کھلے دروازے کے اندر آ گئی پھر اس اٹھ کھلے دروازے سے ایک چمکتا ہوا لمبا دو دھاری خنجر اندر کی

پہل کرنے کا موقع وہ دشمن کو ہی دے گا اور دیکھے گا کہ اس کا دشمن کیا کرتا ہے؟

دوسرے دن شام کو سورج غروب ہونے کے بعد ماسٹر فوٹو اسٹوڈیو میں ایک گاہک اپنے پاسپورٹ کے لیے تصویریں بنوانے آیا۔ ماسٹر ہر نام سنگھ نے سر اٹھا کر ایک سرسری نظر اس پر ڈالی تو اندر ہی اندر وہ بڑی طرح سے چونک کر رہ گیا۔ یہ گاہک کوئی اور نہیں بلکہ وہی ایرانی تھا جس کو قتل کرنے کے لیے اس نے سنڈکیٹ سے پانچ ہزار روپے اڈوانس لے رکھے تھے۔

یقیناً اسے توقع نہیں تھی کہ ایرانی خود چل کر اس کے پاس آ جائے گا اور وہ بھی اتنی جلدی اور اسی لمحے اسے لگا کر ایرانی اس کے پاس اس کا شکار بننے نہیں آیا ہے بلکہ اسے اپنا شکار بنانا آیا ہے۔

ماسٹر ہر نام تیزی سے سہمے اٹھا اور ایرانی کی طرف سے ہونے والے منہ سے سے بچنے کے لیے اس کا باغ تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔

”یہ ذمہ ہے!“ وہان دارہونے کے ناتے اس نے اپنے ننگے گاہک کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

”مجھے پاسپورٹ کے لیے تصویریں بنوانی ہیں۔“ ایرانی نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”اگر کل تک مل جائیں تو۔۔۔۔۔“

”اوہ ضرور۔۔۔۔۔ ضرور۔۔۔۔۔!“ ماسٹر نے خندہ پیشانی سے کہا۔ ”آپ تشریف رکھیے کل آپ کو تصویریں مل جائیں گی۔“

یہ کہہ کر اس نے اندر کے تمام بلب روشن کروائے اور ایرانی کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب ایرانی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تو ماسٹر نے اپنے کیمرے کو چمک کیا اور پھر بولا۔

”سوری کیمرے میں فلم نہیں ہے میں دو منٹ

ایرانی کا نام سنا تھا کہ سنڈکیٹ اکثر ایرانی نامی شخص سے بھی کام لیتا ہے۔ خاص کر کے اس وقت جب وہ شہر میں موجود نہیں ہوتا تو ایسے میں ایرانی سے ہی وہ کام لے لیا جاتا ہے۔

اس بات کی یاد آتے ہی ماسٹر کے پاس اب شک کی گنجائش ہی نہیں تھی اور وہ سمجھ گیا تھا کہ ایرانی کیوں اس کے پیچھے لگا ہوا ہے؟ ایرانی کا اور اس کا دھند ایک ہی ہے۔ دونوں ہی اجرتی قاتل ہیں اور اب دونوں کو ہی سنڈکیٹ نے ایک دوسرے کو ختم کرنے کا کام سونپا ہے۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد ماسٹر نے ایک گہرا سانس لیا پھر اس کے ہونٹوں پر ایک بڑا مسرادی مسکراہٹ ابھرا آئی اور وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

”اگر سنڈکیٹ نے مجھ کو ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کرنے کی بات کہی ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ اب یقیناً دو دنوں میں سے کون رہتا ہے؟“

میں یاد ہے ایرانی! مجھے بھی اس امتحان میں پورا تو اترنا ہی ہوگا اور وہ ایرانی بھی اس امتحان میں سرخرو ہونے کی پوری کوشش کرے گا جیت کس کی ہوگی یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔“

ماسٹر ہر نام سنگھ کی جگہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو ڈر کے مارے اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے۔ مگر ماسٹر ہر نام سنگھ کوئی ڈر پوک اور گھبرانے والا آدمی نہیں تھا۔ آج تک وہ خود دوسروں کو اپنا نشانہ بناتا رہا تھا مگر آج وہ خود کسی اور کے نشانے پر آ گیا تھا اور اب اپنی ممکنہ موت سے بچنے کے لیے اسے بہت سوچ سمجھ کر اور پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔

اور اسی لیے بہت غور کرنے کے بعد خراس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے دشمن پر وار نہیں کرے گا بلکہ

”میں اور پولیس کو بلاؤں گا؟ ارے میں تو پولیس کی پرچھا نہیں سے بھی دور بھاگتا ہوں۔“

”لیکن تمہیں پولیس کو تو بلانا ہی چاہیے۔“ ایرانی ذرا حیرت سے بولا۔ ”کیونکہ میں تو تمہیں قتل کرنا چاہتا تھا اور تم نے خود بھی یہ دیکھا ہے۔“

”ہاں! لیکن تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے یہ تم نے بھی دیکھ لیا ہے۔“ ماسٹر ہرنام سنگھ ہنس کر بولا۔

”یہ میری پہلی ناکامی ہے۔“ ایرانی خیر لہجے میں بولا۔

”اور میری یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔“ ماسٹر ہرنام سنگھ اسی طرح ہنستے ہوئے بولا۔

”اگر تم پولیس کو نہیں بلاؤ گے تو کیا کرو گے؟“ ایرانی نے پوچھا۔

”تمہارا کام تمام کروں گا اور کیا کروں گا؟“ ہرنام سنگھ نے کہا۔

”تو تم میرا خون کرو گے؟“ ایرانی کے لہجے میں حیرت کی جھلک تھی۔

”ہاں! لیکن یہ کام میں چند منٹوں کے بعد کروں گا اس سے پہلے ہم دونوں مل کر یہ طے کریں گے کہ تمہاری موت کیسے ہونی چاہیے؟“ ماسٹر ہرنام سنگھ نے اعتماد لہجے میں بولا۔

”موت تو موت ہی ہے۔“ ایرانی بولا۔ ”چاہے جیسے بھی ہو۔“

”ٹھیک کہا تم نے کہ موت تو موت ہی ہے۔“ ماسٹر ہرنام سنگھ مسکرا کر بولا۔ ”خیر اس سے پہلے میں تم سے کچھ جانتا چاہتا ہوں۔“

ایرانی چونک پڑا اور اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ایک ہلکی سی سہ کاری نکل گئی اس کے دائیں ہاتھ کی کلائی میں اب بھی شدید درد ہو رہا تھا۔

کی کلائی مروڑی اور ایرانی گھبرا کر چیخ پڑا۔ اس نے اپنے دوسرے ہاتھ سے بند دروازے کا پٹ کھول دیا پھر دونوں ڈارک روم سے نکل کر اسٹوڈیو کے کمرے میں آ گئے۔

ہرنام سنگھ نے اپنی پکڑ بہت ہی مضبوط کر رکھی تھی اور اس کے دوسرے ہاتھ میں خنجر چمک رہا تھا۔ ایرانی کا زرد چہرہ اب اور بھی زیادہ زرد پڑ گیا تھا۔ ماسٹر ہرنام سنگھ نے اسے ایک کرسی پر بٹھایا اور خنجر والا ہاتھ بڑھا کر قریب پڑی ہوئی میز کی دروازے سے پلاسٹک کی مولی رسی کا ایک بندل نکال لیا۔

پھر ہرنام سنگھ نے اس رسی سے ایرانی کو کرسی کے ساتھ جکڑ دیا مگر اس نے اس کے دونوں ہاتھ جان بوجھ کر کھلے چھوڑ دیئے تھے۔ ایرانی اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی کلائی سہلانا ہوا چپ چاپ بیٹھا ماسٹر ہرنام سنگھ کو گھور رہا تھا۔

ہرنام سنگھ نے پہلے اپنے گھر کے اندر جانے والے دروازے کو بند کیا پھر اس نے دکان کا دروازہ بھی بند کر کے سائن بورڈ کے اوپر چلتی ہوئی ٹائٹ کا بٹن بھی بند کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اسٹوڈیو کے اندر کا صرف ایک بلب چھوڑ کر باقی کے تمام بلب بجھا دیئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ ایک کرسی بچھ کر ایرانی کے سامنے بیٹھ گیا اور مسکرا کر بولا۔

”ہاں تو اب بتاؤ تم اپنے جرم کی کیا سزا چاہتے ہو؟“

ایرانی اب کچھ سنبھل گیا مگر اس کے چہرے پر اب بھی گھبراہٹ کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔ ماسٹر ہرنام سنگھ کا سوال سن کر وہ ذرا دیر تک چپ رہا پھر دھیمی آواز میں بولا۔

”اب تم پولیس کو بلاؤ گے اور کیا کرو گے؟“ ہرنام سنگھ ہنس پڑا اور ہنستے ہوئے بولا۔

”لیکن تم ہو کون؟“ ایرانی اپنی کلائی سہلاتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

”تمہیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ماسٹر ہرنام سنگھ بولا۔ ”میں تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم آرام سے مروڑیں اس کا سارا درد اور کم پر ہے اگر تمہیں آرام سے مرنا ہے تو میرے ساتھ بالکل سیدھی سیدھی صاف ہاتھیں کرنا کیونکہ میں یہ بات جانتا ہوں کہ سنڈ کیٹ نے ہی تمہیں میری جان لینے کا کام سونپا ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کی وجہ کیا ہے لیکن میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ میں زندہ رہوں گا اور تم موت کے سفر پر روانہ ہو جاؤ گے۔“

ایرانی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

”لیکن تمہیں یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟ یہ بات تمہیں کس نے بتائی کہ سنڈ کیٹ نے تمہیں قتل کرنے کا کام مجھے سونپا ہے؟“

”یہ بات تو بالکل صاف ہے۔“ ماسٹر ہرنام سنگھ بولا۔ ”کیونکہ اسی سنڈ کیٹ نے مجھے تمہارا خون کرنے کا کام سونپا ہے۔“

یہ سن کر ایرانی چیخ پھڑکی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ماسٹر ہرنام سنگھ ذرا ٹھہر کر آگے بولا۔

”اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اور تم دونوں ایک ہی دھندا کرتے ہیں یعنی ہم دونوں ہی کرائے کے قاتل ہیں اور میں بھی تمہاری طرح سنڈ کیٹ کے لیے کام کرتا ہوں۔ سنڈ کیٹ اب ہم دونوں میں سے کسی ایک کو ہی اسے ساتھ رکھنا چاہتی ہے۔ اس لیے اس نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کو ختم کرنے کی ذمہ داری سونپی ہے تاکہ جو زندہ رہ جائے وہی سنڈ کیٹ کے لیے کام کرے اب بات یہ ہے کہ تمہیں ذرا دیر

ہوگئی ہے اور میں جلدی سمجھ گیا ہوں۔ تم نے شاید اپنے دماغ پر زور ہی نہیں ڈالا ہے جب کہ میں نے کل رات بھر یہی کام کیا ہے اور میری اس محنت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ تم اس وقت میرے قبضے میں ہو۔“

ایرانی کے چہرے پر اب درد کی تکلیف اور گھبراہٹ کے ساتھ سخت غصے کے تاثرات بھی نظر آ رہے تھے لیکن وہ اپنے غصے کو قابو میں رکھ کر بولا۔

”اگر ایسی بات ہے تو یہ سنڈ کیٹ کا دوغلا پن ہے اسے ایسی حرکت نہیں کرنا چاہیے گی۔“

”کچھ بھی ہو مگر اس کا یہ منصوبہ ہے نا جواب!“

ہرنام سنگھ مسکرا کر بولا۔ ”اور اس کی تعریف تو تم بھی کرو گے کہ سنڈ کیٹ نے بڑی عقل مندی سے کام کیا ہے میں تو اس منصوبے کی داد دے بغیر نہیں رہ سکتا۔ واقعی بہت ہی بہترین منصوبہ بنایا گیا ہے۔ یعنی جو جیتے وہ زندہ اور پھر وہ ہزار روپے انعام جس میں آدھی رقم ایڈوائس..... تمہیں بھی ایڈوائس ضرور ملے گی؟“

ایرانی نے جواب دیا کہ ماسٹر ہرنام سنگھ اپنی کرسی پر سے اٹھا اور ایرانی کے قریب جا کر اس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ اس کا اندازہ درست تھا کیونکہ ایرانی کی جیب کی ایک جیب سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکل آئے تھے۔ جنہیں اس نے اپنی پتلون کی جیب میں سرکادیا اور دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

یہ تم نے اچھا کیا کہ اپنی ایڈوائس کی رقم بھی تم ساتھ ہی لے آئے۔“

ایرانی بڑی بے بسی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”تو اب سنو میرے دوست!“ ماسٹر ہرنام سنگھ نے آرام سے اپنے پاؤں پھیلا کر بولا۔ ”سنڈ کیٹ نے ہم دونوں کے ساتھ بڑا دلچسپ کھیل کھیلا ہے اور اب میں خود سنڈ کیٹ کے ساتھ اپنا کھیل کھیلتا چاہتا ہوں۔ جو دھندا تم کرتے ہو وہی دھندا میں بھی کرتا

دغا بازی کا ایسا بدلہ لوں گا کہ قبر میں لیٹی ہوئی تمہاری روح بھی خوش ہو جائے گی۔“
”یہ تمہاری بھول ہے۔“ ایرانی کی آواز ذرا تیز ہوئی۔

”اچھا۔ وہ کیسے؟“ ہرنام سنگھ چونک کر بولا۔
لیکن ایرانی نے جواب دینے سے پہلے ہی بڑی پھرتی سے اپنا ایک ہاتھ اپنی گردن کے چٹختے حصے پر ڈالا اور اپنی پیچھے میں پیچھی سوئی کنار باہر نکال لی اور اسے پورنی طاقت سے ماسٹر کے سینے کی جانب دے مارا۔ چٹک جھٹکتے ہی یہ سب ہو گیا تھا۔ لوہے کی چٹکتی ہوئی کنار بھٹی کی سی تیزی سے ہرنام سنگھ کی طرف ٹپک گئی۔ لیکن ماسٹر ہرنام سنگھ بھی یہ کچھ نہیں تھا وہ فوراً ہی کمری پر ترچھا ہو گیا۔ ناکن کی طرح بھونکارتی ہوئی تیز کنار اس کے شانے میں پیوست ہوئی اور خون بہنے لگا لیکن کنار بہت گہرائی تک نہیں گئی تھی۔ بازو کی ہڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ماسٹر ہرنام سنگھ نے پہلے تو تیز نظروں سے ایرانی کو گھورا پھر اس نے ایک ہاتھ سے کنار کو شانے سے ہٹھک نکالا۔ خون آلود کنار اب اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ اسے تان کر ایرانی کی جانب پھینکے ہوئے بولا۔

”شامبائش میرے دوست! تم واقعی بہادر آدمی ہو۔ میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں لیکن اب تمہاری اسی کنار سے میں تمہیں ختم کر دوں گا مگر حلال نہیں بلکہ جھٹکے سے ہی۔“ یہ کہہ کر اس نے کنار ایرانی کے سینے میں آٹا دی۔ جوسیدھی اندر اتر کر ایرانی کے دل کو چیر گئی۔ جس سے خون کا فوارہ ابل پڑا ایرانی اسی وقت دم توڑ چکا تھا۔

ماسٹر ہرنام سنگھ کے چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کے کوئی تاثرات نہیں تھے۔ وہ آرام سے چلتا ہوا کونے میں پڑی ہوئی چھوٹی سی میز کے پاس آیا اور

سر پر کچے کچے بال ہیں اور اس کی چال میں ذرا سی انکڑا ہٹ ہے۔“ کہتے کہتے ایرانی ہانپنے لگا۔ وہ سانس لینے کے لیے نکلا اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔
”کیا نام ہے اس کا؟“ ماسٹر ہرنام سنگھ کی سیات سی آواز ایرانی کی سماعت سے لکرائی تو اس کی آنکھیں پھر کھل گئیں اور وہ پھر رک رک کر بولا۔

”میں تو اسے صرف ڈاکٹر کے نام سے جانتا ہوں وہی مجھے سنڈ کیٹ کی جانب سے ہدایات دیتا ہے اور معاوضے کی ادائیگی بھی وہی کرتا ہے۔“
”لیکن اس ڈاکٹر کو یا سنڈ کیٹ کو یہ کیسے پتا چلتا ہے کہ تم نے ان کا کام پورا کر دیا ہے؟“ ہرنام سنگھ نے پوچھا۔

”یہ تو تم پر بھی جانتے ہو۔“ ایرانی بولا۔ ”شہر میں کسی شخص کا قتل ہو جائے اور ایش پولیس کو مل جائے تو یہ خبر اخباروں میں چھپ جاتی ہے اور خبر پڑھ کر میری ادائیگی کر دی جاتی ہے۔“

”اسی پارک میں؟“ ہرنام سنگھ نے پوچھا۔
”ہاں!“ ایرانی بولا۔ ”لیکن میں یہ سب باتیں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ سنڈ کیٹ نے میرے ساتھ دغا بازی کی ہے۔ اس لیے میں ان سے بدلہ لینا چاہتا ہوں کہیں تم یہ نہ سمجھ لینا کہ میں تمہاری کسی دھمکی سے ڈر گیا ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے تم ڈر پوک نہیں ہو۔“ ماسٹر ہرنام سنگھ ہنس کر بولا۔ ”اب یہ بھی بتا دو کہ تم شائق لال کو جانتے ہو؟“
”نہیں! یہ نام میں نے پہلے کبھی نہیں سنا۔“ ایرانی بولا۔

”ٹھیک ہے!“ ہرنام سنگھ اپنی دونوں رانوں پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ”تم اطمینان رکھو اب میں سنڈ کیٹ سے ہم دونوں کے ساتھ کی جانے والی

ہوں۔ اس لیے تم سمجھ ہی سکتے ہو کہ مجھے تمہارا خون کرنا ہی پڑے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ میں تمہیں حلال کروں یا جھٹکے سے ختم کروں؟ اگر تم چاہو تو ایک ہی جھٹکے میں کام تمام کر دوں اور اگر تمہیں یہ قبول نہ ہو تو پھر حلال کر دوں۔ ابھی تو میں نے تمہارا ایک ہی ہاتھ توڑا ہے اگر تم کہو گے تو دوسرا بھی توڑا جاسکتا ہے۔ اس کا فیصلہ بھی اب تمہیں ہی کرنا ہے۔ بولو حلال یا جھٹکا.....؟“

”جو تمہاری مرضی!“ ایرانی نے تھکی تھکی سی آواز میں کہا۔ ”میں اب کمری کیا سکتا ہوں؟“
”تو پھر تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ سنڈ کیٹ کی طرف سے کون تم سے رابطہ کرتا ہے اور تمہیں ہدایات دیتا ہے؟“ ماسٹر ہرنام سنگھ نے پوچھا۔ ”بتا دو وہ کون ہے کیا؟ اور کب ماتا ہے؟ اس کی شکل و صورت کیسے ہے عمر کتنی ہے؟ اور اصل یہ کیا ہے؟ اس کا نام اور خاص پہچان بھی چاہو تو بتا دو اور اگر نہ بتانا چاہو تو یہ تمہاری مرضی سے عمر بڑی حالت میں پھر مجھے تمہارا دوسرا ہاتھ بھی توڑنے کی تکلیف کرنا پڑے گا۔“

ایرانی ٹوٹے ہوئے ہاتھ کی تکلیف سے کراہ رہا تھا اور اس کی آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہوئی جارہی تھیں۔ ذرا دیر بعد وہ بہت سی دھیمی آواز میں بولا۔
”ٹھیک ہے اگر مجھے مرنا ہی ہے تو پھر بتانے میں کوئی حرج بھی نہیں جب سنڈ کیٹ خود میری موت چاہتا ہے تو میں اس کی وفاداری کیوں کروں؟“

”تو پھر اب کیا ارادہ ہے؟“ ہرنام سنگھ نے پوچھا۔
”چنی روڈ پر جو ایک چھوٹا سا پارک ہے اس پارک میں دائیں جانب پھولوں کی کیاری کے پاس لکڑی کی ایک بچ ہے اس پوری قطار میں وہی ایک اکلونی بچ ہے جس پر میری ایک آدمی سے ملاقات ہوئی رات ہی اس کی عمر پینتالیس پچاس کے آس پاس ہے

میز کی ایک دروازے سے فرسٹ ایڈ ایمر جنسی ٹیپ کی دو پٹیاں اپنے شانے کے زخم پر چپکادیں۔

اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا کرسی پر بڑی ہوئی ایرانی کی لاش کے قریب آ گیا پھر اس نے جھک کر ایرانی کی لاش کو رشتی کے بندھنوں سے آزاد کیا۔ ایرانی نے جو کپڑے پہن رکھے تھے وہ اس کے خون میں تر تھے جب کہ کنار اس کے سینے میں گھسی ہوئی تھی۔ خون آلود رشتی ایک کونے میں پھینکنے کے بعد اس نے دوسرے کونے میں پڑا ہوا خنجر اٹھایا اور پھر اسے بھی ایرانی کی لاش کی گردن میں گھونپ دیا۔ ایک میلے کپڑے سے اس نے اپنے ہاتھ پونچھے اور پھر اسٹوڈیو کے اندر کے تمام بلب روشن کر دیئے تیز روشنی میں کمرے کی ایک ایک چیز بالکل صاف نظر آ رہی تھی۔

ماسٹر ہرنام سنگھ نے اپنا کیمرا اٹھایا اور کرسی پر بڑی ہوئی لاش پر کیمرے کا فوکس درست کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے مختلف زاویوں سے لاش کی چار پانچ تصویریں اتاریں اور پھر ڈارک روم میں جا کر ان تازہ سیٹی ہوئی تصویروں کو ڈیولپ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں تصویریں خشک ہو کر تیار ہوئیں تو اس نے ان تصویروں کو ایک سفید لفافے میں رکھا اور پھر اس لفافے کو اپنی جیب میں ڈال لیا۔

اس کے بعد وہ ہاتھ میں کیمرا اٹھائے ڈارک روم سے باہر آ گیا۔ کیمرے کو میز پر رکھ کر وہ ڈراویر تک ایرانی کی لاش کے پاس کھڑا رہا پھر جھک کر اس کی دونوں بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے کھینچتا ہوا ہاتھ روم کے اندر لے گیا۔ لاش کو فرش پر لٹانے کے بعد اس نے پہلے لاش کے سینے میں گھسی ہوئی کنار کو باہر نکالا پھر اس کی گردن میں پیوست خنجر کو بھی کھینچ کر باہر نکال لیا۔ خنجر اور کنار کو پانی سے اچھی طرح دھونے کے بعد

اس نے اسٹوڈیو والے کمرے میں آ کر ان دونوں ہتھیاروں کو ایک اخبار میں لپیٹ کر کیمرے کے پاس ہی رکھ دیا۔ پھر اپنی ایک جیب سے ہزار کے چند نوٹ اور دوسری چھوٹی موٹی چیزیں نکال کر اس نے انہیں بھی وہیں رکھ دیا۔

اسے کوئی جلدی نہیں تھی اس لیے وہ آرام اور سکون سے دھیرے دھیرے اپنا کام کر رہا تھا ہاتھ روم میں واپس آ کر اس نے ایرانی کی لاش پر سے اس کے خون آلود کپڑے اور جوتے موزے اتارنے سخت سردی کے باوجود اس کے ہاتھ پر پسینے کی گھسی بوندیں چمک رہی تھیں لیکن موسم کی اس خنڈ کی وجہ سے لاش کے زخموں سے خون بہنا بند ہو گیا تھا کپڑے اور جوتے اتارنے کے بعد ماسٹر ہرنام سنگھ نے خنڈ سے پانی کا شاور کھول دیا تاکہ زخم اور خون آلود جسم دھل جائے اور لاش مزید خنڈی ہو جائے۔

اس کے اوپر خنڈ سے پانی کا شاور چلا کر اس نے ایرانی کے کپڑے اور جوتے اٹھائے اور اپنے اسٹوڈیو کے کباڑ خانے کے چھوٹے سے کمرے میں ڈال دیے۔ کباڑ خانے کے اس کمرے میں پچھوٹی پھوٹی چیزیں اور ناکارہ فلموں کے بے شمار بھرے ہوئے ڈبے بھی پڑے تھے۔ دروازے پر کھڑے رہ کر اس نے ڈراویر تک ان سب ناکارہ ڈبوں اور دوسری ٹوٹی پھوٹی چیزوں کا جائزہ لیا اور اپنے میڈروم میں آ گیا۔

اپنی الماری کھول کر اس نے اپنا ایک ٹائٹ سوٹ نکالا اور اسے لے کر پھر ہاتھ روم میں آ گیا۔

ایرانی کی لاش دھل کر بالکل برف کی طرح سفید ہو چکی تھی۔ جسم پر خون کی ایک بوند بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہر نام سنگھ نے شاور بند کر دیا اور پھر ایک خشک کپڑے سے لاش کو اچھی طرح سے پونچھ کر اپنا

ٹائٹ سوٹ اسے پہنا دیا۔ اب اس کی سانس بھی کچھ پھول رہی تھی اور وہ تھک بھی گیا تھا۔ اس کے کپڑوں پر بھی خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے ہوئے تھے اور وہ شاور کے پانی سے بھیگے بھیگے لیکن ابھی اسے اپنے کپڑے بدلنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ ابھی تو اسے ایرانی کی لاش کو کسی طرح اٹھا کر یا کھینچ کر اپنے بستر پر لٹانا تھا اور تھوڑی دیر بعد اس نے یہ محنت طلب کام بھی کر لیا۔

ایرانی کی لاش کو اپنے پلنگ پر لٹا دینے کے بعد اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور پھر کباڑ خانے والے کمرے کی طرف چل پڑا۔ ٹوٹی ہوئی میز کرسیوں کی لکڑیاں پرانے اخبارات اور ناکارہ فلموں سے بھرے ہوئے چند ڈبوں کو کھول کر اس نے ان ساری چیزوں کو اسٹوڈیو میں اور ڈارک روم میں ادھر ادھر بکھیر دیا خاص کر کے اپنے میڈروم میں اور پلنگ کے اوپر پونچھ اس نے ناکارہ فلموں کا ایسا انبار لگادیا کہ اس کے پیچھے ایرانی کی لاش چھپ گئی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ایک بار پھر الماری سے اپنے دھلے ہوئے کپڑے نکالے اور ہاتھ روم میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب نہادھو کر اور صاف کپڑے پہن کر باہر آیا تو بہت فریٹش لگ رہا تھا۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے جوتے پہنے بال سنوارے اور کوٹ پہننے کے بعد وہ اسٹوڈیو والے کمرے میں گیا۔ جہاں اس کا میسرہ ایرانی کی لاش کی تصویریں اور روپے وغیرہ پڑے تھے۔ اس نے تمام چیزوں کو اپنے کوٹ کی جیبوں میں ڈالا اور کیمرہ کو گگلے میں لٹکانے کے بعد میز کی دروازے سے ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی تھیلی نکالی جس میں سفید پاؤڈر جیسا کوئی کیمیکل بھرا ہوا تھا۔

کیمیکل کے اس پاؤڈر کو اس نے پورے گھر اور اسٹوڈیو کے اندر چاروں طرف چھڑکا اور پھر تھیلی میں بجا ہوا سارا پاؤڈر اپنے پلنگ پر اچھا ل دیا جس پر ایرانی کی لاش پڑی تھی۔ اب اس کے پاس صرف ایک آخری کام ہی رہ گیا تھا اور وہ کام تھا ماسٹر کی ایک تیلی چلا کر جابجا بکھرے ہوئے فلموں کے ٹکڑوں کے ڈھیر پر اچھا ل دینا اور یہ کام بھی اس نے فوراً ہی کر ڈالا۔ ماسٹر کی جلی ہوئی تیلی نے اپنا کام دکھایا۔ فلم اور خطرناک کیمیکل نے دھیرے دھیرے آگ پکڑنا شروع کر دی اس کے ساتھ ہی ماسٹر ہرنام سنگھ نے دروازہ بند کر دیا اور تیزی سے گلی کے اندھیرے میں بڑھتا چلا گیا۔ گلی کے سرے پر ہی اسے ایک ٹیکسی مل گئی جس پر بیٹھ کر وہ اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن کے تقریباً تمام اخبارات نے اس واقعے کی خبریں شائع کرتے ہوئے تفصیل سے لکھا تھا۔ ”گزشتہ رات دھوبی تلاؤ کے علاقے میں واقع ماسٹر فوٹو اسٹوڈیو اور اس سے ملحقہ ایک گھر میں زبردست آگ بھڑک اٹھی آگ بجھانے کی تمام تر کوششوں کے باوجود اس پر جلد قابو نہیں پایا جاسکا جس کی وجہ سے فوٹو اسٹوڈیو اور اس کے مالک کا گھر جو دکان کے ساتھ ہی تھا۔ جل کر خاک ہو گیا۔ جلے ہوئے مکان کے اندر سے ایک لاش بھی ملی ہے جس کے بارے میں علاقے کے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ ماسٹر فوٹو اسٹوڈیو کے مالک ہرنام سنگھ کی ہی لاش ہو سکتی ہے کیونکہ وہ اکیلا ہی اپنے گھر میں رہتا تھا۔ لاش جس گرا بالکل خاک ہو چکی تھی اس لیے اس کو شناخت کرنا ناممکن تھا رات کے تقریباً دس بجے کے بعد لوگوں نے اسٹوڈیو کی چھت پر آگ کے بلند ہوتے شعلے دیکھے تھے جس کے بعد فائر بریگیڈ کی

دوسرے دن شام کے وقت ماسٹر ہرنام سنگھ سنڈیکیٹ کے ایجنٹ شائق لال کے ساتھ شملہ ریسٹوران کی ایک میز پر بیٹھا چائے پی رہا تھا چائے کی پیالی کو ہونٹوں سے لگائے شائق لال بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا پھر چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد وہ دھیمی آواز میں بولا۔

”مجھے تمہیں زندہ دیکھ کر کچھ حیرت سی ہو رہی ہے کیونکہ تمہارے گھر میں لگنے والی آگ میں تو تم جل کر مر گئے تھے؟“

”نہیں شائق لال صاحب! وہ میں نہیں تھا۔“ ماسٹر ہرنام سنگھ نے ذرا آگے کی جانب جھک کر راز دارانہ لہجے میں کہا۔ ”میں تو پونا گیا ہوا تھا اور اپنا مکان ایک دوست کے حوالے کر گیا تھا بے چارہ بے قصور ہی مارا گیا مگر میں نے سوچا ہے کہ انشورنس کی رقم ملنے کے بعد میں اس کے گھر والوں کی کچھ مدد ضرور کر دوں گا۔“

”کیسا انشورنس؟“ شائق لال نے پوچھا۔
”ارے جناب! میں نے گھر اور دکان کا فائر انشورنس بھی کر رکھا تھا۔“ ماسٹر ہرنام سنگھ بولا۔ ”اسی لیے تو آسانی سے اسے جل جانے دیا ہے میں نے!“
”کیسا مطلب؟“ شائق لال ایک بار پھر چونک پڑا۔

”مطلب یہ ہے جناب کہ میں اس گندے علاقے کو چھوڑ کر کسی پوش علاقے میں رہنا چاہتا ہوں۔“ ماسٹر ہرنام سنگھ لہجہ سے لہجے میں بولا۔ ”بہت دنوں سے میں اس گھر کو بیچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ڈھونڈناؤ کا علاقہ اس قدر بدنام ہو گیا ہے کہ میرے مکان کی اصل قیمت کی چوتھائی رقم بھی کوئی دینے کو تیار نہیں ہے اور اسی لیے میں نے یہ قدم اٹھایا ہے اور اس کے لیے ایرانی نے ہی مجھے یہ راستہ دکھایا ہے۔“

”بھج جائے۔“
”کون پچا؟“ ڈاکٹر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
ہرنام سنگھ نے جواب دینے کی بجائے جیب سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ڈاکٹر نے وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور کھول کر پڑھنے لگا۔

”جناب ڈاکٹر صاحب! پرسوں رات کے واقعے کے بعد سے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے اپنے بھتیجے کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں یہ ایک سیدھا اور انتہائی بھلا بھالانا جوان ہے آپ اسے جو کچھ بھی دیں گے یہ چپ چاپ لاکر منجھے دے دے گا خبر تو آپ نے کل کے اخباروں میں پڑھ لی ہوگی فقط ایرانی!“

ماسٹر ہرنام سنگھ کو پورا یقین تھا کہ ڈاکٹر ایرانی کی تحریر پہچانتا ہی نہیں ہوگا۔ اس لیے اس نے خود ہی ایرانی کی طرف سے یہ جتنی لکھی تھی اور اس کا یہ اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ کیونکہ چٹھی پڑھنے کے بعد ڈاکٹر نے اپنے کونٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا اور پھر اس چٹھی کو پھاڑ کر پڑے پڑے کرتے ہوئے بولا۔

”یہ لفافہ اپنے چچا کو دینا۔۔۔ سمجھ گئے؟“
”جی!“ ہرنام سنگھ نے ادب سے کہا۔ ”میں یہ لفافہ اپنے چچا کو ہی دوں گا۔“
”ٹھیک ہے اے!“ کہہ کر ڈاکٹر آگے بڑھ گیا۔

چند قدم چلنے کے بعد ماسٹر ہرنام سنگھ نے لفافے کے اندر جھانک کر دیکھا لفافے میں ہزار ہزار کے پانچ نوٹ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھرا آئی اس نے لفافے کو پتھون کی جیب میں رکھا اور تیزی سے پارک سے باہر نکل گیا۔

گڑیاں جائے حادثہ پر پہنچ گئی تھیں لیکن تین گھنٹے کی کوشش کے باوجود گھر کے اندر لگی ہوئی آگ پر قابو نہیں پایا جا سکا تھا۔ علاقے کے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ فوٹو اسٹوڈیو گھر کے ہی اگلے کمرے میں بنایا گیا تھا جس کا ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا اور اندر کے دو کمروں میں ہرنام سنگھ کی رہائش تھی۔ پولیس کا خیال ہے کہ ڈاکٹر روم میں اچانک شارٹ سرکٹ کی وجہ سے بیٹا لگ گیا ہے۔

ماسٹر ہرنام سنگھ کے بارے میں لوگوں نے بتایا کہ وہ غیر شادی شدہ تھا بہت ہی ہنس کھ اور زندہ دل تھا علاقے کے لوگوں کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی ہر ایک کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتا اس کی عادت تھی۔

واقعے کے تیسرے روز سہ پہر کے وقت ماسٹر ہرنام سنگھ چنی روڈ کے اس چھوٹے سے پارک میں پھولوں کی سیاری کے قریب والی بیچ پر بیٹھا تھا اس وقت اس کے ہاتھ میں نہ تو کوئی بیگ تھا اور نہ ہی اس کے گلے میں اس کا کیمرہ تنک رہا تھا۔

ابھی اسے وہاں بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ پتلون قمیص میں ملبوس کچے پکے بالوں والا ایک دوا پتلا شخص جس کی چال میں ملکی سی لنگڑاہٹ محسوس ہو رہی تھی اس کی طرف دیکھتا ہوا اس کے سامنے سے گزرنے لگا ماسٹر ہرنام سنگھ نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر فوراً ہی اٹھ کر بولا۔

”ڈاکٹر صاحب! ذرا ایک منٹ۔۔۔!“
کچے پکے بالوں والا شخص فوراً ہی رک کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا اتنی دیر میں ہرنام سنگھ اس کے قریب آ کر جیسے لہجے میں بولا۔
”ڈاکٹر صاحب! مجھے میرے بیٹا نے یہاں

احسان

اسرار احمد

احساس محرومی ایک ایسا جذبہ ہے جو بعض اوقات انسان کو انسانیت سے بھی دور کر دیتا ہے اور وہ اپنی محرومیوں کا انتقام لینے کے لیے نرندہ بن جاتا ہے۔

ایک معذور شخص کا احوال وہ مددگار کرنے والوں کو بھی اپنا قریب سمجھاتا تھا۔

اس حادثے کو ہوئے اب کئی مہینے بہت چکے تھے۔ ڈک ماسٹر اس حادثے کے باعث زندگی کے ایسے موڑ پر آ گیا تھا جہاں زندگی اور موت دونوں ہی بے معنی سی شے بن جاتی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مزید ہوگا کہ اگر اسے دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا موقع دیا جاتا تو وہ مر جانے ہی کو ترجیح دیتا لیکن اپنے مفلوج وجود کے سبب ڈک حرکت کرنا تو کجا قوت گویائی تک سے محرومی کے باعث اظہار کرنے سے بھی معذور تھا۔ دن پر دن خاموشی سے گزرتے چلے جاتے اور وہ اپنے بستر پر لیٹا چپ چاپ کمرے کی چھت کو دیکھتا رہتا۔ اس کی بیوی تھیلیما اپنی طاقت اور برداشت سے کہیں بڑھ کر ڈک کی خدمت کرتی اور بخوشی اس کے کاموں میں مصروف رہتی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے ڈک کو کھانا کھلاتی۔ اس کا بدن صاف کر کے پرانا لباس بدلتی اور اسے رام پہنچانے کی ہر ممکن کوشش میں لگی رہتی۔ مگر اس کی تمام تر خدمات اور وفاداری رفتہ رفتہ ڈک کے بیدار ذہن پر بڑی طرح اثر انداز ہو رہی تھی۔ تھیلیما اپنا زیادہ تر وقت اس کے قریب ہی گزارتی۔ مگر اس کی ہر وقت کی موجودگی ڈک کی طبیعت پر انتہائی گراں گزرنے لگی تھی۔ جب اسپتال سے واپس گھر پہنچ کر تھیلیما نے اس نرس کو بھی رخصت کر دیا جو ڈک کی دیکھ بھال کے لیے مامور بھی تو ڈک کے برافروختہ ہو رہا تھا۔ تھیلیما نے اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد نرسنگ کی مکمل تربیت حاصل کی تھی۔ اس لیے اس کا خیال تھا کہ جس قدر بہتر طریقے اور ذہنی دلچسپی سے وہ ڈک کی خدمات انجام دے سکتی ہے، کوئی دوسرا اس حد تک توجہ نہیں دے سکتا۔ اس لیے تھیلیما نے اپنی ہر خواہش کا دم گھونٹ کر اور باہر کی دنیا سے نانا توڑ کر خود کو صرف اور صرف ڈک کے کمرے تک محدود کر لیا تھا۔

..... مگر اس خیال کے برعکس ڈک کا خیال تھا کہ تھیلیما اپنے مجرم ضمیر سے خوف زدہ ہونے کی وجہ سے اس کے پاس کسی دوسرے شخص کی موجودگی کو برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ وہ اسے اس طرح بے بسی سے بستر پر لیٹے دیکھ کر اور صرف اپنے ہی رحم و کرم پر زندہ رکھ کر بے حد سکین پاتی ہے۔ وہ ابھی تک دوسروں سے حسد کرتی ہے۔ بالخصوص عورتوں سے، چاہے وہ نرس کے فرائض انجام دینے کے لیے ہی کیوں نہ رہی ہو۔

ایسے فاسد خیالات ڈک کو بے رحمانی آسودگی فراہم کرتے۔ گو اس طرح سے سوچنا انتہائی مضحکہ خیز بات تھی اور اس سے بھی بڑھ کر ایسی سوچ کو بے لگام گھوڑے کی طرح دماغ کی دلدلوں میں سرپٹ دوڑائے رکھنا بھی نہایت غیر مفید حرکت تھی۔ لیکن چند مہینوں سے صرف ایسے ہی بے ہودہ

”ایرانی نے؟“ شائق لال کی حیرت میں اور اضافہ ہو گیا۔

”جی ہاں!“ ہر نام سنگھ ہنس کر بولا۔ ”اگر وہ خود ہی مرنے کے لیے میرے اسٹوڈیو میں نہ آ جاتا تو میرے دماغ میں یہ ترکیب نہیں آتی“ اس کے آنے کے بعد ہی میں نے ایک تیر سے دو شکار بڑی آسانی سے کر لیے ہیں۔“

”لیکن ایرانی تو ابھی تک زندہ ہے۔“ شائق لال نے کہا۔ ”ابھی کل ہی تو اس نے۔۔۔۔۔۔“

”ایرانی نے نہیں!“ ماسٹر ہر نام سنگھ نے اس کی بات درمیان میں کاٹ دی اور بولا۔ ”میں خود ہی ڈاکٹر صاحب سے ایرانی کے بتایا پیسے لے آتا تھا۔“

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ شائق لال بولا۔

اتنی دیر میں ہر نام سنگھ نے اپنی جیب سے وہ لفافہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا جس میں ایرانی کی لاش کی تصویریں تھیں۔ شائق لال نے ان تصویروں کو بڑی باریک بینی سے دیکھا اور پھر ایک گہرا سانس لے کر بولا۔

”یہ بیوت تو کچے ہیں۔“

”جی ہاں!“ ہر نام سنگھ بولا۔ ”میرے مکان میں میں خود یا میرا کوئی دوست نہیں مرا تھا بلکہ جلے ہوئے گھر کے اندر سے جلی ہوئی جولاں ملی تھی وہ ایرانی ہی کی تھی۔“

”اوہ۔۔۔۔۔۔!“ شائق لال کے ہونٹ سکڑ گئے اور پھر بولا۔ ”تم واقعی ذہین ہو سچ سچ میں ماسٹر ماسٹر ہو۔“

”نہیں جناب!“ ہر نام سنگھ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”مجھے آپ ماسٹر کہتے ہیں تو صرف ماسٹر ہی رہنے دیں ذہین نہ بنائیں۔“

تھوڑی دیر تک وہ دونوں چپ بیٹھے رہے۔ شائق لال کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا پھر اس نے اپنی

جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اسے ہر نام سنگھ کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”تمہارے لقا پانچ ہزار ہیں۔“

”شکر یہ!“ کہہ کر ہر نام سنگھ نے تصویروں والا اور پانچ ہزار روپے والا لفافہ اٹھایا اور پھر دونوں لفافے اپنی جیب میں ڈال لیے۔ شائق لال کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں دھیان سے اس کے چہرے پر مرکوز تھیں پھر وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”ماسٹر! اس بار تو تم نے ایک کام کے لیے دس معاوضہ وصول کیا ہے۔“

”یہ تو بس آپ کی اور سنڈکیٹ کی مہربانی ہے۔“

کہہ کر ہر نام سنگھ اٹھنے لگا۔ ”احباب میں چٹا ہوں۔“

”ذرا ایک منٹ!“ کہہ کر شائق لال نے اس کے ہاتھ پر دھیرے سے اپنا ہاتھ رکھ دیا اور گہری سانس لے کر بولا۔

”مہمیں ایک کام اور کرنا ہے اس بار معاوضہ کچھ زیادہ ملے گا۔“

”کون ہے وہ؟“ ہر نام سنگھ نے دھیرے سے پوچھا۔

شائق لال نے کوٹ کی جیب سے چھوٹی سی پنسل نکالی اور میز پر پڑے ہوئے نشوونما پر ایک نام لکھ کر اس کی جانب کھسکا دیا ہر نام سنگھ نے دیکھا نشوونما پر لکھا تھا۔ ”ڈاکٹر منشی روڈ“ ہر نام سنگھ کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک نمودار ہوئی پھر اس نشوونما کو اپنی آنکھوں میں مسل کر اپنی جیب میں ڈالا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا ریسٹوران سے باہر نکل گیا۔

○

○

○

○

○

○

خیالات ڈک کے ساتھی تھے۔ اس کی مفلوج زندگی کے آخری سہ ماہی میں تھی۔ تھیلما جب بھی اسے کچھ کھلاتی یا پانی تو اپنا نرم گلابی رخسار اس کے کھرورے چہرے سے اگا کر اس کے کانوں میں امید افزا محبت بھرے اور حوصلہ بخش فخرے، پیار بھرے انداز میں آہستہ آہستہ کہتی رہتی۔

اس وقت ڈک ہمیشہ سوچتا کہ کاش تم اپنا یہ خوب صورت سر اور نازک سی گردن ذرا اور نیچے لے آؤ۔ میرے دائیں ہاتھ کے قریب جو بہت بہتر اور حرکت کے قابل ہے۔ تو میں اپنے اس کا مادہ ہاتھ سے تمہارا گلا دبا دوں اور اس وقت تک دباتا رہوں۔ جب تک تمہارا دم نہ نکل جائے۔

تھیلما جوں جوں اپنی جانب سے ڈک میں زندہ رہنے کی خواہش اور اُمٹک کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ڈک اسی قدر بے زار اور متفر ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ زندہ رہے گا اور توانائی حاصل کرے گا مگر صرف تھیلما کو ہلاک کرنے کے لیے۔ اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے۔

کسی مفلوج ہستی کے لیے کسی کو قتل کرنے کا پروگرام بنانا اور اس کے مطابق عمل کرنا گواہیک مشکل اور بڑی حد تک ناممکن سی بات تھی۔ لیکن ڈک فی الحال ”کچھ“ کر گزرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا تھا۔ ابھی تو اسے صرف سوچنا تھا تا کہ وہ اپنے بیدار ذہن کو مصروف رکھ سکے، اس ذہن کو جو اس کے مردہ جسم سے کسی طرح بھی مفاہمت اور سمجھوتے پر آمادہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

ڈک ماسٹر کچھ عرصہ قبل اپنے ملک کی ایک ایسی مشہور شخصیت تھا۔ جن کا نام چار جہاں گونجا کرتا۔

تھا۔ یہ وہی ڈک ماسٹر تھا جو کہ۔ پی۔ یو کلب کی طرف سے تین سال تک فٹ بال کا عالمی شہرت یافتہ کھلاڑی رہا تھا اور جس کی ایک نئی ٹی ٹھوکر فٹ بال کو ہمیشہ گولی کے اندر پھنسا دیتی تھی۔ اس نے مسلسل تین برس تک ٹیلی فونیا کو فتح و کامرانی کا منہ نہیں دیکھنے دیا تھا۔ تین سال بعد کے۔ پی۔ یو نے اسے سلور پلیٹ کا اعزاز دے کر اس سے نوآ سوز کھلاڑیوں کی تربیت کے لیے کوچ مقرر ہونے کی درخواست کی۔ مگر ڈک آخر ایک عظیم شخصیت تھا۔ وہ کس طرح اسی میدان میں دوسروں کو تربیت دے سکتا تھا۔ جہاں تین سال تک صرف اسی کے نام کے چرچے تھے۔ لہذا اس نے ریٹائر ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کی ریٹائرمنٹ کے بعد ہی وہ فساد کھڑا ہو گیا تھا۔ جس میں ڈک پر الزام لگایا گیا تھا کہ اس نے بھاری رشوت کے عوض مزید کھیلنے سے انکار کر دیا تھا۔ ڈک نے فوراً ہی اس الزام کی تردید کر دی لیکن یہ انکار اب بے سود تھا اور الزام لگانے والوں کے پاس تھیں ثبوت بھی موجود تھے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں فٹ بال کے کھیل کی تمام انجمنوں نے ڈک کی رکنیت اپنے اپنے اداروں سے ہمیشہ کے لیے خارج کر دی اور اس طرح وہ ان اخباروں کی سرخیوں سے بھی نکل گیا جہاں وہ ہمیشہ پہلے صفحے کی زینت بنتا چلا آ رہا تھا۔

اس سانحے کے بعد ڈک نے شکاگو میں ذاتی اسپورٹس کلب اور باروم کھولنے کی کوشش کی۔ وہ ہر صورت کھیل کی تاریخ اور روزانہ کے اخبارات میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ کلب کا اندرونی ہال اس نے اپنے ماضی کی شاندار تصاویر سے سجایا تھا۔

اس کے کلب کے کھلاڑی دوسری نیوں سے مقابلے کے لیے تیار یاں کرنے لگے مگر یہاں بھی ڈک کی راتوں رات مفلوج کی صف میں کھڑے

ونے والی خواہش نے تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ ایک رات ڈک نے اپنے باروم میں موجود ایک ایسے اخباری نمائندے کا سر پھاڑ دیا جس نے اس کی اجازت سرگرمیوں کے بارے میں تفصیلی رپورٹ اپنے اخبار میں شائع کی تھی اور اس کے جوئے کی میزوں پر ستمیں ہونے والے پانسوں اور رولٹ کو دھوکے بازی قرار دیا تھا۔ اس اخباری نمائندے کی بدولت ڈک عدالت کی نگاہوں میں بجرم قرار پا گیا۔

مگر ایک شاطر قانون دان کی مدد کے سبب وہ اس قانونی آزار سے تو بمشکل نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اب شکاگو میں اس کا مستقبل قطعی تاریک ہو کر اختتام پر پہنچ گیا تھا چنانچہ اسے مجبوراً تھیلما سے شادی کرنا پڑی تاکہ اس کی دولت سے وہ کھیلوں کا سامان تیار کرنے والا ذاتی کارخانہ قائم کر سکے۔ اس کارخانے میں فٹ بال، فٹس بال، کھلاڑیوں کے دستانے اور پیڈ تیار کیے جانے لگے۔

ماریون ”ڈک ماسٹر“ کا قیام مکمل میں آ گیا۔ تھیلما سے ڈک کی ملاقات ان دنوں ہوئی تھی اب وہ اپنی شہرت کے بام عروج پر تھا اور فٹ بال کے کھیل کے ہال میں دیگر شہریوں کی طرح وہ بھی اس کی ایک پرستار کی مانند موجود ہوئی۔ ڈک ماسٹر اپنے کھیل کے اختتام پر ایک ملکی سی مسکراہٹ ان تمام لڑکیوں کی طرف اچھال دیتا۔ جو گھنٹوں صرف اسی ایک مسکراہٹ کے لیے وہاں کھڑی رہا کرتی تھیں۔ ان دنوں ڈک نے نہ تو بھی تھیلما کو غور سے دیکھا تھا اور نہ ہی وہ اس قسم کی کمزور جسم کی لڑکی کو دیکھنے کے بارے میں سوچ سکتا تھا جس کا صرف چہرہ ہی پر کشش ہو مگر جسمانی اعتبار سے وہ ایک نظر کے قابل بھی نہ ہو مگر تھیلما خود ہی ڈک کا سایہ بن کر اس کے ساتھ گئی وہ جہاں جہاں بھی گیا تھیلما اس کے ساتھ گئی اور اس کی زندگی کی ہر اچھائی اور بُرائی سے اس نے اپنا رشتہ استوار رکھا۔ دراصل تھیلما اپنی پرستاری کے اس درجے پر پہنچی جہاں پوچے جانے والے شخص کی تمام کمزوریوں کو قطعی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ پھر جب ڈک نے ہر جانب سے ٹھوکر کھانکی اور تمام دروازے ایک ایک کر کے اس پر بند ہوتے چلے گئے تو اسے اس کمزور وجود کا خیال آ گیا جو اس کی ہر ٹھوکر اور بے زنجی کو برداشت کرتے ہوئے ہنستے مسکراتے ہر وقت اس کے ساتھ تھی۔ تھیلما کو اپنے باپ کی طرف سے ورثے میں دو مکانات اور خاصا بڑا بینک بیلنس ملا تھا ڈک کے کہنے پر نہایت مسرت سے وہ بینک بیلنس تھیلما نے ڈک کے حوالے کر دیا اور اس طرح ڈک نے اسے قانونی طور اپنی بیوی کا رتبہ دے دیا۔

اب وہ اس کی چوبیس گھنٹے کی ملازمت تھی جو گھر پر کام کے علاوہ ان بیرونی دوروں پر بھی ڈک کے ہمراہ رہتی جو وہ ”ڈک ماسٹر“ کی تیار کردہ مصنوعات کو تمام ملک میں متعارف کرانے کے لیے اپنی کار پر کیا کرتا تھا۔

ہمیشہ تھیلما گاڑی چلاتی اور ڈک ساتھ والی نشست پر سوار ہوتا یا لٹ کر آرام کرتا۔ کئی بار جب تھیلما تھک کر اور نیند سے بے حال ہو کر شکستہ ہو جاتی تو بے چارگی اور بے بسی سے مسکرا کر اپنے شوہر کو دیکھتی جو بڑے اطمینان سے ٹائلیں نشست پر پیارے دروازہ ہوتا۔ ایسے ہی ایک سفر کے دوران جب ڈک بہت دیر سے سو رہا تھا اور تھیلما مسلسل ڈرائیونگ کے باعث تھکن سے نڈھال تھی تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ تیز رفتار کار راستے کے کنارے لگے ہوئے ایک بجلی کے کھمبے سے جا کر ٹکی۔ گاڑی اگلی طرف سے بالکل بچک کر رہ گئی تھی مگر تھیلما کو بہت کم زخم

”تھیلدا! تمہارے دکھ کو کھتی ہے، ڈارلنگ! وہ تم سے قریب ہے..... بہت قریب۔“ وہ اپنا سر اس کے سر سے سینے میں چھپا لینا چاہتی تھی لیکن ڈک کے بے حس وجود پر برفانی خاموشی طاری رہتی وہ چاہا کرتا تھا کہ اس سے گزر کر یہاں سے چلے جانے کی خواہش کرے تنہائی کی یہ خواہش اگرچہ دل کی طہرت کے مطابق درست نہیں تھی کیونکہ بچپنی زندگی میں اس نے اپنے ارد گرد صرف اپنی ہی ذات میں تنہائی منہمک چہرے دیکھے تھے۔ وہ اپنے کھیل کا دشا تھا۔ تماشا لائی بغیر پلٹیں چھپکے، اس کی ہستی اس ڈوبے رہتے تھے اور وہ اپنے جہوم پر فاتحانہ شان سے چھایا رہتا تھا لیکن اب وہی ڈک ماسٹر..... ہزاروں دلوں پر حکومت کرنے والا شہنشاہ، ایک بے حس اور مجبور انسان کی حیثیت سے بستر پر لیٹا تھا اور ایسے عالم میں وہ قطعاً نہیں چاہتا تھا کہ اس کی حالت کو کوئی اور بھی محسوس کر سکے۔ وہ کسی کو اپنی بے چارگی پر رحم کھانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ حتیٰ کہ تھیلدا کو بھی نہیں۔ وہ اپنی بیوی کی مادرانہ محبت سے نفرت کرتا تھا۔ اس کی خوب صورتی، جوانی اور صحت سندی..... یہ سب کچھ ڈک کو ہر گز تھے اس کی دن بدن بڑھتی ہوئی قنوطیت کو تھیلدا کا روز افزوں حسن کسی ناز کی طرح کھلتا تھا۔ تھیلدا جب ڈک کو ملتی تھی تو ایک ڈبلی پیلی اور کمزوری کم سن لڑکی تھی مگر اب وہی کلی پھول بن کر کھل اٹھی تھی۔ شگفتہ اور شاداب عورت جس کے منتہاتے ہوئے حسن کی آنچ ہر لمحے ڈک کے وجود کو جلائے لگی تھی۔

”اوہ ڈارلنگ! آج تو تم پہلے کی بہ نسبت بہت اچھے دکھائی دے رہے ہو۔ میں تھیک ہی تو کہتی ہوں کہ تمہاری صحت پر بتدریج فرق پڑ رہا ہے اور بہت بدتر چلنے پھرنے چھی لگو گے..... بس باقاعدگی سے

کارگر نہیں تھی صرف سکون اور مستقل آرام ہی اسے صحت یاب ہونے میں مدد دے سکتے تھے۔“ ڈارلنگ.....“ تھیلدا اکثر اپنی نرم اور مہربان آواز میں اس سے کہتی۔ ”یہ کس قدر اذیت ناک ہے کہ تم سب کچھ دیکھ سکو سب کچھ سن سکو مگر کچھ کہہ نہ سکو۔ میں اس اذیت کو اس طرح محسوس کرتی ہوں جس طرح تم..... مگر پھر بھی تم انہیں حسیات کے باعث خود کو سب میں موجود سمجھا کرو۔ اس دنیا کی ہر چیز اب بھی اسی طرح تمہاری ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ تم اپنا ایاں بازو اب بھی استعمال کر سکتے ہو جلد ہی تم اس کے ساتھ خود کھانا کھانے لگو گے ورنہ وہ وقت بھی ضرور آئے گا۔ جب تم اسی طرح باقی سب کچھ بھی کرو گے اور تمام دلچسپیاں تمہارے لیے ہوں گی۔“

مگر تھیلدا کی ان تمام حوصلہ افزا باتوں کے جواب میں ڈک کے رگ دے میں جیسے نفرت اور طیش کی ایک آندھی سی چنے لگتی۔ اس کا ذہن شدت سے چاہتا کہ وہ تھیلدا کو مار ڈالے اس کی گردن دباوے یا بالکل اسی طرح جیسے مدح خانے میں بے شمار جانوروں کی گردن۔ ردینے کے بعد انہیں لٹکا دیا جاتا ہے۔ وہ تھیلدا کو نہ تو شوٹ کر سکتا تھا اور نہ ہی اسے کسی اونچی عمارت سے دھچکا دے کر گرا سکتا تھا۔ اسے تو جو کچھ بھی کرنا تھا، اپنے اسی دائیں ہاتھ کی مدد سے کرنا تھا۔

رفتہ رفتہ نفرت اور بے زاری کی آگ اتنی بڑھی کہ اکثر ایسے وقت میں ڈک کی آنکھوں میں بے چارگی کے آنسو تیر جاتے۔ اگر تھیلدا ایسے موقعوں پر قریب ہوتی تو وہ فوراً ہی معصومیت سے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیتی اور بڑی ہمدردی اور محبت سے بولے بولے اس کے کانوں میں کہتی.....

آئے جب کہ اس حادثے میں ڈک ماسٹر ونڈ شیلڈ سے باہر جا کر اور اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ اپنے زخموں کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو کر رہ گیا۔ اس کی گردن کی اگلی رگیں کاٹ دینی پڑیں جن کے باعث ڈک کی قوت گویائی بھی بالکل ختم ہو گئی تھی۔ اب وہ گوشت کا ایسا بے آواز ڈھیر تھا جو صرف اپنے ایک دائیں ہاتھ کو..... سب عادت حرکت دینے کی طاقت رکھتا تھا۔

اسپتال میں اپنے قیام کے دوران ڈک ہمیشہ ہی اپنے ملاقاتیوں اور دوست اسباب سے انتہائی بے زاری اور نفرت محسوس کرتا جو اسے اس طرح بے چارگی سے ایک جگہ لیٹے ہوئے دیکھ کر اس پر رحم کھاتے تھے اور اس کے بے حس و حرکت وجود کو بطور عبرت دیکھتے تھے۔

ڈک ایسے موقعوں پر ہمیشہ دیواری جانب دیکھنے لگتا اور ان کی موجودگی کے احساس کو میسر فراموش کر دیتا۔ اس وقت وہ ہمیشہ تھیلدا کے اس سادھی بٹ کے بارے میں سوچ کر سکون محسوس کریتا تھا جہاں وہ تنہا ہو گا۔ کوئی ملاقاتی کوئی رحم کھاتی نگاہ اس کے مفلوج جسم میں ششدر بن کر نہیں اترے گی۔ مگر اب وہ آبادی سے دور اس ویران فضا کے تنہا بٹ کو اپنے لیے ایک ایسے جیل خانے کا نام دے رہا تھا۔ جہاں اسے قید کر کے اور تمام انسانوں کو اس سے دور کرنے کے بعد گویا تھیلدا نے اپنے جرم کو اس چار دیواری میں چھپا لیا تھا۔

تھیلدا کا خیال تھا کہ ساحل کی تنہائی اور سکون ڈک کی حالت میں نمایاں تغیر کا سبب بنے گا اور رفتہ رفتہ وہ اپنی کھوئی ہوئی توانائی اور طقت دوبارہ بحال کرنے میں کامیاب ہو جائے گا کیونکہ اس کے معالج کی رائے میں اب کوئی بھی دوا اس کے لیے

مجھے اس کے متعلق سوچتے ہوئے خوف آنے لگتا۔ کہیں وہ اپنی ذات کو کوئی نقصان نہ پہنچا لے۔“

انے چند روز بعد کی تاریخ ڈال کر مزید لکھا۔

کاش میں بیرونی دنیا کی کسی ہستی تک پہنچ سکتا اور

ہستی کو اپنے ان جذبات سے آگاہ کر سکتا کہ تھیلما

ذہنی کشمکش روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ

... ٹوٹنے کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ کسی بھی لمحے

اپنے اس جذباتی ہیجان سے شکست کھا کر خود کو تباہ

رہے گی۔ کاش! میں کچھ کر سکتا اس کی بوب میں

ہی ہی میں میری طرف سے اس کی کوئی مدد ہو سکتی

شاید معاملات اس نازک صورت حال تک نہ

پہنچتے۔ ابھی کل ہی میں نے انہیں باتیں کرتے سنا

تھیلما کہہ رہی تھی کہ اب وہ مزید اس کشمکش میں

رہ نہیں رہ سکتی۔ بوب نے دعوت دی کہ وہ اس کے

تھ چلی آئے مگر تھیلما نے آنسو بہاتے ہوئے اس

بزرگ کو رد کر دیا ان دونوں کا خیال تھا کہ میں سوچنا

مگر میں سب کچھ سن رہا تھا اور کچھ بھی تو نہیں کہہ

تا تھا۔ پھر میں کچھ کرنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔

انے اپنے معاذ کو لکھا تھا کہ وہ یہاں کانچ میں

... بار مجھے دیکھنے کے لیے آجائے تاکہ اسی سے

تمام حالات کا اظہار کر سکوں۔ مگر تھیلما نے میرا وہ

سپر ڈاک کرنے سے انکار کر دیا۔ شاید اس وجہ

ہے کہ میں ان دونوں کے متعلق کسی دوسرے سے

خبر نہ کر سکوں۔“

ڈاک کئی ہفتے تک اپنی ڈائری کے صفحات کو اپنے

مفروضوں سے سیاہ کرتا رہا۔ یہ سب کچھ لکھنے کے

روز ڈائری کو اپنے تکیے کے نیچے چھپا لیتا۔ اس نے

بلکہ کیا تھا کہ منگل کی صبح اس کے لیے پچھ کر گزرنے

سچ وقت ہوگا کیونکہ ہر منگل اور ہفتے کے روز بوب

کے لیے سودا سلف لے کر آتا تھا۔

کی بیوی اور اس کا نیا عاشق بوب دوسرے کمرے میں سرگوشیاں کر رہے ہیں اور یہی نہیں بلکہ دونوں اس کی حالت زار پر قہقہہ بھی لگا رہے ہیں۔

اس کے بعد وہ سو نہیں پاتا تھا۔ تھیلما اطمینان سے اس کی آنکھوں کے سامنے موجود ہوتی تو بھی وہ اپنے قنوطی تصورات میں کھویا رہتا اسے ہمیشہ یہی محسوس ہوتا کہ اس کی بیوی محض اسے دکھانے کے لیے سونے کی اداکاری کر رہی ہے حالانکہ ابھی چند لمحے پیش تر ہی وہ بوب کے ساتھ دوسرے کمرے میں دائیٹس دے رہی تھی۔

ایک روز بوب کے جانے کے بعد ڈک نے تھیلما کے نام پیغام لکھ کر بوب کی بار بار آمد و رفت کی شکایت کر دی۔ تھیلما وہ کاندھ کا پڑزہ ہاتھوں میں پکڑے ساکت رہ گئی۔ اسے ڈک کے اس قسم کے خیالات نے گہرا صدمہ پہنچا تھا۔

”کیوں آخر..... ڈک! مجھے بتاؤ کہ بوب کیوں نہ آیا کرے؟ ایک وہی تو ہے جو اس تنہا مقام پر ہمارا غم گسار ہے۔“ منہ میں اور ہفتے کے روز وہ ہماری خبر گیری کرتا ہے اور یہ ہمارے لیے کس قدر ضروری ہے کہ میں تمہیں گھر پر تنہا چھوڑ کر خریداری کے لیے باہر نہیں جاسکتی۔ تم نے کبھی اس انداز میں بھی سوچا ہے؟“ ڈک کی آنکھیں تھیلما کے رد عمل سے غصے کی آگ میں جل اٹھیں۔ بالآخر اس نے دوسرے پڑزے پر لکھا۔

”میں اس شخص سے نفرت کرتا ہوں..... اور اب تم یہاں سے چلی جاؤ..... مگر جانے سے پہلے مجھے خواب آوروں کی ایک گولی دینی چاہنا۔“

”بہت اچھا“ تھیلما نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ ”مگر ڈارلنگ! ڈاکٹر نے کہا تھا کہ تم روزانہ دو استعمال نہ کرنا ورنہ اس کے عادی بن جاؤ گے۔“

ڈک نے گھور کر اپنی بیوی کو دیکھا اور اپنا دلایاں ہاتھ اٹھا کر اسے مزید گفتگو سے روک دیا۔ اس کی برہمی پر تھیلما نے گولی فوراً ہی اسے پکڑ لی تو وہ اسے اس وقت تک ہاتھ میں لیے رہا جب تک کہ تھیلما کمرے سے نکل نہیں گئی۔

پھر اس نے اسے بھی اپنے لفافے میں رکھی ہوئی پہلی گولیوں میں شامل کر لیا۔ ڈک کا پروگرام اب بوب تھا مہسن کا بھی اسی طرح احاطہ کر رہا تھا جس طرح اس نے تھیلما کو اپنے منصوبے کا شکار بنانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اس پروگرام کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے اپنی تنہائی اور علیحدگی کے اوقات میں اس نے ایک افسانوی طرز کی ڈائری لکھنا شروع کر دی۔ اس ڈائری پر پاک جگہ اس نے لکھا۔

”میں آج تھیلما کے لیے بے حد فکر مند ہوں۔ وہ بوب تھا مہسن میں کچھ عرصے سے جو دلچسپی لیے رہی ہے۔ اس نے تھیلما کی ذات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے میں نے اس کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ وہ مجھے گھر میں پزار بنے دے اور خود بیرونی دنیا میں ایک متحرک اور زندہ ہستی کی طرح شامل ہو جائے کیونکہ اس جیسی نوجوان اور حسین عورت کے لیے یوں ہر ایک سے کٹ کر گھر کی چار دیواری تک محدود ہو جانا انتہائی غیر فطری اور مشکل امر ہے لیکن تھیلما نے میری اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے شاید اس نے خود کو ایک ایسی عورت کا درجہ دینے کی کوشش کر رکھی ہے جو اپنے مفلون شوہر کے لیے ہی وقف ہو کر رہ گئی اور شاید یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ وہ خود کو میری اس حالت کی ذمے دار سمجھتی ہے وہ بوب کو چاہتی ہے۔ مگر اس چاہت پر وہ نہ صرف نادم ہے بلکہ کسی حد تک اپنی ذات کو مورد الزام قرار دیتی ہے کبھی کبھی تو اس کی یہ گفتگو اس قدر بڑھ جاتی ہے

پانی! اس نے اذیت سے سوچا۔۔۔ پانی یا کوئی دوسرا
ستال جس سے میرا سوکھا ہوا حلق تر ہو سکے۔۔۔ اس
نے مایوسی کے عالم میں ایک بار پھر قریبی میز کو ٹٹوٹا۔
اس بار ایک گلاس اس کے ہاتھ لگ گیا۔ لیکن گلاس
بھی خالی تھا۔ اس نے گلاس کو دیوار پر دے مارا اور وہ
چمکنا پور ہو گیا۔

اس نے گلاس کی طرح پُور پُور ہوتے ہوئے
حوصلے کو سنبھالنے کی کوشش کی اور میز کو ٹٹوٹا رہا۔
الکل کی بوتل اس کے ہاتھ کی پہنچ سے دور تھی۔ وہ
لاکھ کوشش کے باوجود بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔
بستر سے گر کر وہ میز کو الٹ دیتا اور یوں بوتل ٹوٹ
جاتی۔ وہ بے تابی سے ہاتھ کو حرکت دیتا رہا۔ پھر
اس کے ہاتھ سے کافی کی کیتلی کھرا گئی۔ ایک طویل
سانس لے کر اس نے کیتلی اپنی طرف گھسیٹ لی۔
لیکن کیتلی بھی خالی تھی۔ تھیلما نے کافی کی صرف دو
پیالیاں تیار کی تھیں۔

پھر اس کا ہاتھ اس پیالی سے نکلایا جسے ختم کرنے
سے پہلے ہی تھیلما خود ختم ہو گئی تھی۔ اس پیالی میں
ابھی آدھی کافی موجود تھی لیکن یہ کافی زہر آلودھی۔ اس
میں وہی زہر تھا جس نے تھیلما کی زندگی چھین لی
تھی۔ ذک کے اپنے ہاتھوں سے ڈالا ہوا زہر۔

کیا یہ نصف پانی میری مفلوج زندگی کو انجام تک
پہنچانے کے لیے کافی ہوگا؟ اس نے پیالی کو اپنے
پاؤں سے لپک لپک لاتے ہوئے سوچا اور پھر آنکھیں
بند کر کے زہریلا سیال غنا غٹ پیتا چلا گیا۔



”فورابوب کو بلاؤ۔ اس سے ایک بے حد ضروری
م۔۔۔ جاؤ۔۔۔ اٹھو۔۔۔ اور اسے بلاؤ۔“
کانڈ تھیلما کی آنکھوں پر رکھ کر ذک اسے جھنجھوڑتا
اور اس کے بال پوری طاقت سے کھینچتا رہا۔ مگر
بہ جیسے سب کچھ بے سود تھا۔ وہ واقعی سوچتی تھی۔
ہری نیند۔۔۔

بالآخر ذک سمجھ گیا کہ تھیلما اب کبھی نہیں اٹھے
۔۔۔ خیالوں کا ایک جھوم اس کے دماغ میں اتر آیا
۔۔۔ خدشات، ڈراؤنے، بھوتوں کی طرح اس کی
آنکھوں کے سامنے جسم ہو کر نکلے۔ لگے۔ اس کہیں
کسی کے آنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ گزشتہ کئی
توں سے تو کسی نے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا تھا۔
رف بوب آیا کرتا تھا اور اسے بھی تھیلما یہاں آنے
سے منع کر چکی تھی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی یہاں
ان کرے اور جواب نہ ملنے پر تشویش میں مبتلا ہو کر
نقبات کے لیے دوڑا چلا آئے؟ لیکن نہیں۔۔۔
بانتیں ہوگا۔ آخر کسی کو اسے فون کرنے کی کیا
رورت ہے؟

غذا کے بغیر میں کب تک زندہ رہ سکتا ہوں؟
اس خیال کے ساتھ ہی سب سے پہلا احساس
اس کی صورت میں سامنے آیا۔ اسے شدید پیاس
سوس ہو رہی تھی اس نے بستر کی قریبی میز کی طرف
نہ بڑھایا وہاں پانی موجود نہیں تھا۔ اس نے شکست
زدہ نگاہ سے کمرے کے کونے میں رکھے ہوئے
ملب کی طرف دیکھا۔ تھیلما نے ابھی اس میں بھی
نی نہیں ڈالا تھا۔ درندہ بستر سے گر کر گھسیتا ہوا اس
تک پہنچ جاتا۔

وہ کر بناک انداز میں اس وقت تک خالی جگہ کو
نور تارہا جب تک تھیلما کی سانسیں نہیں ڈک گئیں۔
مارے پیاس کے اس کا ہر حال تھا۔ ”آف خدا! آف خدا!

واقعی تم ٹھیک کہتے ہو اسے یہاں آنے کی کیا ضرورت
ہے؟ اس لیے میں نے بچنے کے روزے آئندہ کچھ
لانے اور یہاں آنے سے منع کر دیا تھا۔“

خوف اور دہشت کے ایک دھماکے نے ذک کے
بیدار ذہن کو ہلا کر رکھ دیا۔ کانپتے ہاتھ سے اس نے
اسی کانڈ پر جلدی جلدی لکھا۔

”پھر ہماری ضرورت کی اشیاء کون لایا کرے گا؟“
تھیلما نے خواہیدہ نظروں سے کانڈ کو دیکھا اور
اس طرح سر بلانے لگی جیسے گہری نیند کے جھونکے
سے جاگنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”مجھے سخت نیند آرہی ہے ڈارلنگ! معلوم نہیں تم
کیا کہنا چاہتے ہو مگر اب مجھ سے کچھ بھی بڑھا نہیں
جا رہا ہے۔ میں سو کر انھوں کی تویات کروں گی۔“ اس
نے بہت ذک رک کر اپنی بات مکمل کی تھی۔ کافی کی
آدھی پیالی وہ اپنے حلق میں اتار چکی تھی اور اب ذک
کے سینے پر سر رکھے اور آنکھیں بند کئے بیٹی ہوئی تھی۔
ذک نے اس کے لیے بال اپنی قمی میں دبا کر
کھینچے تو تھیلما نے نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف
دیکھا۔

”کیا بات ہے ڈارلنگ؟“ اس کی آواز بے حد
دستی تھی۔ بالکل سرگوشی جیسی۔۔۔ اور اگلے ہی لمحے
اس کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں بڑی ہی دقت سے
ذک نے ایک مرتبہ پھر اسے جھنجھوڑ کر جگایا اور کانڈ پر
لکھے ہوئے پیغام کو پڑھنے کے لیے مجبور کیا۔

”کوئی نہیں لائے گا ڈارلنگ!۔۔۔ کوئی نہیں۔۔۔
پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی جا کر
لے آ یا کروں گی۔“ تھیلما نے بھاری لہجے میں چند
غنودہ الفاظ ادا کیے۔ اس کی سانسیں اب کمزور اور بے
ترتیب محسوس ہو رہی تھیں۔ تیزی سے ذک نے ایک
اور پیغام لکھا۔

نی لگی تھی کہ ذک نے عینکے کے نیچے سے قم اور کانڈ
نکال کر لکھا۔

”تم نے چوہا بند کر دیا ہے تھیلما؟ کسی چیز کے
جلنے کی کو آ رہی ہے۔“

تھیلما یہ تحریر پڑھ کر مسکرا دی۔ ”میرا خیال ہے
چوہا بند ہے اور میں نے اس پر کچھ نہیں رکھا مگر
احتیاطاً میں ایک بار پھر دیکھ آتی ہوں۔“ وہ جونہی
دروازے سے باہر گئی ذک نے فوراً ہی صوف کا لفافہ
نکالا اور تھیلما کی کافی میں انڈیل کر شکر ڈال دی۔

”ہر چیز بالکل ٹھیک ہے ڈارلنگ! کچھ بھی تو نہیں
جل رہا۔“ وہ مسکراتی ہوئی اس کے پاس واپس آ گئی۔
ذک نے کانڈ کا ایک اور پرزہ اٹھایا اور لکھنے لگا۔

”میں آج بہت خوش ہوں۔ آؤ اس خوشی کو دو بالا
کرنے کے لیے اپنی کافی میں تھوڑی سی الکل ملا کر
ایک نیڈا لٹھ چھیں۔“

تھیلما نے محبت سے اپنا رخسار ذک کے چہرے
سے لگا دیا۔ ”تمہاری خوشی کے اس اظہار سے مجھے کتنا
سکون ہوا ہے۔“ اس نے سرگوشی کی اور پھر الکل کے
چند قطرے دونوں پیالیوں میں ڈال دیے۔ ذک کو
اطمینان ہو گیا کہ اسے کافی کے ذائقے کی تبدیلی کا
احساس نہیں ہوگا۔ تھیلما نے اپنی پیالی ذک کی پیالی
سے یوں نکلادی جیسے وہ کافی کی پیالیاں نہیں شراب
کے پھلکے ہوئے جام ہوں۔ ”ہم دونوں کے روشن
اور پر مسرت مستقبل کے نام ڈارلنگ!“ وہ مصومیت
سے آنکھیں بند کر کے بڑبڑائی۔

صرف میرے نام اور میرے مستقبل کے
نام۔ ذک نے فاتحانہ انداز میں سوچا۔

کافی کا ایک گھونٹ لے کر تھیلما نے کہا۔ ”میں
نے تمہارے کہنے کے مطابق اس بات پر بہت غور کیا
ہے ڈارلنگ! میرا مطلب ہے بوب کے متعلق۔۔۔



راحیلہ تاج

افسانہ نگاری ایک فن ہے، کسی بھی ادیب کو کہانی لکھنے کے لیے ایک پرسکون ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ قلم و ذہن کا آپس میں ایک سمبھد ہونا ہے۔ یہ دونوں اگر الجھنوں کا شکار ہوں تو پھر کوئی افسانہ تخلیق نہیں ہو سکتا۔

ایک ادیب کا فنانس اے مجھے ہوئے دل و دماغ کے ساتھ کہانی مکمل کرنی چاہیے۔

دن بھر کا تھکا ہارا سورج دور پہاڑیوں کے پیچھے آرام کر رہا تھا۔
محسن میں سناٹا تھا۔ اس کی بیوی مسہری پر تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ ان تکیوں کی وجہ سے وہ بڑا سکون اور آرام محسوس کر رہی تھی اور وہ خود سامنے میز کے پاس سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے سادہ کاغذ رکھے ہوئے تھے۔ وہ بے خیالی میں قلم ہاتھ میں تھامے، خلا میں گھور رہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ کاغذ پر آڑے ترچھے خطوط کھینچنے شروع کر دیے۔ اس وقت وہ ایک نئی کہانی لکھنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں کہانی کا خاکہ موجود تھا لیکن اس کا آغاز کہاں سے کیا جائے؟ یہ ابھی تک اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کش مکش میں اس کی کئی شاخیں گزر گئی تھیں لیکن نقطہ آغاز ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دراصل حرف آغاز ہی اس کے لیے مشکل ہوا کرتا تھا۔ کہانی تو دو ایک دنوں میں ہی مکمل ہو جاتی تھی لیکن نقطہ آغاز کی تلاش میں اسے کئی بیٹے لگ جاتے اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ مفتوں کی ذہنی کش مکش کے باوجود نقطہ آغاز بھائی نہیں دیتا، پھر تنگ آ کر اس کہانی کو وہیں چھوڑ دیتا۔ اس طرح اب تک اس کے ذہن میں ایسی کئی نامکمل کہانیوں کے خاکے اپنے نقطہ آغاز کے انتظار میں تھے۔
اس کی بیوی دل کی مریضہ تھی اور ہر دوسرے

کے سامنے کھڑی ہو جاتی اور کہتی کہ..... میرے پیارے ادیب! مجھے لکھو، کہیں سے بھی لکھو، کہیں سے بھی آغاز کرو۔ میرے حسن میں کوئی فرق نہیں پڑے گا اور پھر اسے اس وقت ہوش آتا جب تمام سادے کاغذ اس کی تحریروں سے بھر چکے ہوتے۔
اس کی بیوی درتچے کے پار افق کے کناروں کو دیکھ کر جارتی تھی۔ مرغابیوں کی قطاریں اڑی چلی جا رہی تھیں۔ اس کی بیوی نے ہلکے سے کمرٹ بدلی اور جیسے اس کا دل ٹکراتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اس طرح بولی جیسے سرگوشی کر رہی ہو۔
”پھر اندھیرا چھاتا جا رہا ہے۔“
کمرے کے خانے میں ہلکی سی بل جھل جھل ہوئی لیکن وہ کاغذ کے سامنے اسی طرح دم بخود بیٹھا رہا۔ اس فقرے سے لاشعوری طور پر اسے یہ خیال آیا کہ تھوڑی دیر میں اندھیرا پھیل جائے گا اور وہ نہیں لکھ سکے گا۔ اس نے قلم میز پر رکھ دیا اور کاغذ کے ذخیرہ میں روشنی کا سوچ تلاش کرنے لگا۔ پھر سوچ دباتے ہی کمرہ روشنی سے معمور ہو گیا اور وہ اپنے خیالات میں غرق ہو گیا۔
اس کی بیوی بولی۔ ”کیا مجھے چائے کی ایک پیالی مل جائے گی۔“
وہ خاموشی سے اٹھا۔ چائے دانی سے کپ میں چائے ڈال کر وہ اپنی بیوی کی مسہری کے پاس آیا اور کپ لے کر تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ اس کی بیوی اور کپ کے درمیان صرف چند قدموں کا فاصلہ تھا لیکن اس نے کپ نہیں لی بلکہ خاموشی سے کپ کو گھورتی رہی۔
”کیا ہو گیا نہیں؟“
”نہیں۔“
”پھر اس طرح کیوں کھڑے ہو؟“
”کیا کہوں، کچھ ہو بھی تو ہوں یہ لو اپنی چائے۔“
”تم اس طرح میرا کام کرتے ہو جیسے تمہیں اس کے لیے مجبور کیا جا رہا ہو۔“
”نہیں تو۔ میں خوشی کے ساتھ تمہارا کام کرتا ہوں۔“
”سچ کہتے ہو۔ میں بیمار ضرور ہو گئی ہوں لیکن تمہارے لیے میرے دل میں اتنی محبت ہے جتنی شادی کے پہلے دن تھی۔“
وہ ان بے جان باتوں سے کسی قدر اکتا چکا تھا۔ کپ کو بیوی کی مسہری کے قریب تپائی پر رکھ دیا اور اپنی میز کے پاس کرسی پر بیٹھ کر وہ سوچنے لگا۔ کہانی کا ہیرو ادارہ ترقیات کا کلرک ہے اور وہ رشوت ستانی کے ایک مقدمے میں ماخوذ ہو جاتا ہے۔ اس مرحلے پر اس کی بیوی کی بڑ بڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔
”تم اب بدل چکے ہو۔ میرا جواب تمہارے لیے ایک بوجھ ہے۔ تم اپنی اس سرمدہری پر افسوس بھی محسوس نہیں کرتے۔ ذرا ان دنوں کے بارے میں سوچو جب تم میرے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ وہ دن بھی کیا تھے میں ان دنوں کو بھی نہیں بھول سکتی۔“
وہ اپنے شوہر کے خلاف ناراضی بلکہ عدم اطمینان کا اظہار کر رہی تھی۔ اس لیے اس نے غلط فیصلوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔ ”تم اس قسم کی باتیں کیوں سوچتی ہو۔ میں ذرا اپنے کام میں مشغول ہو گیا تھا اس لیے خاموش تھا۔ تم اس طرح پریشان نہ ہوا کرو۔ لو چائے پیو۔“ یہ کہہ کر اس نے چائے کا کپ اپنی بیوی کے ہونٹوں سے لگا دیا۔
اس نے سمجھا اب اس کی بیوی مطمئن ہو چکی ہو گی۔ اس لیے وہ دوبارہ اپنی کہانی میں جت گیا۔ ہاں تو بے جا رک رشوت ستانی کے چکر میں پھنس جاتا ہے۔ پھر کوئی حاتم طائی اس کی مدد کے لیے آتا ہے اور پھر..... پھر..... اسی وقت اس کی بیوی کی آواز آئی۔

”میرے سینے میں درد ہو رہا ہے۔ کیا یہ کینسر کی علامت ہے؟“
”مجھے نہیں معلوم۔“
”جنہیں کینسر کی شکایت ہوتی ہے کیا ان کے سینے میں اس طرح کی جھپٹ ہوتی ہے؟“
”مجھے پتا نہیں۔“

”آخر تمہیں کس چیز کا پتا ہے۔“ وہ جل کر بولی۔
اس نے بیوی کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اب وہ کہانی میں بری طرح مصروف ہو چکا تھا۔ کہانی آہستہ آہستہ دل فریب پیکر بنتی جا رہی تھی۔ اب صرف قانونی الجھنوں کو سلجھانا باقی رہ گیا تھا۔ فرض کرو یہ رشوت کسی غمگین کے سلسلے میں یا پھر..... اسی لمحے اس کی بیوی کے خیالات کا سفر اس کی زبان کے ذریعے جاری تھا۔

”ہائے! وہ دن بھی کیا تھے جب ہم دونوں پارک میں گھوما کرتے تھے۔ پھر درختوں کے نیچے سستانے کے لیے بیٹھ جاتے۔ گرے ہوئے خشک پتوں پر ایک دوسرے کو خط لکھتے۔ تمہیں یاد ہے نا۔۔۔ اور کبھی کبھی ہم گھوڑا گاڑی میں بھی سیر کیا کرتے تھے۔ اب پارک جانا ہمارے نصیب میں کہاں؟“

وہ اپنی بیوی کے خیالات سے کافی دور اپنی کہانی کے تانے بانے میں لگا ہوا تھا۔ اس کی بیوی نے محسوس کیا اور زور سے بولی۔ ”تم سن رہے ہو؟“
”کیا تم نے مجھ سے کچھ کہا۔“ اس نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

”ہاں! تو اور کس سے کہہ رہی ہوں۔“ وہ بے زار ہو کر کہنے لگی۔ ”میں پوچھ رہی ہوں کہ ہم گھوڑا گاڑی میں کب سیر کریں گے؟“
”جب تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔“
”میں تو نہ جانے کب ٹھیک ہوں گی۔ پتا نہیں

ٹھیک ہوتی بھی ہوں یا نہیں۔ کیا بیٹے ہوئے خوش گوار دن بھی لوٹ کر نہیں آتے۔ کیا بہار کا موسم اسی طرح خاموشی سے گزر جائے گا۔ اگر مجھے سچ کینسر ہو گیا ہے تو شاید اس موسم بہار کے ساتھ ساتھ مجھے بھی رخصت ہونا پڑے۔“

”آخر تم ایسی سنگدلانہ باتیں کیوں سوچتی ہو۔ تم بستر پر آرام سے سو کیوں نہیں جاتیں۔ تم خوشحال اور بے کار باتیں سوچنا بند کرو وہ تو جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گی اور ہم دونوں گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر سیر کو جایا کریں گے۔“

وہ بڑے دھیان سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ ابھی اس نے باتیں ختم کی تھیں کہ وہ بول اٹھی۔
”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تم میرے قریب آ کر بیٹھ جاؤ۔“

”وہاں بیٹھوں یا یہاں بیٹھوں۔ بات تو ایک ہی ہے۔“
”نہیں میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“

”تمہیں پتا ہے کہ میں کچھ کھڑا ہوں۔“
”ہاں معلوم ہے مگر پھر بھی دل چاہتا ہے کہ تم میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ اور پیاری پیاری باتیں کرو۔“
وہ تمام کوششوں کے باوجود غصہ ضبط نہ کر سکا۔
بیٹے دنوں کی باتیں کر کے کیا مل جائے گا۔ کوئی کام کی بات کرو۔

وہ میز پر اور جھک گیا۔
”کلرک نے رشوت کیوں لی؟“ اس نے خود سے سوال کیا اور پھر خود ہی جواب دیا۔
”یقیناً معاشی بدحالی کی وجہ سے۔“
اب پوری کہانی مکمل ہو چکی تھی۔ صرف اس کا لکھنا باقی رہ گیا تھا۔ اب اسے کوئی الجھن نہیں اس

نے بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے مسکراہٹ کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی آفاقی نغمہ سن رہی ہو۔ اس کی آواز میں بھی نغمہ کی تھی۔

”میرا ننھا آگیا۔ میرے پاس۔“
وہ اس کی آواز پر لرز کر رہ گیا۔ اسے اپنی بیوی کا چہرہ اجنبی محسوس ہوا۔
”تم نے کیا کہا؟“

”میں نے لہبا میرا ننھا میرے پاس آ رہا ہے۔“
”ارے تم نے پھر اس کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔“

”ہاں! میں تو خواب دیکھ رہی تھی۔ اب یہ بتاؤ کہ ہم اس کی قبر کو کب پختہ بنائیں گے۔“
”تم ٹھیک ہو جاؤ گی تو اس کے بعد۔“ اس کے لہجے میں سختی جھلک رہی تھی لیکن چہرے پر غم کے اثرات نمایاں تھے۔

”ہاں۔ ہاں۔“ وہ بڑے غور سے کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ ”پھر ہم اس کی قبر پر سنگ مرمر کا کتبہ لگوائیں گے۔ بھلا یہ کتبہ کتنے میں بن جائے گا۔“
”تم ابھی یہ بات نہ سوچو۔ اس کے لیے کافی وقت پڑا ہے۔ میں آج رات ہی یہ کہانی مکمل کرنا چاہتا ہوں تاکہ کل رسالے کے ایڈیٹر کو دے سکوں۔“

لیکن اس کی بیوی پر ان الفاظ کا کوئی اثر نہیں ہوا وہ اپنے خیالات کی وادیوں میں اسی طرح خراماں خراماں رہی۔

”میں تمہاری ایک بھی نہیں سنوں گی۔ ارے آج کون سی تاریخ ہے ابھی تو چاندنی رہے گی۔ آج تم نے اتنی جلدی روٹی کیوں کر دی۔ خدا کے لیے اٹھ کر بھا دو اور کھڑکی کے پردے ذرا سرکا دو۔ آج چاند دیکھنے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔“

اس کا ضبط اب آخری حدوں پر تھا۔ کرسی سے اٹھ کر غرایا اور بولا۔ ”تم سکون سے سو جاؤ۔ کبھی میری بھی سن لیا کرو۔ تم ان چیزوں کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔“

”کوئی پروا نہیں۔ تم ذرا روشنی بجھا دو۔ چند لمحوں کے لیے۔ میں چاندنی دیکھنا چاہتی ہوں اور پھر بڑے سکون سے سو جاؤں گی۔ میں تمہارے پاؤں پتی ہوں۔ میرا دل نڈھرو۔“

اس نے اٹھ کر ایک کونے کی اور لٹھریوں کے پردے سرکا دیے تاکہ تازہ ہوا اندر آ سکے اور آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔

پھر جب اسے تھوڑی دیر بعد ٹھنڈک محسوس ہوئی تو اس نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ پردے برابر کر دیے اور روشنی جلا کر بڑی خاموشی کے ساتھ بیٹھوں کے بل چٹا ہوا بیوی کے بستر کے قریب گیا۔ وہ بڑے آرام اور سکون سے سو رہی تھی۔ اس نے جب اسے غور سے دیکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ابھی تک پارک کے بارے میں سوچ رہی ہے یا خواب دیکھ رہی ہے جہاں وہ ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی ہے اور اس کا پاؤں ذرا سا اوپر اٹھا ہوا ہے اور اس نے اس کے سینڈل اتار لیے ہوں۔

اور پھر اسے یہ بھی محسوس ہوا جیسے وہ سوچ رہی ہو کہ وہ گھوڑا گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے جو دور سے پتھروں سے معلوم ہوتی ہے یا پھر جیسے وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر فضاؤں میں ننھے کی قبر کی طرف اشارہ کر رہی ہو۔

اس نے ٹھنڈی سانس لی اور اس کے شانوں کے نیچے بڑی آہستگی سے ٹکے رکھ دیے۔
وہ بڑی خوب صورت، دلکش دکھائی دے رہی تھی۔



کرم

ابو اوصاف ایم ایے

دنیا میں فسار کا محک زن 'زن' زمین رہی ہے۔ دنیا کا پیلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ تھا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے پیش تر کردار ابھی تک بقیہ حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر چکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کر دی ہے۔

محبت کی روایتی تکیوں سے شروع ہونے والی یہ خوبی داستان جوں جوں آگے بڑھتی ہے کہانی سے جڑے کرداروں کو کسی عفریت کی طرح نکلتی جاتی ہے۔ اس میں کریم سیاست دانوں کی نقاب کشائی نہایت مہارت کے ساتھ کی گئی ہے کہ کیسے وہ وطن عزیز کی چیزیں کھوکھلی کرنے کے ساتھ ساتھ عوام کیلئے والے مجبور و مقبور طبقے کے بنیادی حقوق کا استحصال کرتے چلے آ رہے ہیں۔ گفتار کے یہ غازی کیسے عوام کو سبز باغ دکھا کر ان کی عزت و جان اور مال و متاع کے سونے وطن دشمنوں سے کرتے ہیں۔ اپنے مفادات کی خاطر کیسے گروٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ ان کے وعدے ہائی پرکھنچیں گئی لکھن کی طرح نا پائیدار ہوتے ہیں۔ اس طویل داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں کہیں مجبوری ہے ہنسی اور فلسفے کی سسکیاں سسکتی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کریں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھلنا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر مانتا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

خیر اور ایشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی نئی سلسلے مارکیٹ

بابا جو یزید حد تک میری گفتگوں کو معاملے کی تہہ تک پہنچ چکے تھے۔ بولے۔ ”کیا تم اب بھی میری بات ماننے سے انکار کرو گے؟ اب تو وہ لوگ کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔“

”بے شک آ گئے ہیں۔“ میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ”لیکن میں پھر بھی گاؤں چھوڑ کر نہیں بھاگوں گا۔ یہیں رہ کر ان لوگوں کا مقابلہ کروں گا۔“

”یہ مقابلہ نہیں خود کشی ہوگی۔“ بابا نے جھنجھلا کر کہا۔ ”تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟ میں کہتا ہوں بہن کو لے کر نکل جاؤ یہاں سے۔“

”نہیں! میں نہیں جاؤں گا۔“ میں نے قطعی انداز میں کہا۔ ”پہلے تو شاید آپ کی مان کر چھا بھی جاتا مگر

اب جب کہ انہوں نے دھمکی دے دی ہے تو میں یہ بزدلوں والا کام نہیں کروں گا۔“

بابا نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”یہ دیکھ بیٹے! میں تیری منت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ! کہیں بھی چلے جاؤ! بے شک میری نگاہیں تم لوگوں کو نہیں دیکھ سکیں گی مگر تم لوگ زندہ تو رہو گے ناں! میرے لیے یہی کافی ہے۔“

میں نے استدعا کی۔ ”پلیز بابا! آپ مجھے مجبور نہ کریں۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں نے شیر زادہ خٹک کے خلاف قتل کی رپورٹ درج کرا دی ہے۔ اب وہ بچ نہیں سکیگا۔“

”تم جاگتے ہوئے خواب دیکھ رہے ہو شیر زادہ

دے چکے ہیں۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔
ہمارے ساتھ ساتھ یہاں تمہاری جان کو بھی خطرہ
ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔“
”کس نے دھمکی دی ہے تمہیں؟“ اس نے
استفسار کیا۔

”اس نے اپنا نام فتح خان بتایا ہے لیکن میں اسے
نہیں جانتا کہ وہ کون ہے اور کس کے لیے کام کرتا
ہے۔ بہر کیف اتنا تو طے ہے کہ وہ شیر زادہ خٹک یا
پھر سردار شیر افضل خان کا آدمی ہے اس نے مجھے
شیر زادہ خٹک سے صلح کرنے کے لیے کہا ہے۔
بصورت دیکھو تو سچ چھوڑنا ہے تاکہ ہم دیا بے اور جان
سے مار ڈالنے کی دھمکی دی ہے۔ سوچنے کے لیے اس
نے مجھے تین روز کی مہلت دی ہے۔ میں نے یہ فیصلہ
جواب دیا۔

”میں پاپا سے بات کر کے معلوم کرتی ہوں کہ یہ
فتح خان کون ہے؟“
انہیں رہنے دو میں خود ہی معلوم کر لوں گا یہ
کون ہے۔“
وہ پرزور انداز میں بولی۔ ”اس نے تمہیں جان
سے مار ڈالنے کی دھمکی دی ہے۔ پاپا سے بات کرنا
بہت ضروری ہے۔ وہ اپنے ذرائع سے فوراً معلوم
کر لیں گے کہ یہ فتح خان کون ہے اور کس کے لیے
کام کرتا ہے؟“

”میں تم ایسا کچھ بھی نہیں کروں گی۔ یہ میری جنگ
ہے جسے میں خود لڑوں گا۔“ میں نے نفی میں سر ہلاتے
ہوئے جواب دیا۔
”یہ ہم سب کی جنگ ہے شاہو اور ہم نے مل کر
لڑنی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پاپا قانونی معاملات
میں ہماری بھرپور مدد کریں گے۔“
”اپنے پاپا سے غلط تو قہات وابستہ نہ کرو۔ وہ ہم

یقین نہیں ہے کہ وہ ایسا کر پائیں گے؟“
وہ بولی۔ ”نہیں پاپا اور جینی میں سے کسی ایک کا
انتخاب کرنا پڑے گا۔“
”اگر انہوں نے پاپا کا انتخاب کیا تو پھر تم کیا
کرو گی؟“

”میں ان سے قطع تعلق کر لوں گی۔“ اس نے
روانی سے جواب دیا۔
”کس لیے میری خاطر؟“ میں نے متحیر انداز
میں سوال کیا۔

”میں تمہاری خاطر چند تم سب کی خاطر پاپا نے
اگر تم لوگوں کو سپورٹ نہ دی تو میں یہاں سے کبھی بھی
واپس نہیں جاؤں گی اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“
”تم بہت غلط کر رہی ہو مشی! اس طرح راجا
صاحب کبھی بھی ہمارا ساتھ نہیں دیں گے بلکہ الٹا
ہمیں اپنا دشمن سمجھنے لگیں گے۔“

اس نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔ ”تو پھر
میں کیا کروں؟ میں تم لوگوں کو بے بارہ مددگار نہیں
چھوڑ سکتی۔ اس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی راستہ
نہیں ہے۔“

”راستا ہے مشی!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور
دیتے ہوئے کہا۔ ”تم راجا صاحب کے ساتھ رہ کر
بہتر انداز میں ہماری مدد کر سکتی ہو۔ تم ان کی اکلوتی بیٹی
ہو! انہیں جان سے زیادہ پیاری ہو! وہاں جا کر تم انہیں
ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ کر سکتی ہو۔ تم ان سے اپنی
بات منوانے کے لیے بھوک بڑھال کر سکتی ہو! انہیں
جان سے لڑ جانے کی دھمکی دے سکتی ہو۔ جب کہ
یہاں رہ کر تم کچھ بھی نہیں کر سکتی ہو۔“

”ٹھیک ہے میں سوچوں گی۔“
”میں نے کہا۔“ سوچنے کا وقت ہی تو نہیں ہے
ہمارے پاس۔ وہ مجھے جان سے مارنے کی دھمکی
خٹک کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوگی البتہ
تیرے خلاف ضرور ہوگی۔ میرا کہنا نہ مان کر تم بہت
بچھڑاؤ گے۔“
دیر تک بابا کی منت سماجت جاری رہی مگر میں
نے گھر چھوڑ کر بھاگنے سے قطعی انکار کر دیا۔ آخر کار
بابا نے مجھے میرے حال پر چھوڑتے ہوئے چپ
سادھ لی۔ دن کا بقیہ حصہ میں نے تعزیت کے لیے
آنے والے لوگوں کے ساتھ گزار دیا۔ اس دوران
مشی گھر کے اندر کڑھ اور دھری ایستہ باہر والی خالہ
کے ساتھ رہی تھی۔ شام کے وقت جب بس کی اور
میری ملاقات ہوئی تو وہ قدرے پریشان نظر آ رہی
تھی۔ میں نے پریشانی کا سبب پوچھا تو بولی۔ ”پاپا کا
دو مرتبہ فون آچکا ہے وہ مجھے فوراً واپس آنے کے لیے
کہہ رہے ہیں لیکن میں نے انکار کر دیا۔“
میں نے کہا۔ ”یہ تم نے اچھا نہیں کیا؟ راجا
صاحب یقیناً مجھے ہی مورد الزام ٹھہرائیں گے۔ بہتر
ہوتا اگر تم واپس چلی جاتیں۔ یہاں رہ کر بھی تم
میرے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔ وہاں کم از کم
راجا صاحب پر زور تو ڈال سکتی ہونا؟“
وہ بولی۔ ”میں ضرور واپس جاؤں گی مگر اس وقت
جب شیر زادہ خٹک گرفتار ہو جائے گا۔ میں نے پاپا
کے سامنے بھی یہ شرط رکھی ہے کہ وہ شیر زادہ خٹک کو
گرفتار کر دیں تو میں واپس آ جاؤں گی بصورت دیگر
میں کبھی بھی واپس نہیں جاؤں گی۔“
”میں تمہارے خلوص کی قدر کرتا ہوں مشی لیکن
جو تم سوچ رہی ہو وہ کبھی بھی ہو سکتا۔ راجا
صاحب اپنی پارٹی کے مفاد کے خلاف کوئی قدم نہیں
اٹھا سکتے۔ اسی پارٹی کی وجہ سے ہی تو انہیں یہ مقام و
مرتبہ حاصل ہے۔ انہیں اگر اپنی سیاسی پارٹی کی
سپورٹ حاصل نہ ہو تو کون ان کی سنے گا؟ مجھے بالکل

میں نے کہا۔ ”میں ان کی گیلڈر بھکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ مجھے ایک صحافی دوست مل گیا ہے۔ مجھ پر اگر کوئی آج آئی تو وہ میڈیا کے ذریعے ایک ہنگامہ مگھڑا کر دے گا۔ تم بے فکر رہو وہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔“

”ٹھیک ہے لیکن اس وقت کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے استفسار کیا۔

”پولیس اسٹیشن تک جا رہا ہوں۔“

”اوکے میں بھی ساتھ چلوں گی۔“ اتنا کہہ کر وہ میرے ساتھ ہی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا۔ ”تم گھر میں رہتیں تو بہتر تھا۔ تمہارا بار بار میرے ساتھ پولیس اسٹیشن جانا کچھ اچھی بات نہیں ہے۔ یہاں کے لوگ بہت زیادہ دقینوسی خیالات رکھتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی تمہاری طرف اٹکی اٹھائے۔“

”میں ان باتوں کی پروا نہیں کرتی اب چلو۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

پولیس اسٹیشن پہنچ کر جو منظر میں نے دیکھا اس نے میرے تن من میں آگ لگا دی۔ شیر زادہ خٹک جو پانچ روزہ ریماڈر پر تھا وہ تھا نے کی حوالات میں بیٹھا شام کی چائے سے محفوظ ہو رہا تھا۔ لاک اپ کے سامنے تھانہ انچارج انور خان کرسی ڈالے اس سے یوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا جیسے شیر زادہ خٹک قتل کے مجرم کے بجائے کوئی آئی پی ہو۔ وہ ایک سب چائے کا لیتا اور پھر کپ رکھ کر انور خان سے باتوں میں مصروف ہو جاتا۔ کبھی وہ پلیٹ میں بڑی ہوئی مٹھائی کا بھی ایک آدھ کھڑا اٹھا کر منہ میں ڈال لیتا تھا۔ انور خان کے ہاتھ میں بھی چائے کا کپ موجود تھا۔ اس وقت وہ دونوں ایک دوسرے

زادہ خٹک کو قمر اور واقعی سزا دلانے کے لیے میں اپنے ذرائع استعمال کر رہا تھا۔

اس معاملے میں الجھ کر میں فتح خان کی دھمکی کو بھول گیا تھا۔ ویسے بھی میں نے اس کی دھمکی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ جو اسے یاد رکھتا۔ میں اس کی دھمکی کو محض گیلڈر بھکی ہی سمجھا تھا اور یہی میری سب سے بڑی بھول تھی۔ جس کا خمیازہ مجھے ایک عمر تک بھگتنا پڑا۔ میں ایک معزز ڈاکٹر سے قاتل اور مفرور بن گیا۔ میری گرفتاری پر حکومت وقت کو انعام مقرر کرنا پڑ گیا اور میں یوں اپنے علاقے سے در بدر ہوا کہ گاؤں کا راستا تک بھول گیا۔ کاش کہ میں نے اس وقت فتح خان کی دھمکی کو منجھیدگی سے لیا ہوتا تو آج حالات تبدیل ہوتے۔ کم از کم فائرہ اور بابا تو زندہ ہوتے۔

کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ شاید مجھے نافرمانی کی سزا ملی ہے۔ بابا کا کہنا مان کر شاید میں نے خود ہی عذاب الہی کو دعوت دی تھی۔ میں نے بوڑھے باپ کا دل دکھایا تھا۔ جس کی مجھے بہت ہی بھیا تک سزا ملی تھی۔

یہ جو تھے روز کا ذکر ہے تقریباً عصر کے وقت میں نے منشی کی گاڑی نکالی اور تھانے کی طرف روانہ ہونے ہی والا تھا کہ عین اس وقت منشی نازل ہو گئی۔

”یہ تم اس وقت کہاں جا رہے ہو اور وہ بھی اسکے؟“ جب کہ دشمنوں کی طرف سے تمہیں مار ڈالنے کی دھمکی بھی مل چکی ہے۔“

”تم کیا چاہتی ہو کہ میں ان کی دھمکیوں کے خوف سے گھر میں چھپ کر بیٹھا رہوں؟“ میں نے طنز یہ انداز میں استفسار کیا۔

”نہیں لیکن احتیاط کرنا تو ضروری ہے ناں؟ وہ کبھی بھی وار کر سکتے ہیں۔ اب تو شیر زادہ خٹک بھی گرفتار ہو چکا ہے۔ ان کا غصہ تو آسمان کو چھو رہا ہوگا۔“

کچھ میں تمہاری خاطر کر رہی تھی۔“

میں نے گڑبڑا کر کہا۔ ”پلیز مشی! مجھے غلط مت سمجھو دراصل میں تم کو کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا ورنہ کبھی تمہیں واپس جانے کے لیے مجبور نہ کرتا۔ یہ سب کچھ میں نے تمہارے بھلے کے لیے کہا ہے۔“

وہ بولی۔ ”میرا اجملا یہاں رہنے میں ہے اور ویسے بھی اب تو پاپا کی دھمکی کے بعد میرا یہاں رہنا ضروری ہو گیا ہے۔ شاید پہلے میں پاپا کی بات مان کر چلی بھی جانی مگر اب یہ ناممکن ہے۔“

میں نے منشی کو کافی دیر تک سمجھا یا مگر وہ اپنی ضد پر ڈٹی رہی تو میں نے بھی سب کچھ حالات پر چھوڑ دیا۔ ویسے بھی وہ میری ہاں مہمان تھی اور مہمان کو زبردستی گھر سے کوئی بھی نہیں نکالتا۔ میرا تعلق تو اس قوم سے تھا جس کی مہمان نوازی تاریخ کا حصہ ہے۔ میں کیسے یہ قدم اٹھا سکتا تھا؟ سو میں نے منشی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

تین دن بخیر و عافیت گزر گئے۔ اس دوران کوئی قابل ذکر واقعہ نہ ہوا۔ سوائے اس کے کہ میں اور منشی برابر پولیس اسٹیشن کے چکر لگاتے رہے مگر انہوں نے شیر زادہ خٹک کو گرفتار نہ کیا۔ اسے مفرور قرار دے دیا جب کہ وہ گاؤں میں موجود تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر میں نے پرنٹ میڈیا کے ذریعے تھانہ انچارج کے خلاف خبریں لگوا دیں۔ ان خبروں کا خاطرہ خواہ نتیجہ نکلا اور تھانہ انچارج نے فوری اسٹیشن لیتے ہوئے شیر زادہ خٹک کو گرفتار کر لیا۔ یہ میری دشمنوں کے خلاف پہلی فتح تھی۔ اس روز میں بہت خوش تھا۔ میرے معصوم اور بے گناہ بھائی کا قاتل آہنی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا تھا۔ میں بہت پر امید اور پر جوش تھا۔ شیر

ماں کی کمی کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ کیا کچھ نہیں کیا میں نے تمہاری خاطر؟ دوستوں اور رشتہ داروں کے زور دینے کے باوجود دوسری شادی سے صاف انکار کر دیا۔ اپنی زندگی کے بہترین لمحات میں نے تمہاری پرورش اور دیکھ بھال پر صرف کر دیے۔ یہی صلہ دے رہی ہو میرے پیار کا؟“

”پاپا! اپنی بیٹی کے ساتھ تو یہ سیاست دانوں والی ہیرا پھیری نہ کریں۔ آپ مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں سب جانتی ہوں۔“ اس نے ترکی بتر کی جواب دیا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تجھے یہ پتی کس نے پڑھائی ہے؟ میں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ واپس آ جاؤ ورنہ پکچھتاؤ گی۔“ اس انداز میں دھمکی تھی۔

”میں نے کہا ہے ناں کہ جب تک آپ شیر زادہ خٹک کو گرفتار نہیں کر دیتے میں واپس نہیں آؤں گی۔“

”بھلا آپ مجھے جان سے ہی کیوں نہ مار دیں۔“

”ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں تم کیسے وہاں رہتی ہو؟“ راجا صاحب نے پیش کے عالم میں کہا اور پھر رابطہ منقطع کر دیا۔

”ہاں اب بتاؤ؟“ میں نے طنز یہ انداز میں کہا۔

”تمہیں بہت نہرتھاناں! اپنے پاپا پر لیکن وہ تو تمہیں دھمکانے پر آمادہ ہیں۔ اب کیا کرو گی؟“

”جان دے دوں گی مگر واپس نہیں جاؤں گی۔“ اس نے غصے سے کہا۔ ”کوئی مجھے زبردستی کیسے لے جا سکتا ہے؟“

”راجا صاحب ایسا کر سکتے ہیں مشی! بہتر ہوگا کہ تم خود ہی واپس چلی جاؤ۔ خواہ مخواہ میری پریشانیوں مت بڑھاؤ۔ دیکھو میں۔۔۔۔۔؟“

”شہا ہوا! تم بھی پاپا کا ساتھ دے رہے ہو؟“ اس نے رو ہوا سی ہو کر میری بات کاٹی۔ ”جب کہ یہ سب

کے انتہائی وفادار دوست نظر آ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر کہیں سے بھی یہ نہیں لگتا تھا کہ ان میں ایک مجرم ہے اور دوسرا قانون کا محافظ۔

میں نے جاتے ہی طنز یہ انداز میں کہا۔ ”واہ انور خان! بہت اچھی تفتیش کر رہے ہو، قانون کے محافظ کو بالکل آپ کی طرح ایماندار اور فرض شناس ہونا چاہیے۔“

وہ چند لمحے مجھے ناگوار انداز میں گھورتا رہا پھر گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ تو خواہناوار ناراض ہو رہے ہیں۔ تفتیش کیوں نہیں ہوگی۔ آج رہیمانہ کا پہلا دن ہے تو۔۔۔۔۔؟“ اس نے ذرا سا توقف کیا اور پھر میرے قریب پہنچ کر دھیمی آواز میں کہا۔ ”ہم مجرم کو پہلے پیار سے سمجھاتے ہیں۔ اگر وہ مان جائے تو ٹھیک ورنہ زائل شروع ہو جاتا ہے۔ آپ بے فکر رہیں میں پوری ایمانداری سے اس کیس پر کام کروں گا۔“

میں نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”آج تو نظر نہیں آتے بلکہ آپ تو مجرم کی آؤ بھگت کر رہے ہیں اور شاید رات کے وقت تو اسے اپنے ساتھ کوارٹر میں سلاتے ہوں گے۔“

”اب ہم مجرم کا کھانا پینا تو بند نہیں کر سکتے ناں؟“

قانون میں ایسی کوئی دفعہ نہیں ہے۔“ اس نے قدرے برا مناتے ہوئے شکایتی انداز میں کہا۔

”کھانا پینا تو جس میں بھی مجرموں کو فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ تو پھر تھانے کی حوالات ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر کسی مجرم کے ساتھ پولیس افسر کا چائے نوش فرمانا تو اچھی بات نہیں ہے ناں؟ اگر یہ خبر میڈیا تک پہنچ گئی تو آپ کے لیے مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔“

یہ واضح دھمکی سن کر وہ محض ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔

شاید اس کا بس چلتا تو وہ مجھے کھڑے کھڑے ہی شوٹ کر دیتا لیکن وہ جانتا تھا کہ مجھے ایک معروف صحافی کی سپورٹ حاصل ہے جو میرے ساتھ ہونے والی زیادتی پر خاموش نہیں بیٹھے گا اور اخبارات میں اس خبر کو خوب مریج مسالا لگا کر اچھالے گا۔ اس مجبوری نے انور خان کو وقتی طور پر بے بس کر دیا تھا ورنہ پولیس افسر اور اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال نہ کرے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

وہ چند لمحے خاموشی کے ساتھ میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ”آپ مدعی نہ ہوتے تو میں آپ کی دھمکی پر ضرور قانونی کارروائی کرتا۔ بہر کیف آپ سے ایک درخواست کروں گا کہ آپ ان معاملات میں دخل نہ دیں۔ میں مجرم کے خلاف مناسب قانونی کارروائی کروں گا۔“

”اپنے حق کے لیے آواز اٹھانا دھمکی نہیں ہوتی۔ آپ اگر مجرم کو بچانے کی کوشش کریں گے تو میں خاموش نہیں بیٹھوں گا۔“ میں نے اس کی دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جواب دیا۔

میری اس صاف گوئی پر اس کے صبر نے جواب دے دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنی اوقات پر آ گیا۔

”میں نے تمہارا بہت لحاظ کر لیا ہے تم جیسے لوگوں کو عزت دے رہا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ مجرم سے تفتیش کرنا میرا کام ہے تمہارا نہیں سمجھو تم۔“

میں نے کہا۔ ”میں تو پہلے دن ہی سمجھ گیا تھا افسر کہ تم کتنے فرض شناس اور ایماندار ہو؟ میں جبار ہوں لیکن اتنا یاد رکھنا کہ جو تم سوچ رہے ہو میں وہ بھی نہیں ہونے دوں گا۔“

”تھنے میں آ کر ایک بار ورنہ پولیس افسر کو دھمکانے کا انجام جانتے ہو؟“ وہ ایک دم ہتھے سے

اکھڑ گیا۔ ”میں چاہوں تو تجھے ابھی حوالات میں پھینک سکتا ہوں۔“

”تو پھینک دیجیے ناں! میں نے کب روکا ہے تمہیں؟“ میں نے بلاتر دو جواب دیا۔

”میں کہتا ہوں چلے جاؤ یہاں سے ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ تم حد سے تجاوز کر رہے ہو میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔؟“ اس نے منھیاں پھینچتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”چلو شاہ زمان! یہاں تمہاری سنے والا کوئی نہیں ہے۔“ صورت حال بگڑتے دیکھ کر مٹی نے مداخلت کی اور پھر میرا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے باہر لے جانے لگی۔

”چھوڑو مجھے۔“ میں نے چاکر کہا۔ ”یہ سمجھتے کیا ہیں خود کو؟ میں۔۔۔۔۔ میں انہیں چھوڑوں گا نہیں! میرے بھائی کا قاتل یہاں بیٹھا دھوئیں اڑا رہا ہے اور یہ لوگ میرا ساتھ دینے کے بجائے اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ یہ کیسا انصاف ہے؟“

”پلیز شاہو!“ مٹی نے التجائی۔ ”سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس نے تمہیں گرفتار کر لیا تو باہا جیتے جی مر جائیں گے۔“

بابا کا خیال آتے ہی میرا اشتعال ایک دم کم ہو گیا اور میں مٹی کے ساتھ جا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ مٹی نے فوراً گاڑی اشارت کی اور اسے گیر میں ڈالتی ہوئی پولیس اسٹیشن سے باہر نکال لائی۔ میں منہ پھلائے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ جب ہم پولیس اسٹیشن سے تھوڑی دور آ گئے تو مٹی بولی۔ ”شاہو! تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اس انور خان کا بندوبست کر لیا ہے۔ الوکا پٹھا خود کو بہت اسٹارٹ سمجھتا ہے ناں۔ اب دیکھنا میں اس کے ساتھ کیا کرتی ہوں؟“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے

پر جوش انداز میں کہا۔ ”میں نے انور خان اور شیر زادہ خٹک کی ویڈیو بنائی ہے۔ جب وہ ایک ساتھ چائے پی رہے تھے۔ یہ اگر تمہارے صحافی دوست تک پہنچ جائے تو سمجھو انور خان کی چھٹی ہوگی۔“

”ارے یہ تو تم نے کمال کر دیا ہے۔“ میں نے حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔ ”لاؤ اپنا موبائل فون مجھے دو ذرا میں بھی دیکھوں کہ انور خان مووی میں کیسا لگتا ہے؟“

اس نے موبائل فون میرے حوالے کر دیا۔ میں نے مووی دیکھی اور پھر اسے بلوٹوتھ کے ذریعے اپنے موبائل فون میں محفوظ کر لیا۔ مووی بلا شک و شبہ شاندار تھی۔ وہ دونوں چائے پیتے ہوئے واضح دلکشی دے رہے تھے۔ مٹی نے دونوں کے کھڑکے میں بھی شاٹ لیے تھے۔ ان کے باتیں کرنے کی دھیمی دھمی آواز بھی سنی جاسکتی تھی۔ تقریباً پانچ منٹ کی یہ مووی میرے لیے بہت کارا مدعا ثابت ہو سکتی تھی۔ انور خان جیسے بے ایمان پولیس افسر کا قبضہ درست کرنے کے لیے یہ مووی اس تک پہنچانا ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے میموری کارڈ سے مووی کو فون کی میموری میں منتقل کرنے کے بعد ایک بار پھر مٹی کے موبائل فون سے بذریعہ بلوٹوتھ مووی اپنے میموری کارڈ میں محفوظ کر لی۔ اب یہ مووی میرے موبائل فون کے ساتھ ساتھ میموری کارڈ میں بھی موجود تھی۔ میں جب بھی چاہتا یہ میموری کارڈ انور خان تک پہنچا سکتا تھا۔

گھر پہنچنے کے بعد میں نے موبائل فون سے میموری کارڈ نکال کر محفوظ کر لیا۔ اب اسے کسی طرح انور خان تک پہنچانا ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے پڑوسی منیر کو بلایا اور میموری کارڈ کو کاغذ کو ایک ٹکڑے میں لپیٹ کر منیر کے حوالے کرتے ہوئے نوازشانہ

”وہ تو اب تم ڈاکٹر سے بجائے مووی میکر بن گئے ہو۔ بہت اچھا بھئی بہت اچھا۔ میں یہ وڈیو فلم ضرور دیکھوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”ضرور دیکھنا اور یہ میرا نمبر بھی نوٹ کر لو کیونکہ مووی دیکھنے کے بعد تمہیں شدت سے میری یاد آئے گی۔“ اتنا کہہ کر میں نے اسے اپنا نمبر بھی نوٹ کروا دیا۔

میں ابھی انور خان سے بات کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ مٹی اور فائزہ ایک ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ میں نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر مٹی کو مخاطب کیا۔ ”انور خان کے پاس وڈیو فلم بھیج چکی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا رد عمل سامنے آئے گا۔“

فائزہ نے کسی تعجب کا اظہار نہیں کیا تھا۔ شاید مٹی نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ تاہم مٹی بولی۔ ”انور خان کا رد عمل ہمارے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے آصف شیرازی تک اس مووی کا پہنچانا ضروری ہے۔“ اس تک بھی پہنچ جائے گی میں نے ابھی تھوڑی دیر قبل اس سے بات کی ہے۔ وہ ہماری اس کارروائی سے بہت خوش تھا۔

مٹی نے کہا۔ ”کل ہی کسی طرح اس تک پہنچانے کا بندوبست کرو دیر ہمارے لیے نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ انور خان بہت خطرناک آدمی ہے۔ یہ نہ ہو کہ وہ چکر چلا کر ہمارے فون ہی ضبط کر لے۔“

میں نے کہا۔ ”اس لیے تو میں چاہتا تھا کہ تم واپس چلی جاؤ۔ آصف شیرازی بھی وہیں اسلام آباد میں رہتا ہے۔ میں تمہیں اس کا رابطہ نمبر دے دیتا ہوں تم یہ مووی اس تک پہنچا دینا۔“

وہ بولی۔ ”ابھی تو رات پڑنے والی ہے۔ کل صبح چلی جاؤں گی۔ تم مجھے اس اخبار کا نام بتا دو جہاں آصف شیرازی کام کرتا ہے۔ میں اس تک وڈیو فلم

وباں ان کے پاس ریپائڈ پر ہے۔ اس سے افتتاح کرنے کے بجائے اس کی دعوتیں کی جارہی ہیں۔“ اس نے پر مسرت انداز میں کہا۔ ”بھئی ویری گڈ مگر یہ سب تم نے کیسے کر لیا؟ کیا انور خان ڈھیٹ ہونے کے ساتھ ساتھ اندھا بھی ہے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”یہ کام میری ساتھی ڈاکٹر مہوش راجا نے کیا ہے۔“ اتنا کہہ میں نے تمام تفصیلات اس کے گوش گزار کر دیں۔

”اوکے یہ وڈیو فلم کسی طرح مجھ تک پہنچا دو انور خان کا دماغ درست ہو جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”بے فکر رہو پہنچ جائے گی۔ فی الحال میں نے انور خان کے پاس بھجوا دی ہے۔ کیا پتا دیکھ کر ہی وہ راہ راست پتا جائے۔“

”ٹھیک ہے میں انتظار کروں گا۔“ اس کے بعد چند ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد منیر بھی واپس پہنچ گیا۔ اس نے وہ میموری کارڈ ڈیوٹی پر موجود سنسٹری کے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے منیر کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنے کے بعد تھانے کا نمبر ملا دیا۔ فون ہینڈ محرم نے اٹینڈ کیا تھا۔ اپنا تعارف کرانے کے بعد میں نے اس سے استدعا کی کہ میں تھانہ انچارج انور خان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

وہ بولا۔ ”تھوڑی دیر بول کر میں جناب! میں ابھی آپ کی بات کر دیتا ہوں۔“ یہ مشکل دو منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ فون پر انور خان کی آواز سنائی دی۔ ”ڈاکٹر ایہ میموری کارڈ مجھے کس لیے بھجوا رہا ہے؟“

”میں نے ایک زبردست مووی بنائی ہے سوچا تمہیں بھی دکھا دوں؟ شاید تمہارا کچھ بھلا ہو جائے۔“ میں نے طنز یہ انداز میں جواب دیا۔

انداز میں کہا۔ ”منیر! اس میموری کارڈ کو تھانہ ایس ایچ او انور خان تک پہنچانا بہت ہی ضروری ہے۔ اگر تم محسوس نہ کرو تو پلیز میرا یہ کام کر دو۔“

”کیا یہ میموری کارڈ انور خان کا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”نہیں میرا اپنا ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس میں ایک مووی ہے جو انور خان کے کام کی ہے۔“

”ٹھیک ہے شاہ زمان بھائی! میں پہنچا دیتا ہوں لیکن اس نے مووی دیکھ کر مجھے دھڑلایا تو پھر کیا ہوگا؟“ اس نے انجانے خدشے کا اظہار کیا۔

میں نے کہا۔ ”ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ پھر بھی اگر تم ڈرتے ہو تو کسی کانسٹیبل کے حوالے کر دینا وہ خود ہی انور خان تک پہنچا دے گا۔ کانسٹیبل سے کہہ دینا کہ یہ پیر انور خان کے لیے ڈاکٹر شاہ زمان نے بھجوائی ہے۔“

منیر کے پاس اپنی موٹر سیکل تھی۔ وہ فوراً میموری کارڈ لے کر پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب کہ میں نے اس دوران اپنے صحافی دوست آصف شیرازی کا نمبر ملا دیا۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد ہم نے چند رسمی باتیں کیں۔ اس کے بعد آصف نے پوچھا۔ ”اور سناؤ تمہارا اس انور خان کا قبلہ درست ہوا کہ نہیں؟“

میں نے کہا۔ ”شیرازی! وہ بہت ڈھیٹ انسان ہے اتنی آسانی سے نہیں مانے گا۔ اس کے لیے کچھ اور سوچنا پڑے گا۔“

”مجھے حکم کرو دوست! میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“ اس نے پُر خلوص انداز میں استفسار کیا۔

”آج ہم نے موبائل فون کے ذریعے انور خان کی وڈیو فلم بنائی ہے۔ جس میں وہ شیرزادہ خٹک کی معیت میں چائے نوش فرما رہے ہیں حالانکہ شیرزادہ خٹک

رہے۔ فائزہ کو ایبٹ آباد بھجوانے والے فیصلے پر بابا بہت خوش تھے اور وہ پہلی بار مجھے مطمئن نظر آ رہے تھے۔ تاہم انہیں انور خان پر بالکل یقین نہیں تھا اور وہ انور خان کی یقین دہانی کو اس کی چال پر محمول کر رہے تھے۔ مجھ سے ویڈیو فلم والی ساری کہانی سننے کے بعد وہ بولے۔

”بے شک اس کی ایک کمزوری تمہارے ہاتھ لگ گئی ہے لیکن وہ کسی نہ کسی طرح اس کا مذاک کرے گا۔ بات اگر صرف شیرزادہ خٹک کی ہوتی تو انور خان اس کے مقابلے میں ضرور ہمارا ساتھ دیتا لیکن سردار شیر افضل کی مخالفت مولے کر وہ ہمارا ساتھ دینے کی کٹھنی بھول کر بھی نہیں کر سکتا۔“

میں نے کہا۔ ”بابا! میں چند روز تک دیکھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے اس دوران انور خان راہ راست پر آ جائے ورنہ میرے لیے دوسرا راستہ کھلا ہے۔ میں اس کے خلاف میڈیا کی مدد حاصل کروں گا۔ میں نے اپنے دوست آصف شیرازی پر ساری صورت حال واضح کر دی ہے۔ وہ میرا ساتھ دینے کے لیے بالکل تیار ہے۔“

”تم ایسا کرو کہ یہ ویڈیو فلم بغیر وقت ضائع کیے اس تک پہنچا دو۔“

”کل صبح مشی واپس جا رہی ہے اور وہ یہ فلم بھی ساتھ لے جا رہی ہے۔“

بابا بولے۔ ”بہتر ہوتا کہ تم بھی اس کے ساتھ چلے جاتے۔“

میں نے کہا۔ ”بابا! آپ بلا وجہ پریشان نہ ہوں۔ میں ان شاء اللہ ضرور جاؤں گا لیکن فی الحال میرا یہاں رہنا ضروری ہے۔“

”میں یہاں موجود ہوں تاں سب سنبھال لوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”بابا! آپ اس عمر میں کہاں تھانے

ہو سکتا ہے میں فائزہ کو بھی تمہارے ساتھ بھج دوں۔ اسے تم خالہ کے ہاں ایبٹ آباد چھوڑ دینا۔“

فائزہ بولی۔ ”نہیں بھائی! میں کہیں بھی نہیں جاؤں گی۔ یہیں آپ کے ساتھ رہوں گی۔ یہاں بابا کی خدمت کرنے والا بھی تو کوئی ہونا چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”بابا خود یہی چاہتے ہیں کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ وہ دن رات تیرے متعلق فکر مند رہتے ہیں۔ تم اگر انہیں خوش دیکھنا چاہتی ہو تو پیاز انکار مت کرو۔ حالات ٹھیک ہوتے ہی میں تجھے واپس بلا دوں گا۔“

”حالات نہ جانے کب ٹھیک ہوں گے؟ میرا دل ڈرتا ہے میں وہاں اکیلی کیسے رہوں گی؟ پلیز بھائی! مجھے مت بھیجنا میں یہیں ٹھیک ہوں۔ خدا نہ کرے اگر آپ لوگوں کو کچھ ہو گیا تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گی؟“ اس نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”فائزہ میری جان! تجھنے کی کوشش کرو یہاں تمہاری موجودگی مجھے دشمنوں کے مقابلے میں کمزور کرے گی۔ مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے وہ تجھے اغوا بھی کر سکتے ہیں۔ میں اکیلے رہ کر ہی ان کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ میں ان لوگوں سے ارمان کے خون کا بدلہ لوں اور وہاں ایبٹ آباد میں تم اکیلی تو نہیں رہو گی وہاں خالہ اور اس کے گھر والے بھی تو ہوں گے۔ وہ سب تمہارے اپنے ہی تو ہیں۔“

کافی تک وہ دو کے بعد میں نے اسے ایبٹ آباد جانے پر راضی کر لیا۔ اس کے بعد وہ دونوں رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے جانے کے لیے میں نے کل صبح کا وقت مقرر کر دیا تھا۔

۳۶.....۳۶.....۳۶

رات کے وقت کھانا کھانے کے بعد میں اور بابا تھوڑی دیر تک موجودہ صورت حال پر گفتگو کرتے

کے خلاف ایف آئی آر مضبوط دلائل پر مبنی ہو تو اسے دنیا کا ذہن ترین وکیل بھی مزے نہیں بخا سکتا۔“

وہ بولا۔ ”اس سے بھی زیادہ اہم چشم دید گواہ ہوتے ہیں۔ جو تمہارے پاس نہیں ہیں۔ تم کہیں سے چشم دید گواہ ڈھونڈ لاؤ۔ میں ایسی رپورٹ تیار کروں گا کہ شیرزادہ خٹک سیدھا چھاپسی کے تختے پر پہنچ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے میں گواہ بھی تلاش کروں گا تم تفتیش کا آغاز کرو۔“

”مجھ کو تفتیش کا آغاز ہو چکا ہے۔ آج رات ہی اسے عمل کی پرچہ ہا دوں گا۔“ اس نے پُر جوش انداز میں جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ”اے خاں! میں تم پر اعتبار کر رہا ہوں۔ تم اپنا دیکھنا اور تم نے مجھے دیکھ کر اس نے اپنی کوشش کی تو پھر تم بھی فتح نہیں پاؤ گے۔ یہ ویڈیو فلم میں نے پہلے ہی محفوظ ہاتھوں تک پہنچا دی ہے۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو اس فلم کو منظر عام پر آنے میں محض چند لمحے ہی لگیں گے۔“

”میں ایسا کچھ بھی نہیں کروں گا۔ تم مطمئن رہو مجھے اپنی سروس عزیز ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”بس تو پھر ٹھیک ہے تم بھی اطمینان رکھو میں احسان فراموش نہیں ہوں۔“ میں نے اسے تسلی دی اور اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

مشی اور فائزہ نے چونکہ ایک طرف کی گفتگو سنی تھی اس لیے میں نے انور خان سے ہونے والی ساری گفتگو ان کے گوش گزار کر دی۔ ساری بات سننے کے بعد مشی بولی۔ ”چلو یہ اچھا ہوا اب مجھے واپس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”بھئی! تمہیں واپس تو جانا ہی پڑے گا۔ یہ انور خان کی کوئی چال بھی تو ہوسکتی ہے اور

پہنچا دوں گی۔“

میں نے اسے ملک کے اس معروف اخبار کا نام بتا دیا جہاں آصف شیرازی کرائم رپورٹر تھے۔ پھر اس کا رابطہ برنوٹ کرانے کے بعد کہا۔ ”تم ایسا کرو کہ موبائل فون سے میموری کارڈ نکال کر اپنے پرس میں رکھ لو۔ کسی بھی انہونی کی صورت میں کم از کم میموری کارڈ تو محفوظ رہے گا۔“

وہ بولی۔ ”ٹھیک ہے میں فون سے کارڈ نکال لوں گی لیکن پرس بھی غیر محفوظ ہے کہیں اور رکھنا پڑے گا۔“

ایسے ہی دقت میرا موبائل فون بچنے لگا۔ اسکرین پر ایک اجنبی نمبر جھلک رہا تھا۔ جو میرے خیال کے مطابق انور خان کا ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے ”ہیلو“ کہا تو وہ ناگوار انداز میں بولا۔

”ڈاکٹر! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ میرے خلاف کوئی بھی کارروائی ہوئی تو میں تجھے عبرت کا نشان بنا دوں گا تمہارے حق میں بہتر ہوگا کہ تم اس سووی کی تمام کاپیاں ضائع کرو۔“

میں نے کہا۔ ”انور خان! میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے قتل کے اس کیس میں ایمانداری سے کام کیا تو اس ویڈیو فلم کی تمام کاپیاں تمہارے سامنے ضائع کر دوں گا۔ بصورت دیگر مجھے مجبوراً اس ویڈیو میڈیا کے سامنے لانا پڑے گا۔“ اب فیصلہ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ جاہو تو فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے میرے بھائی کے قاتل کو قتل کرواؤ اسی سزا دلانے کی کوشش کرو ورنہ بے ایمانی کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

”قاتل کو سزا دینا عدالت کے اختیار میں ہے۔ میرے نہیں۔“ اس نے بے رخی سے جواب دیا۔

”میں جانتا ہوں کہ یہ عدالت کا کام ہے لیکن اس میں ایف آئی آر بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مجرم

پکھریوں کے چکر کا سنتے رہیں گے؟ آپ فکر نہ کریں ان شاء اللہ مجھے کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ اس کے بعد میں نے بابا کو سمجھا بھلا کر راضی کر لیا۔ رات کے دس بجے تک بابا میرے ساتھ بیٹھے رہے۔ پھر سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے بھی تمام خیالات کو جھٹک کر سونے کی کوشش شروع کر دی مگر بار بار پہلو بدسنے کے باوجود مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میرا دماغ مختلف سوچوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ بھی اماں کی ضرورت لگا ہوں میں گھوٹے لکٹی تو بھی ارمان کی۔ دیر گئے تک میں کروٹیں بدلتا رہا پھر نجانے کب نیند کی دیوی مہربان ہوئی کہ مجھے بتائی نہ چلا۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ ایسے ہی وقت کمرے کے دروازے پر زور دار دستک ہوئی اور میں ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے لائٹ آن کر دی۔ ”کون؟“ میں نے بستر سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے سوال کیا۔ مگر میرے سوال کا جب کوئی جواب نہ ملا تو مجھے کسی گڑ بڑ کا احساس ہوا۔ میں نے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے الماری کھولی اور پستول نکال لیا۔ یہ میں یور کا چائنا ساخت پستول تھا۔ اس کے ملکیزین میں دس بلیٹ کی گنجائش تھی میں نے میگزین نکال کر چیک کیا تو وہ لوڈ تھا۔ میں نے دوبارہ اسے اپنی جگہ پر فٹ کیا اور بے پاؤں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اسی اثناء میں دروازے پر دو بارہ زوردار دستک ہوئی۔ ”کون ہے؟“ اس بار میں نے قدرے سخت انداز میں استفسار کیا۔ ”ڈاکٹر!“ ایک ایسی مردانہ آواز سنائی دی۔ ”دونوں ہاتھ اٹھا کر کمرے سے باہر آ جاؤ اور خبردار کوئی چالاکی

میں نے دوسرا وار اس کی کھوپڑی پر کیا تھا۔ وہ چیختا ہوا زمین بوس ہو گیا میں پھٹکا رہا دوسری طرف پلٹا مگر اس دوران میں چار آدنی بھوکے گدھوں کی طرح مجھ پر بھیسٹ پڑے۔ وہ مجھ پر اسٹین گنوں کے بٹ برسائے تھے۔ لائٹیں اور گھونٹے مار رہے تھے۔ حتی المقدور میں بھی ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ عمر یہ ایک اور چار کا مقابلہ تھا۔ انہوں نے چند لمحوں کے اندر مجھے روٹی کی طرح دھنک کر رکھ دیا تھا۔ میری ناک اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ قمیص تار تار ہو چکی تھی مگر مارنے والوں کے ہاتھ نہ رکے۔ فائزہ اور مٹی رورو کر اٹھیں خدا اور رسول کے واسطے دے رہی تھیں۔ بابا بھی گڑ گڑا رہے تھے۔ ہاتھ جوڑ رہے تھے لیکن مارنے والوں کے ہاتھ نہ رکے۔ وہ لگاتار مجھ پر اسٹین گنوں کے بٹ اور لائٹیں گھونٹے برساتے رہے۔ ان کا لیڈر فتح خان مغفلات بکتا رہا۔ پھر اچانک ہی وہ سب کچھ وقوع پزیر ہو گیا جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بابا جوان کے سامنے رو رہے تھے گڑ گڑا رہے تھے۔ نجانے کیسے ان کے ہاتھ میرا گرا ہوا پستول لگ گیا۔ کسی کو خبر ہی نہ ہو سکی۔ پتا تب چلا جب اچانک ایک دھماکا ہوا اور فتح خان کا ایک ساٹھی کریمہ انداز میں چیختا ہوا زمین بوس ہو گیا۔ بابا کو دوسری گولی چلانے کی مہلت ہی نہ ملی۔ فتح خان کے ایک ساتھی کی اسٹین گن نے برسات کی صورت میں شعلہ لگا جو بابا کی چھاتی چھاتی کرتا ہوا گزر گیا۔ بابا لہراتے ہوئے پشت کے بل گرے اور پھر ہمیشہ کے لیے چپ ہو گئے۔

میں انتہائی اذیت کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ مجھ میں اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی سکت نہیں رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے بدن کی ایک ایک ہڈی ٹوٹ چکی ہو جاتے ہوئے اور ناک سے

بہنے والے خون نے میرا چہرہ لہو لہا کر دیا تھا۔ میری زبان خون کا ذائقہ محسوس کر رہی تھی۔ مگر ایسے عالم میں بھی میں گھسیٹے ہوئے بابا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کسی حقیر کیزے کی طرح ریٹکتا ہوا میں بابا کے مردہ جسم تک پہنچا اور اس سے لپٹ کر رونے لگا۔ پھر میری دیکھا دیکھی فائزہ بھی بابا کی لاش سے لپٹ گئی اور دھڑاڑیں مار مار دینے لگی۔ مٹی کی مجھے خبر ہی نہ تھی کہ وہ کیا کر رہی ہے؟ فائزہ کی آواز سن کر بھی ہمارے بڑوسیوں کی طرف سے کسی قسم کی مداخلت نہیں ہوئی تھی۔ ان دنوں بھی وطن عزیز کی یہی حالت تھی جو آج کل ہے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا اور قانون نافذ کرنے والے ادارے بیٹھے نیند سو رہے تھے۔ بس فرق اتنا تھا کہ وہ ایک ڈکٹیٹر کا دور حکومت تھا جب کتا ج کل تمام نہاد جمہوریت کی حکمرانی ہے۔ حکمران بدل گئے مگر عوام کی حالت بدستور ہی رہی۔ تب بھی کوئی ان کا پرسان حال نہیں تھا اور آج کل بھی ان کا خون ارزاں ہے۔ یہ مفلوک الحال طبقہ جو عوام کہلاتا ہے بھیڑیوں کا ایک ایسا ریونر ہے جس کی نملہبانی خون خوار بھیڑیوں کے سپرد کر دی گئی ہے۔ جب ایسی صورت حال ہوتی ہے تو کسی فائزہ کی اور فتح و پکار کی آوازیں سن کر گھر سے باہر قدم نکالنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ جب سب کی جان کے لالے پڑے ہوں تو کوئی کسی کی مدد کو نہیں نکلتا۔

فتح خان اور اس کے ساتھیوں پر ہمارے نالہ و فریاد کا کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ ان کے لیے ایک من پسند اور دلچسپ تماشا تھا۔ قاتلوں کا وہ ٹولہ رحم و کرم کے جذبات سے بے فکر عاری تھا۔ چند لمحے وہ ہماری حالت پر توجہ سے لگاتے رہے۔ پھر فتح خان نے آگے بڑھ کر میرے مضروب جسم پر پاؤں کی ایک ٹھوکری رسید کرتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر! میں نے تجھے کہا تھا ان کا گول چھوڑ کر

بھاگ جاؤ یا پھر خنک صاحب سے دوستی کا ہاتھ ملا لو۔ لیکن تم نے میری بات کو گیدڑ بھیجی سمجھا۔ میں نے تجھے تین دنوں کی مہلت دی تھی اور چوتھے روز ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ دیکھ لو آج چوتھا دن ہے اور تم میرے قدموں میں کسی حقیر کیرے کی طرح پڑے ہوئے ہو۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”افسوس کہ بانجوس دن کا سورج ابھرتے ہوئے تم نہیں دیکھ سکو گے کیونکہ فتح خان پیسے کے لیے کسی کی بھی جان لے سکتا ہے۔“

اتنا کہنے کے بعد اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اشین گن کو سیدھا کیا اور اس کی سردال کو میری پیشانی پر رکھتے ہوئے بے رحمانہ انداز میں بولا۔ ”مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

میں نے موت کے خوف سے آنکھیں بند کر لیں جب کہ فائزہ فریادی انداز میں اس کے پیروں سے لپٹ کر میری زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔ ”خدا کے لیے میرے بھائی پر رحم کرو یہ بے قصور ہے۔ تمہیں رسول کا واسطہ اسے معاف کر دو۔ ہم یہ گاؤں چھوڑ کر کہیں دور چلے جائیں گے۔ تم لوگوں کو کبھی نظر نہیں آئیں گے۔ زندگی بھر ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔“ وہ فائزہ کو پاؤں کی ٹھوکر رسید کرتے ہوئے بولا۔ ”معافی تو اب یہ اوپر جا کر مانگے گا۔ فتح خان کبھی کسی کو معاف نہیں کرتا۔“

پھر وہ فائزہ کے قریب گھٹنوں کے من بیٹھ گیا اور اس کے بال پکڑ کر غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے شیطانی انداز میں بولا۔ ”ارے تم تو بہت خوب صورت ہو تیری حسین آنکھوں میں کوئی بھی دل والا ڈوبنے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ مگر افسوس صد افسوس کہ فتح خان کے پہلو میں دل کی جگہ اوپر والے نے پتھر رکھ دیا ہے۔ تیرا حسن اور جوانی

میرے کسی کام کی نہیں ہے۔ الہتہ چھوٹے خان جی حسن کے بہت بڑے قدردان ہیں۔ انہیں یقیناً تم پسند آؤ گی۔“

اس کی بات جو نبی مکمل ہوئی فائزہ نے اس کے چہرہ پر ٹھوک دیا۔

”کتیا! تیری یہ جرات؟“ وہ آپے سے باہر ہو گیا اور پھر اس نے فائزہ کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ”حرام زادی تجھے یہ جرات بہت مہنگی پڑے گی۔ ہم تیرا وہ دھڑ کر رہے گی۔ کہ تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہیں رہے گی۔ ہم تیرے اس سوراہا بھائی کے سامنے تیرے کپڑے تار کر۔“

اچانک فتح خان کا موبائل فون بجنے لگا اور اس کی بات اٹھوری رو گئی۔

”سلام خان جی!“ وہ کال ریسو کرتے ہوئے موبائل انداز میں بولا اور پھر دوسری طرف کی بات سننے لگا۔

”ہاں خان جی! وہ کتنا اس وقت میرے قدموں میں پڑا ہوا ہے جب کہ اس کی حسین و جمیل بہن میرے پیروں سے لپٹی اس کی زندگی کی بھیک مانگ رہی ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ دوبارہ دوسری جانب کی گفتگو سننے لگا۔

”ہاں خان جی! دوبارہ فتح خان کی آواز گونگی۔“ آپ بالکل اطمینان رکھیں میں ابھی انہیں پہنچا دیتا ہوں۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر بولا۔

”جی خان جی! دیکھا ہوا ہے میں نے۔ آپ فکر نہ کریں میں احتیاط کروں گا۔“

اس کے بعد فتح خان چند لمحے ”ہوں ہاں“ کرتا رہا اور پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔

”چلو۔“ وہ اپنے ساتھیوں سے بولا۔ ”جلدی جلدی گھر کی تلاشی لو اور جو بھی قیمتی چیز ہاتھ لگے

اٹھا لو۔ موبائل فون ضرور اٹھانا۔“

اس کا حکم سننے ہی قاتلوں کا دھولہ کمروں میں گھس کر گھر کی تلاشی لینے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ نقدی زیورات اور موبائل فونز جن کی تعداد پانچ سو اٹھ کر لے آئے۔ یہ ساری چیزیں فتح خان نے ان سے سنبھال لیں۔ اس کے بعد فتح خان نے دوبارہ انہیں حکم دیا۔

”ڈاکٹر اور دونوں لڑکیوں کو اٹھا لو۔“

”اور اس بڑھے کا کیا کرنا ہے؟“ اس کے ایک ساتھی نے سوال کیا۔

”یہ ہمارے کسی کام کا نہیں ہے۔ بیٹیں پڑا رہے دو۔ صبح پڑوئی اسے دفن دیں گے۔ اب چلو ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“ فتح خان نے جالت میں جواب دیا۔

ان کی دو گاڑیاں گھر کے دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک گاڑی میں مجھے اور فائزہ کو ڈال دیا گیا جب کہ مٹی کی دوسری گاڑی میں بٹھایا گیا۔ مٹی والی گاڑی کو فتح خان نے پہلے روانہ کر دیا جب کہ ہماری گاڑی تھوڑی دیر کے بعد روانہ ہوئی۔ یہ ایک طاقتور لینڈ کروزر تھی۔ میں دونوں سیٹوں کے درمیان نیچے پڑا ہوا تھا۔ تاہم فائزہ کو انہوں نے سیت پر بٹھا رکھا تھا۔ سیٹ پر وہ دو آدمیوں کے درمیان چنچس کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے تمام جسم میں ناقابل بیان ہیسس اٹھ رہی تھیں اور میں کسی حقیر کپتھوے کی طرح گاڑی کے فرش پر پڑا ہوا تھا۔

فتح خان اور اس کے ساتھی آپس میں باتیں کر رہے تھے مگر ان کی گفتگو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی تاہم میں نے ان کی گفتگو سے اتنا اندازہ لگایا تھا کہ وہ ہمیں خان جی کے کسی فارم ہاؤس پر لے جا رہے ہیں۔ جو ایٹ آباد شہر سے قدرے فاصلے پر کہیں مصافحات میں واقع تھا۔

گاڑی بہت دیر تک چلتی رہی۔ مجھے ہانک کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ جس وقت فتح خان اور اس کے ساتھیوں نے ہمارے گھر پر چڑھائی کی تھی اس وقت بھی میں نے ہانک نہیں دیکھا تھا۔ پھر میرے اندازے کے مطابق لگ بھگ چار گھنٹوں کے بعد گاڑی ایک وسیع و عریض عمارت کے صدر دروازے سے گزرتی ہوئی پورچ میں جا کر رک گئی۔

فتح خان اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں گاڑی سے اتار اور ایک کشادہ کمرے میں بند کر دیا۔ کمرے میں ایک جہازی سائز کا بیڈ بچھا ہوا تھا۔ فرش پر دیٹر ایرانی قالین موجود تھا۔ تین چار نہایت قیمتی اور نفیس سوفے کمرے کے مین درمیان میں رکھے ہوئے تھے۔ جن کے سامنے ماربل کے شفاف ٹیبل لگے ہوئے تھے اور بھی بہت سارا سامان انیش موجود تھا۔ یہ کمرہ بلاشبہ کسی صاحب ثروت کی عشرت گاہ معلوم ہو رہا تھا۔ کمرے کی چاروں دیواروں پر رودھیا بلب لگے ہوئے تھے۔ ان کے بہ یک وقت جلنے سے کمرے میں روشنی کا سیلاب آیا ہوا تھا۔

مجھے فتح خان کے ساتھیوں نے قالین پر پھینکا تھا۔ میں چپ لیٹا ہوا تھا جب کہ فائزہ میرے قریب بیٹھی خاموش آنسوؤں سے رو رہی تھی۔ ہم دونوں اس طرح خاموش تھے جیسے ہماری موت گویائی سلب ہو چکی ہو۔ بے بسی کی ایک انتہائی جو اس وقت ہم پر طاری تھی۔ ہم ایک دوسرے کو تسلی دینے سے بھی قاصر تھے۔ ہمارے پاس دو لفظ ہی نہیں تھے جن کا سہارا لے کر ہم ایک دوسرے کی ڈھارس بندھاتے۔ مٹی کے متعلق ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ نجانے دو لوگ اسے کہاں لے گئے تھے؟ وہ اسی فارم ہاؤس کے کسی دوسرے کمرے میں بھی ہو سکتی تھی اور یہاں سے کہیں دور دراز علاقے میں بھی اسے منتقل کیا

یہاں صرف تم لوگوں کا خیال رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“

”تو پھر چھوٹے خان جی سے کسی طرح میری بات کرا دو۔“ میں نے استدعا کی۔

”وہ آئیں گے تو انہیں تمہارا پیغام دے دیا جائے گا۔ ابھی ناشتا کرو اس کے بعد تمہاری مرہم پٹی کردی جائے گی۔“ اس کے بعد وہ سب کمرے سے باہر نکل گئے اور جاتے جاتے دروازہ لاک کر تے گئے۔

دو روز تک ہم اس کمرے میں قید رہے۔ ہمیں کھانا پینا باقاعدگی سے ملتا رہا۔ کمرے میں آنچ ہاتھ روم اور نوائلٹ موجود تھا۔ چنانچہ ہمیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ میرے زخموں کی سہلے روز ہی مرہم پٹی کردی گئی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ کوئی ہڈی وغیرہ نہیں ٹوٹی تھی۔

تیسرے روز ہمیں چھوٹے خان جی سردار افضل خان کے سامنے پیش کروایا گیا۔ اس نے مجھ پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور پھر فزہ کو ہوسناک اور لالچالی ہونی لگا ہوں گے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر چھائی خباثت دیکھ کر مجھے پہلی بار اس بات پر شدید پشیمانی کا احساس ہوا کہ کاش میں نے فزہ کی بات مان کر اس کا گلا گھونٹ دیا ہوتا۔ چند لمحے فزہ کو گندی نظروں سے گھورنے کے بعد وہ دوبارہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر ایک ہاتھ سے اپنی ٹھنڈی سیہ منوچھوں کو مر دڑتے ہوئے پر غور انداز میں بولا۔ ”ہم سے دشمنی کرنے کا نتیجہ دیکھ لیا تم نے؟ فتح خان کی بات نہ مان کر تم نے ہمارے غضب کو لگا کر ہے۔ اب بول کون بچائے گا تجھے ہمارے ہاتھوں سے۔ ہم نے آج تک اپنے کسی دشمن کو معاف نہیں کیا تو تجھے کیسے کریں گے؟“

میں نے کہا۔ ”میں تم لوگوں سے زندگی کی بھیک

کھڑا ہونے سے قاصر تھا اس کی عزت اور جان کیسے بچا سکتا تھا؟“

مجھے خاموش دیکھ کر وہ دوبارہ بولی۔ ”بھائی! پلیز یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ ابھی وہ درندے آ جائیں گے تو پھر آپ کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔ ابھی وقت ہے آپ مجھے اس اذیت بھری زندگی سے چھٹکارا دے سکتے ہیں۔ میں آپ کو اپنا خون معاف کرتی ہوں۔“

”نہیں فزہ نہیں۔“ میں نے مزید کہا۔ ”یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ پلیز اپنے بھائی کو اتنے بڑے امتحان میں مت ڈالو۔ ہم جیش گے تو اکٹھے اور..... اور مریں گے تو بھی اکٹھے۔“

ایسے ہی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور تین آدمی آگے پیچھے چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ جن میں سے دو آدمی سناٹے تھے۔ جب کہ تیسرے کے ہاتھوں میں ناشتے کی ٹرے تھی۔

انہوں نے ٹرے ہمارے پاس قالین پر رکھ دی اور پھر سب افراد میں سے ایک بولا۔ ”تم لوگ ناشتا کرو۔ ابھی چھوٹے خان آئیں گے تو تمہاری تقدیر کا فیصلہ ہو جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”فتح خان کہاں ہے میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

اس نے ناگوار انداز میں پوچھا۔ ”تم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“

”یہ میں اسی کو بتاؤں گا؟“ میں نے جواب دیا۔

”وہ یہاں نہیں ہے اور شاید اب یہاں آئے گا بھی نہیں۔ تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے ہم سے کہہ سکتے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”میری بہن کو جانے دو تمہاری دشمنی مجھ سے ہے۔ یہ تو بے قصور ہے پلیز اسے جانے دو تم لوگوں کا مجھ پر احسان ہوگا۔“

وہ بولا۔ ”یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ ہمیں

”بھائی! آپ اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دیں۔ میں بے عزتی کی موت نہیں مرنا چاہتی۔ یہ لوگ نبھانے میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ پلیز بھائی میں آپ کی منت کرتی ہوں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں کہ میری یہ آخری خواہش پوری کر دیں۔“ یہ کہہ کر اس نے باقاعدہ میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ آہ تقدیر مجھے کس موڑ پر لے آئی تھی؟ جس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایسے دن بھی دیکھنا پڑیں گے؟ وہ میری لاڈلی بہن تھی۔ اسے میں نے اپنی گود میں کھلایا تھا۔ میری انگلی پکڑ کر اس نے چلنا سیکھا تھا۔ اپنی زندگی میں اسے میں نے کبھی جھڑکا تک نہیں تھا۔ آج میری وہی بہن مجھ سے رو کر فریاد کر رہی تھی کہ میں اپنے ہاتھوں سے اس کی جان لے لوں۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی۔ میری داستان حیات پڑھنے والوں کو اس پر معمولی سا رنج ضرور ہوگا لیکن وہ درود دیکھ اور وہ تکلیف جو اس وقت میں محسوس کر رہا تھا پڑھنے والے وہ شاید بھی محسوس نہ کر سکیں۔ کیونکہ درود ہاں سے اٹھتا ہے جہاں چوٹ لگتی ہے۔

میں نے قدرے توقف سے شکست لہجے میں کہا۔ ”گزیار! یہ ناممکن ہے میں..... میں اپنے ہاتھوں سے..... تیری..... جان کیسے لے سکتا ہوں؟“

وہ بولی۔ ”بھائی! آپ نہیں او گے تو وہ درندے لے لیں گے لیکن جان لینے سے پہلے وہ میرے ساتھ جو سلوک کریں گے وہ..... آپ..... کیسے دیکھ پائیں گے؟“

میرے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اور نہ ہی میں اس کی عزت و جان بچانے کا کوئی دعوٰی کر سکتا تھا۔ میں جو اس وقت اپنے قدموں پر اٹھ کر

جا سکتا تھا۔

ہمیں کمرے میں بند کرنے کے بعد انہوں نے مڑ کر ہماری خبر نہیں لی تھی۔ ہمیں وقت کا بھی کوئی اندازہ نہیں تھا۔ نہ کمرے میں کوئی وال کھلا تھا اور نہ ہی ہم دونوں میں سے کسی کی کلائی پر گھڑی موجود تھی۔ کمرے میں سورج کی روشنی کا بھی گزر نہیں تھا کہ ہم وقت کا اندازہ لگا لیتے۔ غالباً کمرہ ساؤنڈ پروف تھا۔ ہم دونوں بدستور خاموش تھے۔ شاید ہمیں اپنے انجام کے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں رہی تھی۔ انہوں نے بابا کو جس بے رحمی کے ساتھ قتل کیا تھا اسے دیکھ کر ان سے رحم کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ ویسے بھی جو کچھ ہم پر بیت چکی تھی اس کے بعد ہمیں زندہ رہنے کی کوئی خواہش نہیں رہی تھی۔

”بھائی!“ معاف فزہ کمرے میں چھائی خاموشی کو توڑتے ہوئے بولی۔ ”کیا یہ لوگ بابا کی طرح ہمیں بھی مار ڈالیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”ماری ڈالیں تو اچھا ہوگا۔ ماراں اماں اور بابا کے بعد ہم جی کر کیا کریں گے۔ کاش ہم بابا کا کہنا مان کر یہاں سے نہیں دور چلے جاتے۔“

وہ بولی۔ ”جیسے کا تو اب مجھے بھی کوئی شوق نہیں رہا مگر میں عزت کی موت مرنا چاہتی ہوں۔“

”اب تو وہی ہوگا جو قسمت میں لکھا ہے۔“ میں نے بے بسی کے عالم میں جواب دیا۔

وہ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہوئی۔ یوں جیسے کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے سوچوں میں مستغرق ہو گئی ہو۔ پھر قدرے توقف کے بعد احتجاجی انداز میں بولی۔

”بھائی! میری ایک بات مانیں گے؟“

”میرے بس میں ہوا تو ضرور مانوں گا۔“

وہ بولی۔ ”بس میں نہ ہوتی تو کیوں کہتی؟“

”تو پھر یوں تو ضرور مانوں گا۔“

اسے میں تم لوگوں کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔ خدا کے لیے اسے چھوڑ دو پلیر چھوڑ دو۔“
اس دوران وہ فائزہ کو اس جہازی سائز بیڈ پر گرا چکا تھا۔ کمرے کا دروازہ اس کے آدمی پہلے ہی بند کر چکے تھے۔ میرے چہنچہنے چلانے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ فائزہ بہ دستور مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں چلا کر خود کو بچانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ مگر ایک طاقت ور مرد کے سامنے اس دھان پان لڑکی کی حیثیت ہی کیا گئی۔ اس نے اسے کسی عفریت کی طرح جکڑ رکھا تھا۔

ایسے ہی وقت میں نے نتائج کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے بچانے کے لیے دوڑ پڑا لیکن بیڈ تک پہنچنے سے پہلے ہی چھوٹے خان جی کے ان سب غنڈوں نے مجھے پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ وہ مجھ پر اسٹین گولوں کے بٹ برس رہے تھے۔ لائیں اور گھولنے مار رہے تھے مگر میں زخموں کی پروا نہ کرتے ہوئے ان چاروں سے لڑ رہا تھا لیکن کب تک؟ وہ چاروں غنڈے تھے۔ لڑائی بھڑائی ان کے لیے روز مرہ کا معمول تھا۔ انہوں نے چند ہی لمحوں میں مجھے مار مار کر شیم بے ہوش کر دیا۔ میں قائلین پر گرا اپنی معصوم بہن کی مدد و تحفظ میں رہا تھا مگر اس کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ پیشانی سے ٹپکنے والے خون نے میری آنکھوں کو دھندلا دیا تھا۔ چھوٹے خان کے بعد ان چاروں نے بھی باری باری میری معصوم بہن کو درندگی سے روندنا اور پھر انہی میں سے کسی نے اس معصوم کا گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا۔

جب وہ اس شیطانی کارروائی سے فارغ ہو گئے تو چھوٹے خان جی نے انہیں حکم دیتے ہوئے کہا۔
”ان دونوں کو اٹھا کر باہر کہیں دور پھینک دو۔“
”مگر خان جی! یہ ڈاکٹر تو زندہ ہے۔ اسے گولی مار

”وہ... لڑکی... کہاں ہے؟“ میں نے بے تابانی سے پوچھا۔

”اس کی فکر نہ کرو وہ تو اب تک اپنے گھر بھی پہنچ چکی ہوگی۔ تم اپنی اور اپنی بہن کی فکر کرو۔“ اتنا کہہ کر وہ شیطانی ارادے سے فائزہ کی جانب بڑھنے لگا۔ میں چاہتے ہوئے بھی اسے اس کے گندے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے چار خون خوار گرگے آنکھیں ہتھیار لیے مجھ پر مسلط تھے۔ میں اگر ذرا سی بھی حرکت کرتا تو وہ مجھے گولیوں سے بھون ڈالتے۔ فائزہ اسے اپنی طرف خطرناک ارادے سے بڑھتے دیکھ کر ایک دم ہم گئی۔ اس کی حالت اس فاختہ کی سی ہو گئی تھی جس پر باز جھپٹ پڑا ہو۔ ایک ٹاپے کے لیے اس نے اندھا طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا مگر اسے مایوسی ہوئی۔ میں سب افراد میں گھرا ہوا تھا۔ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

مجھ سے مایوس ہونے کے بعد اس نے چھوٹے خان جی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”خدا کے لیے مجھے جانے دو مجھ پر رحم کرو میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ پلیز ایسا مت کرو پلیز تمہیں خدا کا واسطہ مجھے جانے دو۔ پلیز جانے دو۔“ وہ گڑ گڑاہی سے رورہی تھی اس کی منٹیں گر رہی تھیں اسے خدا اور رسول کے واسطے دے رہی تھی مگر وہ اس کی فریاد کو سنی ان سنی کرتے ہوئے شیطانی انداز میں قہقہہ لگا رہا تھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے فائزہ کو دبوچ لیا۔ وہ بدیانی انداز میں چلائی۔ ”بھائی! خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ بھائی۔“

میری معصوم بہن کی مدد کے لیے پکارتی ہوئی آواز اس درندے کے قہقہوں میں دب کر رہ گئی۔ بھی میں حلق کے بل چلایا۔ ”خاتم درندے چھوڑ دے

نہیں مانگوں گا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ میری بہن کو چھوڑ دو اس کی تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اسے جانے دو۔“

وہ لمبوں پر مکروہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ”تم بہت احمق ہو ڈاکٹر۔ ایسے میں کیسے جانے دوں؟ یہ تو فتح کے ساتھیوں کا انعام ہے۔“

”خدا سے ڈرو چھوٹے خان جی!“ میں نے التجائیہ انداز میں کہا۔ ”یہ ظلم مت کرو ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی سے انتقام لینا کہاں کی بہدردی ہے؟“
”یہ ہمیں مال غنیمت میں ہی ہے ڈاکٹر اور مال غنیمت آج تک کسی نے نہیں چھوڑا تو ہم کیوں چھوڑ دیں؟“ اس نے خباثت سے جواب دیا۔

”میں تیری منت کرتا ہوں۔“ میں نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں خدا اور رسول کا واسطہ دیتا ہوں۔ پلیز میری بہن کو چھوڑ دو خدا کے لیے چھوڑ دو اس کا کوئی گناہ نہیں ہے۔“

”خاموش ہو جاؤ۔“ اس نے گرج کر کہا۔ ”اس کا گناہ یہ ہے کہ یہ ڈاکٹر شاہ زمان کی بہن ہے۔ اس ڈاکٹر شاہ زمان کی جس نے ہمارے دوست انور خان کی فینڈ حرام کر رکھی ہے اور ہمارے دست و بازو شیر زادہ خٹک کو اپنی سزاؤں کے پیچھے پہنچا دیا ہے۔“ وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر بولا۔ ”سنو ڈاکٹر! تمہارے گناہوں کا کفارہ تمہاری بہن کو ادا کرنا پڑے گا۔ تمہاری آہ و زاری اور فریاد کا ہم پر کوئی اثر ہونے والا نہیں ہے۔ یہ تمہیں اس وقت سوچنا چاہیے تھا جب تم اس لڑکی کے ساتھ انور خان کی خفیہ ڈیو فلم بنا رہے تھے۔ اس لڑکی کی تو قسمت اچھی تھی کہ وہ ہمارے انتقام سے بچ گئی ہے۔ وہ اگر راجا صاحب کی بیٹی نہ ہوتی تو اس کا بھی ہم بیکے حشر کرتے جو انھی تمہاری اس حسین و جمیل بہن کا کریں گے۔“

دیں؟“ مسلح افراد میں سے کسی نے پوچھا۔ وہ بولا۔
”اس میں اگر ذرا بھی غیرت ہوئی تو یہ خود ہی
مر جائے گا۔ گولی ضائع کرنے کی کوئی ضرورت
نہیں ہے۔“

اس نے کہا۔ ”خان جی ایسا آپ کا دشمن ہے۔ اگر
زندہ رہا تو آپ کے لیے خطرہ بن جائے گا۔“
”جو ہم نے کہا ہے وہ کرو۔“ خان جی نے اسے
جھڑک دیا۔ ”یہ کیا ہم سے دشمنی کرے گا؟ اس
بچارے کو انجکشن لگانے کے علاوہ آتا کیا ہے؟“

ایسے ہی وقت میں نیم بے ہوشی میں خدا سے دعا
کر رہا تھا کہ وہ مجھے گولی مار دیں۔ میرے لیے اب
جینے کا کوئی مقصد نہیں رہا تھا۔ ہاں میں اس وقت مرنا
چاہتا تھا۔ زندگی نے اس قدر زخم لگائے تھے کہ مجھے
موت مہربان لگنے لگی تھی۔ مجھ میں اگر بولنے کی سکت
ہوتی تو میں ان سے ضرور کہتا کہ ”مجھے گولی مار دو میں
جینا نہیں چاہتا۔“ مگر ہائے ری قسمت کہ میں اپنے
لیے موت مانگنے سے بھی قاصر تھا۔

اس کے بعد انہوں نے فائزہ کی لاش کو اور مجھے
ایک گاڑی میں ڈالا اور فارم ہاؤس سے نکل کر کسی
انجانی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ بہت دیر تک
گاڑی چلتی رہی۔ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں
مجھے کچھ بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس طرف کو جا رہے
تھے؟ پھر انہوں نے ایک جگہ گاڑی روک دی اور ہمیں
سڑک کے کنارے پھینک کر واپس چلے گئے۔

فائزہ تو لاش بھی احساسات و جذبات سے یکسر
عاری تھی مگر میں زندہ تھا گوکہ اس وقت میری حالت
کسی مردے سے بھی بدتر تھی لیکن احساسات و
جذبات پوری طرح کام کر رہے تھے۔ میرے
پورے جسم میں درد کی ناقابلِ شیسیم اٹھ رہی
تھی۔ اس دہری مار نے میرا جوڑ جوڑ ہلا کر رکھ دیا

تھا۔ مجھ میں اپنی جگہ سے ہلنے تک کی سکت نہیں تھی۔
فائزہ کی لاش مجھ سے چند قدم دور آڑی ترچھی حالت
میں پڑی ہوئی تھی۔ میں گھیسے ہوئے اس تک پہنچا اور
اسے ہاتھوں میں لے کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔
روتے روتے میری ہچکی بندھ چکی مگر سڑک پر سے نہ
کسی سواری اور نہ ہی کسی پیدل شخص کا گزر ہوا۔ جب
بہت زیادہ دیر گزر گئی تو مجھے تشویش لاحق ہوئی۔ ایسے
ہی وقت میرے اندر سے آواز آئی۔

”ڈاکٹر شاہو! کیا تم یونہی کسمپرسی کے عالم میں
مر جاؤ گے؟ کیا..... کیا..... تم دشمنوں کو معاف کر دو
گے؟ ارے تم کیسے مرد ہو۔ دیکھو انہوں نے تمہاری
معصوم بہن کا کیا حال کیا ہے؟ کیا تم ان سے انتقام
لیے بغیر یونہی بے بسی کی موت مر جاؤ گے؟ ارمان
اماں اور بابا کیا ان سب کا خون یونہی رائیگاں چلا جائے
گا؟ اٹھو مردو بزدل! اگر یونہی حقیر کیچڑے کی طرح
سڑک کے کنارے پڑے رہے تو مر جاؤ گے۔ اٹھو اب
تیری کوئی کمزوری دشمنوں کے ہاتھ نہیں رہی۔“

اندرونی آواز نے غیر متوقع طور پر میرے بدن
میں توانائی کی ایک لہری دوڑا دی اور میں جیسے تیسے کر
کے اٹھ کر کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اگرچہ اس
کوشش میں میری کراہیں نکل گئیں لیکن میں نے ضبط
کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ میں نے کہیں پڑھ تھا
کہ درد محسوس کرنے سے بڑھتا ہے۔ انسان جتنا
اسے محسوس کرتا ہے تکلیف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ میں
نے ذہن سے درد کے احساس کو جھٹک دیا تو حیرت
انگیز طور پر میری تکلیف کم ہوتی چلی گئی۔ یہ کسی
میرے ہی جیسے درد کے مارے کا تجربہ تھا جو اس وقت
میرے کام رہا تھا۔

میں نے ہاتھوں اور ناگوں کو ہلا جلا کر دیکھا۔ کہیں
بھی ٹوٹ پھوٹ کے آثار نہیں تھے۔ تب میں نے

اپنی پھٹی ہوئی قمیص کے دامن سے چہرے کو گزر گزر
کر صاف کیا اور پھر ارد گرد کے ماحول اور علاقے کا
بائزہ لینے لگا۔ ذرا سی کوشش سے میں نے اس
علاقے کو پہچان لیا۔ وہ ایک ذیلی سڑک تھی جو آگے جا
کر تنھا گلی جانے والی بڑی سڑک سے مل جاتی تھی۔
یہ فاصلہ کم از کم تین کلومیٹر تھا۔

میں اگر کسی طرح اس بڑی سڑک تک پہنچنے میں
کامیاب ہو جاتا تو پھر گولی استاد کے گیراج تک پہنچنا
مشکل نہیں تھا۔ لیکن مسئلہ فائزہ کی لاش کا تھا۔ کیونکہ
نہ تو میں اسے ساتھ لے جاسکتا تھا اور نہ ہی اس ویران
سڑک پر لا وارث چھوڑ سکتا تھا۔ تب میں نے ایک
فیصلہ کیا اور پھر فوراً اس پر عمل درآمد کرنے کے لیے تیار
ہو گیا۔ میں نے بہت دیر فائزہ کی لاش کو اٹھایا اور
اسے سڑک کے قریب موجود جھاڑیوں میں چھپا دیا۔
مجھے اپنے اس عمل پر کچھ تواتر ہوا مگر مجبوری تھی۔ اس
کے علاوہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں آگے چل
پڑا۔ جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ مگر مجھے چلنا
تھا۔ سو میں درد کے احساس کو دھکا کر آگے ہی آگے
بڑھتا رہا کہ اب پیچھے پلٹ کر دیکھنے کو کچھ بھی نہیں رہا
تھا۔ وقت کی بے رحم گردش نے میرے تمام رشتے
ایک ہی پل میں چھین لیے تھے۔ کل کا ڈاکٹر شاہ
زمان جو کسی مریض کی ہلکی سی تکلیف پر تڑپ جایا کرتا
تھا۔ آج وہی ڈاکٹر شاہ زمان ننگے پاؤں دردنی پل
سراٹے سے گزر رہا تھا۔ میں شفا یافتہ رہا اور صلے میں
قتل نے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ موت کے سودا
گروں نے مجھے موت مانگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مجھے
اب وقت کی گردش سے آگے نکلنا تھا۔ ہاں اس گردش
سے آگے نکل کر ہی میں اپنوں کے خون کا قرض چکا
سکتا تھا اور مجھے یہ قرض ہر حال میں چکانا تھا۔ موت

کے سارے پہرے تو زکریا کا تھا۔
میں جو چند گھنٹے قبل زندگی کو بوجھ سمجھ کر موت کی
تمنا کر رہا تھا۔ اب موت کو پیچھے چھوڑ کر زندگی کی
طرف بڑھ رہا تھا۔ چند گھنٹے قبل میں زندگی کو بے
مقصد سمجھ رہا تھا مگر اب انتقام کے جذبے نے زندگی
کو بامقصد بنا دیا تھا۔ میرے اس انتقام کی بھیئت
کتنے لوگوں نے چڑھنا تھا؟ میں نہیں جانتا تھا۔ جانتا
تھا تو صرف اتنا کہ بس انتقام لینا ہے۔

میں ایک جوش اور جذبے کے ساتھ آگے بڑھتا
رہا۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ میں سب اس بڑی سڑک
تک پہنچ گیا جو سیڑھی تنھیا گلی تک جاتی تھی۔ وہیں
کہیں راستے میں گولی استاد کا گیراج تھا اور یہی گیراج
میری نئی منزل کا پہلا پڑاؤ تھا۔ میں لفٹ کے انتظار
میں سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ وقفے وقفے سے
گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ مگر ابھی تک میرے مطلب کی
گاڑی نہیں گزری تھی۔ دراصل میں کسی ٹریکٹر ٹرائی کا
منتظر تھا۔ جن کے ڈرائیور عموماً ان پڑھ اور سادہ لوح
دیہاتی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ زیادہ سوال و جواب
نہیں کرتے بس اپنے کام سے کام لے رہے ہوتے ہیں۔

تقریباً نصف گھنٹے کے بعد مجھے ایک ٹریکٹر ٹرائی
آتی ہوئی نظر آئی۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جب وہ
قریب پہنچ گئی تو میں نے اسے رکنے کا اشارہ کر دیا۔
میری توقع کے عین مطابق ڈرائیور نے ٹریکٹر ٹرائی
روک دی۔ میں نے قریب جا کر سوال کیا۔ ”بھائی!
کیا آپ تنھیا گلی کی طرف جا رہے ہیں؟“

اس نے ایک نظر میرے چہرے پر ڈالی اور پھر بولا۔
”ہاں مگر آپ کون ہیں اور آپ کی یہ حالت کس نے
بنا دی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”بھائی! میں ایک ڈاکٹر ہوں اور
میری یہ حالت ڈاکٹروں نے بنائی ہے۔ انہوں نے

بڑھ گیا۔

ذرا سی دیر کے بعد ہم دونوں گیران کے کمرہ خاص میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے میں داخل ہونے سے قبل اس نے گیران میں کام کرنے والے ایک چھوٹے کو چائے لانے کے لیے دوازدا تھا۔

”ہاں اب بتاؤ آپ پر کون سی افتاد ٹوٹی ہے؟“ میرے بیٹھے ہی اس نے سبب چینی سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”گولی بھائی! مجھ پر جو افتاد ٹوٹی ہے اسے سنانے کے لیے پتھر کا کچھ چاہیے مگر نہ کرو میں یہ داستان اہم لفظ یہ لفظ بیان کروں گا۔“ اتنا کہہ کر میں نے کمرے ایام کی ساری کہانی اسے سنائی۔ جب میں فائزہ کے لئے اور مرنے کے واقعات بیان کر رہا تھا تو ضبط کی انتہی پر کشش کے باوجود میری آواز بھرائی اور آنکھوں میں نمکین پانی اتر آیا۔ گولی استاد کی پٹلیں بھی بھگک چکی تھیں اور وہ کسی بت کی طرح ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ جب یہ خوشحال کہانی ختم ہوئی تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”آپ کو تو پولیس اسٹیشن جانا چاہیے تھا آپ یہاں.....؟“

میں نے اپنی بھلی ہوئی پٹلیں صاف کرتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ ”نہیں دوست! اب پولیس کو درمیان میں لانے کی غلطی نہیں کروں گا۔ اب سچ اور جلا کے فرائض میں خودی سرانجام دوں گا۔ اب یہ وہ ہیں گے یا پھر میں۔“

”وہ تو بھیک ہے مگر پھر بھی رپورٹ تو درج کرانا ہی ہوگی۔“

”نہیں میں اپنی معصوم بہن کی مزید بے حرستی نہیں ہونے دوں گا۔ پولیس پوسٹ مارٹم کرانے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کرے گی۔ پولیس اسٹیشن کا انچارج افضل خان کا ہوتا ہے۔ وہ یہ میری مدد کرے گا؟“

الٹا مجھے ہی پکڑ کر بند کر دے گا۔“ میں نے انکار میں

جھکا ہوا ہے؟“

اس کے استفسار پر میرا جی بھر آیا مگر اب میں آنسوؤں کو دھتکار چکا تھا۔ کمزوروں کا یہ ہتھیار میں پھینک چکا تھا۔ اب میرے سینے میں ایک آتش فشاں کھول رہا تھا۔ جو بہت جلد پھٹنے والا تھا۔

میں نے کہا۔ ”یہاں نہیں اندر پیل کر بیٹھتے ہیں۔ میری داستان بہت طویل ہے۔ کھڑے کھڑے نہیں سنا سکتا۔“

”چلو آؤ۔“ وہ مجھے اشارہ کرتے ہوئے آگے

لے گیا۔

مجھے مارا پٹا اور پھر گاڑی اور رقم چھین کر فرار ہو گئے۔ میں پچھلے دو گھنٹوں سے مسلسل پیدل چلتے چلتے تھک چکا ہوں۔ اگر آپ مجھے گولی استاد کے گیران تک لٹ دے دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔“

وہ خندہ پیشانی سے بولا۔ ”اس میں مہربانی کی کون سی بات ہے۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔“ میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پیچھے ٹرائی میں سوار ہو گیا اور اس نے ٹریکٹر ٹرائی آگے بڑھا دی۔

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد اس نے مجھے گولی استاد کے گیران کے سامنے اتار دیا۔ میں ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گیران کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر کوئی استاد ایک گاڑی کے بونٹ پر جھکا اپنے فرائض منجمی انجام دینے میں مصروف تھا۔

میں نے نزدیک جا کر اسے پکارا۔ ”گولی استاد!“

وہ فوراً پلٹا لیکن مجھ پر نظر پڑنے ہی کو مجھ کے لیے پتھر کا بت بن کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور دکھ کی ملی جلی کیفیت طاری تھی۔ میری اس حالت کا شاید اس نے بھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ سچی اس کے چہرے پر حیرت منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے متعجب انداز میں پوچھا۔

”یہ..... کیا آپ نے کیا حال بنا رکھا ہے۔ کیا کسی سے جھگڑا ہوا ہے؟“

اس کے استفسار پر میرا جی بھر آیا مگر اب میں آنسوؤں کو دھتکار چکا تھا۔ کمزوروں کا یہ ہتھیار میں پھینک چکا تھا۔ اب میرے سینے میں ایک آتش فشاں کھول رہا تھا۔ جو بہت جلد پھٹنے والا تھا۔

میں نے کہا۔ ”یہاں نہیں اندر پیل کر بیٹھتے ہیں۔ میری داستان بہت طویل ہے۔ کھڑے کھڑے نہیں سنا سکتا۔“

”چلو آؤ۔“ وہ مجھے اشارہ کرتے ہوئے آگے

لے گیا۔

لے گیا۔

لے گیا۔

سر بلاتے ہوئے قطعی لہجے میں جواب دیا۔

وہ بولا۔ ”جیسے آپ کی مرضی بہر حال حکم کیجیے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ اگر گرم وغیرہ کی ضرورت ہو تو بلا جھجک بتائیے میرے پاس جتنے ہوئے سب پیش کر دوں گا۔“

”رقم کا بندوبست میں خود کر لوں گا۔ فی الحال فائزہ کے کفن و دفن کے لیے مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔“

”میں حاضر ہوں“ حکم کریں کیا کرتا ہے؟“ اس نے سعادت مندی سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”فائزہ کی لاش لا کر اس کی تجہیز و تکفین کرنی ہے۔ تمہارے پاس اگر کوئی گاڑی ہے تو فوراً نکالو۔“

وہ بولا۔ ”گاڑی تیار ہے لیکن پہلے آپ اپنا حلیہ درست کر لیں۔“ ایسے آپ کو علاج کی بھی ضرورت ہے۔ اگر کہتے ہیں تو پہلے ڈاکٹر.....“

”ڈاکٹر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے قطع کلامی کی۔ ”بس تم مجھے اپنا کوئی لباس دے دو اس کے بعد چلیے ہیں۔“

اسی دوران چھوٹا چائے لے آیا۔ ہم نے جلدی جلدی چائے پی۔ اس کے بعد میں نے حتی الوسع اپنا حلیہ درست کیا اور پھر گولی استاد کے کپڑے پہن کر تیار ہو گیا۔ گوکہ یہ کپڑے معمولی سے تنگ تھے مگر برے نہیں لگ رہے تھے۔ پھر گولی استاد نے گاڑی نکالی اور ہم اس سڈان مقام کی طرف روانہ ہو گئے جہاں جھڑیوں میں فائزہ کی لاش کفن و دفن کی منتظر تھی۔

وہاں جانے اور فائزہ کی لاش لانے میں ہمارے دو گھنٹے صرف ہو گئے۔ مقام شکر تھا کہ اس کام میں ہمیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ ہم نہایت راز داری کے ساتھ لاش لانے میں کامیاب ہو گئے

تھے۔ اب لاش کو نہلانے، کفنانے اور جنازہ پڑھ کر دفنانے کے مراحل باقی تھے۔ شریعت کی رو سے کسی عورت کی لاش کو عورت ہی غسل دے سکتی ہے چنانچہ اس مقصد کے لیے گولی استاد کی ماں کو تکلیف دی گئی۔ وہ گولی استاد کی طرح ٹیک ملنسار اور مصیبت میں دوسروں کے کام آنے والی خاتون تھی۔ اس نے فائزہ کو بیٹی سمجھتے ہوئے غسل دیا اور پھر کفن پہنا دیا۔

اس دوران گولی استاد نے اپنے چند شاگردوں کے ساتھ مل کر گیران کے عقب میں ذرا فاصلے پر ایک کھلی جگہ پر قبر کھود ڈالی تھی۔ پھر گولی استاد اور اس کے شاگردوں کے ساتھ مل کر میں نے امامت کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے فائزہ کی نماز جنازہ ادا کی۔ نماز جنازہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی معصوم اور بیاری بہن کا جسد خاکی لحد میں اتار دیا۔ جب قبر پر مٹی ڈالنے کا وقت آیا تو ضبط کی لاکھ کوشش کے باوجود میری آنکھیں بھرتی ہو گئیں۔

تب گولی استاد میری ڈھارس بندھاتے ہوئے بولا۔ ”صبر کرو شاہ زمان خدا کی سبکی مرضی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”ایک نہ ایک دن سچی کو مرنا ہے لیکن میری بہن بہت بد قسمت تھی۔ قبر بھی ملی تو کہاں آکر۔ اس ویرانے میں جہاں کوئی فاتحہ پڑھنے والا بھی نہیں ملے گا۔“

وہ بولا۔ ”فکر کیوں کرتے ہو؟ میں ہوں ناں! یہ میری بھی تو بہن ہی تھی۔ میں ہر روز اس کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر جنگی پھول ڈالا کروں گا۔“ اتنا کہنے کے بعد وہ واقعی آگے بڑھا اور کچھ فاصلے پر موجو جنگی پھول توڑ لایا۔

”یہ لو اور اپنے ہاتھوں سے بہن جی کی قبر پر ڈال دو۔“

میں نے اس کے ہاتھ سے پھول لے کر فائزہ کی

”کیا ہے اس میں؟“ میں نے لٹافہ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

”خود ہی دیکھ لیں۔“
میں نے لفافہ کھول کر چیک کیا تو اس میں ایک
ہزار روپے والے دس نوٹ رکھے ہوئے تھے۔
”نہیں، دوست!“ میں نے لفافہ بند کر کے اس کی
طرف بڑھا دیا۔ ”میں یہ نہیں رکھ سکتا۔ پہلے ہی تم نے
میرے لیے اتنا کچھ کیا ہے کہ اب مزید کچھ لیتے ہوئے
میرا ضمیر مجھے غلامت کرے گا۔“ کیڑا برامت منانا۔“

”دوست! میں تمہارا یہ احسان عمر بھر یاد رکھوں گا تم نے واقعی دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ زندگی نے مہلت دی تھی تو کسی دن یہ قرض چکا دوں گا۔“

اس نے شکایتی انداز میں کہا: ”دوست بھی کہتے ہو اور احسان چکانے کی بھی بات کرتے ہو؟ کیا یہ میرے ساتھ نا انصافی نہیں ہے؟ دوست بھی دوست پر احسان نہیں کرتا بلکہ دوستی کا حق ادا کرتا ہے۔ میں نے آپ کے لیے جو کچھ بھی کیا ہے۔ یہ احسان نہیں ہے دوستی نبھائی ہے میں نے۔“

سے بھول ہوئی۔“
 ”چونکہ کوئی بات نہیں اب کیا ارادہ ہے؟“
 ”فی الحال تو راولپنڈی جاؤں گا۔ وہاں پہنچ کر
 سوچوں گا کہ آگے کیا کرنا ہے۔“

”کل صحیح سویرے ان شاء اللہ نکل جاؤں گا۔“

میں نے جواب دیا۔
 ”ٹھیک سے کل صبح آپ کو گاڑی تیار ملے گی اور
 اگر آپ مخصوص نہ کریں تو پینز یہ رہیں۔“ اس نے
 جیب سے ایک سفید رنگ کا لفافہ نکال کر میری طرف

بڑھاتے ہوئے گزارش کی۔

۞.....۞.....۞
 راوی پنڈی پانچ کر میں نے ایک دن آرام کیا اور
 دوسرے دن استغفار لکھ کر ایم او کی تہنیل پر رکھ دیا۔ ڈاکٹر

خالد لطیف ناصر اس پرائیویٹ اسپتال کے، لک
تھے بلکہ وہاں کے ایم او بھی خود ہی تھے۔ انہوں نے غور
سے میرا ششماغی پڑھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولے۔
”شاہ زمان! آپ ایک قابل ڈاکٹر ہیں۔ میں دل

سے آپ کی قدر کرتا ہوں۔ اگر مجھ سے یا اسپتال کی انتظامیہ سے کوئی شکایت ہے تو آپ بلا جھجک بتا سکتے ہیں مگر متعنی!..... پلینرز اپنے پاس رکھیں۔“

میں نے کہا۔ ”سر! مجھے کسی سے بھی کوئی شکایت نہیں ہے۔ بس میرے حالات مجھے سروس جاری رکھنے کی اجازت نہیں دے رہے۔“

”کیوں؟ حالات کو کیا ہو گیا ہے؟“ انہوں نے

استفسار کیا۔
 ”سر! حالات نے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔
 میں گھر سے بے گھر ہو گیا ہوں۔ بلکہ یوں بھی نہیں کہ
 میرا سب کچھ لٹ چکا ہے۔ مجھ بھی باقی نہیں بچا۔
 ایسی صورت حال میں یہ سڑکیں جاری رکھنا میرے
 لیے ناممکن ہے۔ بس آپ یہ استغفیٰ منظور کر لیں۔ یہ
 آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔“

وہ بولے۔ ”بھئی کچھ پتا تو چلے کتا؟ پر کون سی افتاد ٹوٹ پڑی ہے؟ ہو سکتا ہے کہ میں آپ کا مسئلہ حل کر دوں۔“

اس بار انہوں نے قدرے چوک کر میری طرف دیکھا تو میں نے گزار شانہ انداز میں کہا۔ ”پلیز سر آپ میرے استعفیٰ پر سائن کر دیں۔ مجھ پر جو گزند ہے وہ میں نہیں بتاؤں گا۔ پلیز آپ صراحت بھی مت کریں۔“

یہاں ایک دوکالمی خبر پر جم کر رہ گئیں۔ خبر کی
ٹی بھی۔ ”بد بخت بننے کے ہاتھوں بوڑھے باپ کا
” نیچے خبر کی تفصیل تھی۔ (نمائندہ خصوصی) سینگ
بنا بوڑھے باپ کو نہایت بے دردی سے قتل
رنے کے بعد نوجوان بہن کو ساتھ لے کر لا پتا
لیا۔ پولیس بڑی شد و مد کے ساتھ قاتل کو تلاش کر
ا ہے۔ قاتل ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر ہے۔ جو
پینڈی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں بھی کام کرتا
ہے۔ قاتل کا نام ڈاکٹر شاہ زمان بتایا گیا ہے۔
خبر کیا تھی؟ میرے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں
ن۔ یہ یقیناً انور خان جیسے بے ایمان اور رشوت خور
بس افسر کی کارستانی تھی مگر ایک بات میری سمجھ میں
ی طرح نہیں رہی تھی کہ اس نے اتنی دیر سے یہ خبر
بول گئی تھی؟ حالانکہ اس حادثے کو وقوع ہوئے
ا بارہ روز گزر چکے تھے۔ انیس تو اس واقعہ کے
سرے دن ہی یہ خبر لگوائی جا چکی تھی۔ بہر کیف اس
کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں اور میں صرف اندازے
عم کر سکتا تھا کیونکہ اصل وجہ میری نگاہوں سے
جل قہمی تاہم ایک بات میرے لیے اطمینان بخش تھی
لہ خبر کے ساتھ میری تصویر نہیں لگائی گئی تھی۔ شاید
رخان کو میرے گھر سے میری کوئی تصویر نہیں ملی تھی۔
اس دوران ایک میرے نے نیپل پر ناشتا لگا
یا تھا۔ میں نے اخبار کو پلٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور
مر ناشتا کرنے لگ گیا۔ ناشتے کے بعد میں نے ایک
لب چائے منگوائی اور آہستہ آہستہ چسکیاں لینے لگا
مگر میرا ذہن مسلسل اس خبر میں الکا ہوا تھا۔ اس
لاقے میں مجھے کئی لوگ جانتے تھے۔ حتیٰ کہ جس
ستوران میں اس وقت میں بیٹھا ہوا تھا اس کے عملے
کے بھی کئی افراد مجھ سے اچھی طرح واقف تھے بلکہ ان
ن سے چند ہیروں نے تو میرا فلیٹ بھی دیکھا ہوا تھا۔

پھر اچانک ایک خیال نے میرے جسم میں سنسنی کی
ایک لہر دوڑا دی۔ ہمارے ایم او ڈاکٹر خالد لطیف صبح
سورے ہی اخبار پڑھنے کے عادی تھے اور میری بد بختی
کہ وہ اخبار بھی وہی پڑھتے تھے جس میں میری خبر لگی
ہوئی تھی۔ دودن قبل ہی تو انہیں میں نے اسٹعنی پیش کیا
تھا اور ان کے اصرار کے باوجود انہیں سروس چھوڑنے
کی وجہ نہیں بتائی تھی اور اب یہ خبر پڑھ کر تو وہ بغیر دیر
لگائے پولیس کو انعام کر دیں گے۔ اس خوفناک خیال
نے لحد بھر کے لیے حقیقتاً میرے رونگٹے کھڑے
کر دیے تھے مگر یہ خوف زدہ ہونے کا وقت نہیں تھا بلکہ
فوراً وہاں سے نکلنے کا وقت تھا۔
میں نے جلدی سے چائے ختم کی اور پھر بل ادا
کرنے کے لیے کاؤنٹر کی طرف چل دیا۔ بل ادا
کرنے کے بعد میں جونہی پلٹا میرے قدم زمین میں
پوست ہو کر رہ گئے۔ رستوران کے ہال میں چند
پولیس والے دندناتے ہوئے داخل ہو رہے تھے اور
فرار کے تمام راستے مسدود نظر آ رہے تھے۔ دل
میرے پہلو میں پارے کی طرح اچھل رہا تھا۔
(ان شاء اللہ بانی آئندہ ماہ)



والا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ میں اس کی زندگی سے
بہت دور جانے والا ہوں۔ ایسے ہی وقت مجھے کسی
دش کا ایک قول شدت سے یاد آنے لگا کہ ”محبت
خود غرض ہوتی ہے۔“ واقعی مٹی نے اس روز اپنے
روپے سے ثابت کر دیا تھا کہ ”محبت خود غرض ہوتی
ہے۔“ مگر میں محبت میں خود غرض بننے کے لیے تیار
نہیں تھا۔ سوشی کو جھوٹی باتوں سے بہار ہا تھا۔
میں اگر اسے سچ بتا دیتے کہ میں کیا کرنے والا ہوں
تو وہ یقیناً میرے پیروں کی زنجیر بن جاتی۔ جب کہ
مجھے یہ منظور نہیں تھا اور دوسری بات یہ ہے کہ میں کسی
عورت کو اس معاملے میں راز دار بنانے کا رسک نہیں
لے سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ راجا صاحب جیسے شخص کی
جی گنڈ۔ جو میرے دشمنوں سے ملا ہوا تھا۔ مٹی کے
منہ سے بھی کبھی اس کی بات نکل سکتی تھی۔
میں نے قدرے توقف سے بناوٹی انداز میں کہا۔
”تم خوش ہو تو میں بھی خوش ہوں اور ہاں شیر افضل
خان کا نمبر بل جائے تو مجھے ایس ایم ایس کر دینا۔“
”بے فکر ہو کر دوں گی۔“ اس نے مضہن انداز
میں جواب دیا اور میں اجازت طلب انداز میں اٹھ کر
کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے کونھی کے صدر دروازے تک
چھوڑنے کے لیے آئی اور پھر خدا حافظ کہتے ہوئے
واپس پلٹ گئی۔

اس نے جواب دیا۔
”میں نے کہا۔“ میں مستقل طور پر آ رہا ہوں اور
شاید وہیں کیراج ہی میں سکونت اختیار کر لوں۔ تمہیں
کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا نا؟“
وہ بولا۔ ”اعتراض کیسا بلکہ مجھے تو خوش ہوگی کہ
آپ مستقل طور پر رہے ہیں۔“
”بہت بہت شکریہ دوست۔ تم بھائیوں سے بڑھ
کر میرے کام آ رہے ہو۔“
”میں آپ کو اپنا بھائی ہی سمجھتا ہوں۔“ اس نے
اپنائیت سے کہا۔ ”اور بھائیوں کا شکریہ ادا نہیں
کیا جاتا۔“
”سوری دوست آئندہ خیال رکھوں گا۔“ میں نے
ندامت کا اظہار کیا۔

اس کے بعد چند مزید باتیں ہوئیں اور پھر میں
نے ”خدا حافظ“ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔
صبح سویرے اٹھ کر میں نے جلدی جلدی غسل کیہ
اور پھر لباس پہنچنے کرنے کے بعد قہری رستوران کی
طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے ناشتے کا آرڈر
دیا اور پھر وقت گزاری کے لیے نیپل پر پڑا ہوا اخبار
اٹھالیا۔ تقریباً تمام خبریں ہی وحشت ناک و الم ناک
تھیں۔ قتل، اغواء برائے تاوان، دھماکے، چوری، دیکھتی
اور کرپشن سے متعلق خبروں سے اخبار بھر پڑا تھا۔ معا

دوسرے دن اس نے وعدے کے مطابق شیر
افضل خان کا نمبر ایس ایم ایس کر دیا جو میں نے اس
وقت اپنے موبائل فون میں محفوظ کر لیا۔ اب مجھے
کرایہ کا یہ فلیٹ چھوڑنا تھا۔ چنانچہ میں فلیٹ کے
مالک سے ملا اپنا حساب بے باق کیا اور چوٹیں
گھنٹوں کے اندر فلیٹ خالی کرنے کا وعدہ کرتے

مریم کو لگتا تھا ماں کے ساتھ دنیا کی ہر خوشی جیسے ختم ہوگئی ہو لیکن سہیل کی محبت اور ساس کی شفقت اس کو واپس زندگی کی طرف کھینچ لاتی پھر اوپر سے دو بیٹیاں ہو گئیں تو گھر اور چاب کی مصروفیات نے اسے غم کے الاؤ سے باہر نکال لیا۔ سہیل صحیح معنوں میں اس کے شوہر ہی نہیں دوست بھی تھے اور ساس بھی عام روایتی ساسوں کے برخلاف بے حد شفیق، حلیم الطبع اور درمند دل کی مالک تھیں۔ ساسوں والی کوئی جوبان میں نہیں تھی۔ سہیل کی اکلوی بڑی بہن زوارہ پر اور ان کے شہر بھی خدو سے محبت کا چمکا پھرتا خزانہ تھے لیکن سہیل کے بے رحمی نہیں۔ مریم کی پر سکون زندگی میں اپنے ناقابل فہم رویہ کی وجہ سے خار بن کر چھپتے تھے۔

زوارہ کے تین سال بعد جب سہیل ہوا تو گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی فیملی مکمل ہوگئی تھی دونوں بچے ماں باپ کی توجہ اور محبت و شفقت کا مرکز تھے لیکن جب سہیل کے دس سال بعد سہیل دنیا میں آیا پھر سہیل جسمانی طور پر کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ شکل بھی دبا دگ سا تھا۔ زوارہ پر اور سہیل سرخ و سپید اور پُر کشش جب کہ سہیل کمزور اور لاغر لیکن صبا بے حد خاموش صابر اور معصوم۔ اکثر لوگ سہیل کی معصومیت دیکھ کر سبب تھے کہ سہیل جیسے دس بچے پالنا بھی آسان ہے جب کہ سہیل کی ضد غصے اور بد مزاجیوں سے سب کانوں کو ماتھ لگاتے تھے۔ ماں باپ کے لیے تو ہر اولاد برابر ہوتی ہے لیکن چونکہ سہیل دس سال بعد ہوا تھا اور نظر نا معصوم تھا تو قدرتی طور پر ماں باپ اور بڑی بہن کی توجہ اس پر زیادہ ہوگئی تھی۔ اب تک سہیل گھر بھر کے لیے جھٹیلی کا چھلا بنا ہوا تھا۔ اب اس کے لیے سہیل کا وجود نا قابل برداشت تھا۔ وہ اپنے علاوہ کسی کو اہم گردانے پسند نہیں کرتا تھا اور اسی لیے وہ سہیل کو ستانے اور زلزلے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا جب کہ سہیل بھائی کا دیوانہ تھا پھر قدرت کی تتم ظریفی یہ رہی کہ ابھی سہیل تین سال کے

ہی تھا کہ باپ کی شفقت سے محروم ہو گیا تب اسے کو اتنے قیمتی نقصان کا اور اک نہیں تھا لیکن کم عمری کی شہمی نے اسے ماں اور بہن کی محبت کا محور بنا دیا۔ زوارہ کی شادی کے بعد بیوی کی محبت دیکھتے ہوئے اس کا شوہر حمزہ بھی سہیل کا اسی قدر خیال رکھتا تھا۔ اپنے اخلاقی منکسر المزاج اور عاجزانہ طبیعت کی وجہ سے سہیل پورے محلے کی پسندیدہ شخصیت تھا۔ دونوں بھائیوں کی طبیعت میں زمین و آسمان کا فاصلہ تھا لیکن سہیل کو اپنی والدہ کی جانب سے محبت کی کمی خانی نظر ہی نہیں آتی تھی مگر یہ وہ وہاں ہی سے نہیں کی۔ انہیں لگتا اور نہ اسرار دینے سے خوف زدہ تھی۔ بظاہر رشتہ کی ذمیت کی وجہ سے وہ مریم سے بڑی شفقت سے پیش آتا تھا۔ یوں بھی شادی کی پہلی رات ہی ساری فیملی کو مریم سے متعارف کراتے ہوئے اس نے بطور خاص سہیل کا ذکر کیا تھا۔

”دیکھو مریم! بھائی جان میرے لیے باپ کا درجہ رکھتے ہیں۔ باپ کی شفقت سے تو میں محروم ہی رہا لیکن بھائی جان نے بھی ان کی کمی محسوس نہیں ہونے دی انہوں نے خود تعلیم کو خیر باد کہہ کر میرے لیے علم کی شمع روشن کی۔ میں آج جو بھی ہوں ان کی وجہ سے ہوں اس لیے ان کے احترام میں بھی کی نہ ہونے دیتا اور مجھے یقین ہے باقی گھر والوں سے بھی تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی اور رہا یہ خاکسار تو وہ اول دن ہی سے بندہ بے دام بلکہ غلام ابن غلام ہے۔“ آخر میں سہیل کا لہجہ شوخ ہو گیا اور اسی دن مریم نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ وہ سہیل کو کبھی مایوس نہیں کرے گی اور اس کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرے گی۔

ایک ماہ کی چھٹیاں تو خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے ہوئے چمک چمکتے گزر گئیں پھر چھٹیاں ختم ہوتے ہی دونوں نے کالج جوائن کر لیا۔ سہیل کی اپنی گاڑی تو بھی نہیں اس لیے دونوں ہی مریم کی گاڑی میں

ساتھ ہی نکلتے تھے۔ سہیل انگلش پڑھاتے تھے جب کہ مریم کا سہجیت سائنس تھا۔ اس لیے عموماً پریکٹیکل سب سے آخر میں ہوتا تھا تا کہ طلباء کلاس رومس نہ کریں اس لیے سہیل مریم کے لیے رُک جاتا اور اکثر جنیڈ بھی لپٹی دینے کے خیال سے بیٹھا رہتا۔ جنیڈ کا کافی سال پہلے ایکسٹنٹ ہو گیا تھا جان تو بچ گئی لیکن ناٹک میں معمولی سا نقص رہ گیا تھا جو بظاہر نظر بھی نہیں آتا تھا لیکن اس نے خود ہی اس خامی کا جواز بنا کر اس ڈاکٹر سے شادی سے انکار کر دیا جس سے پسند سے منگنی کی تھی پھر لاکھ اصرار پر اس نے شادی کے لیے ہامی نہیں بھری۔ اس کا تعلق متحول گھرانے سے تھا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اور پڑھانا اس کا پیش نہیں شوق تھا عبادت تھی۔ مریم اور سہیل دونوں ہی اس کا بے احترام کرتے تھے۔ ہر چیز بالکل ٹھیک تھی لیکن سہیل کا رویہ مریم کی سمجھ سے بالاتر تھا اس کی نگاہوں سے وہ گھبرا جاتی تھی اسے عجیب طرح کا احساس ہوتا تھا جسے وہ کوئی نام دینے سے قاصر تھی۔ ایک دوسرے جب تنہائی میں اس نے سہیل کا مذاق اڑایا تو مریم کو بے حد ناگوار لگا۔

”مریم! تمہارا اور سہیل کا کوئی جوڑ نہیں حور کے پہلو میں لنگور۔“ یایوں کہو کہاں راجہ بھوج کہیں گنگو تیلی۔۔۔۔۔“

مریم نے بھی مہارت سے بات کو مزاح کا رنگ دیا۔ ”بھائی جان! یہ زیادتی ہے آپ مجھے بھی لنگور اور کبھی تیلی کہہ رہے ہیں کیونکہ سہیل کہہ اراور گفتار کی جس بلندی پر ہیں اس کا تو میں عشر عشر بھی نہیں۔ ان کے سامنے تو میں خود کو کوتاہ قامت سمجھتی ہوں سچ پوچھیے تو مجھے سہیل سے محبت ہی نہیں ان پر فخر بھی ہے۔ لاکھ بار شہر ادا کرتی ہوں کہ اللہ نے سہیل جیسے شخص کو میرا نصیب بنایا۔“

بات مذاق میں مل گئی لیکن مریم کے دل میں سوئی کی طرح پیوست ہوگئی۔ عذرا بھائی ویسے تو بہت اچھی تھی لیکن مضر کرنے کا کوئی موقع وہ بھی ہاتھ سے جانے نہ

دیتی تھی البتہ ساس بالکل بے ضرر اور شفیق خاتون تھیں جن کا گھر یلو سیاست سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ تھیں اور ان کا مصلیٰ۔ بچا اور ان کے میاں جنب آتے صحیح معنوں میں مریم کھن آتھی کیونکہ وہ دونوں ہی بے حد ہمدرد اور محبت والے تھے۔ مریم کو بیٹا بیٹا کہتے ان کا منہ سوکھتا تھا۔ ان ہی کے مشورے پر مریم نے شام کا کام خود سنبھال لیا تھا اور ایک کل وقتی ملازمہ بھی رکھ لی تھی تاکہ کسی کو شکایت نہ ہو وہ پھر کو تو وہ دونوں میاں بیوی اکثر کانچے سے ہی کچھ کھا پتی کرتا جاتے تھے لیکن رات کو چونکہ سب اکٹھے کھانا کھاتے تھے اس لیے وہ اہتمام سے پکاتا تھا جس کی ذمہ داری مریم پر تھی۔ جو وہ خوش اسلوبی اور خندہ پیشانی سے اٹھار ہی تھی اور اسے اپنی ماں کی تربیت پر فخر محسوس ہوتا تھا جس نے اسے سرائی کر جینے کا حوصلہ دیا تھا اسی دوران وہ دو بیٹیوں کی ماں بن گئی تو کچھ حوصلہ بھی پست ہونے لگا۔ اب سہیل اور عذرا نے اٹھتے بیٹھتے کہنا شروع کر دیا تھا۔

”اب تم نوکری چھوڑ دو بیٹیوں کو تمہاری زیادہ ضرورت ہے ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ دو۔ بہت ہوگی نوکری کی عیاشی!“

مریم پریشان تھی سہیل نے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا تھا تب یہ ساس اور بیٹی ہی تھیں جنہوں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

”دیکھو بیٹا! تم اتنی اچھی گورنمنٹ جاب چھوڑنے کی ساقبت نہ کرنا۔ سال کی مشکل ہے بیٹیاں اسکول جانے لگیں تو اتنی پریشانی نہ ہوگی۔“

لیکن بیٹیاں کیا کر لیں بھائی جان اور بھائی اٹھتے بیٹھتے کہتے رہتے ہیں کہ ملازمت چھوڑ دو بیٹیاں بگڑ جائیں گی۔ ”مریم! مرد باہمی ہوگی۔“

”ارے چھوڑو سہیل اور اس کی بیوی کو۔۔۔۔۔ خود تو ساری عمر پڑھ کر نہیں دیا اور کوئی پڑھا لکھا بھاتا بھی نہیں۔۔۔۔۔ ہم کیا حقیقت نہیں جانتے کہ ابا کے مرنے کے بعد اس کو پڑھائی چھوڑنے کا بہانہ چاہیے تھا ورنہ ابا

کی زندگی میں کون سا اس نے تیر رہا تھا۔ بمشکل سہلی لے کر میٹرک کیا تھا وہ بھی لبا کی ڈانٹ ڈپٹ کی وجہ سے پھر لاکھ میرے اور تمہارے بہنوئی کے اصرار کے اس نے کتابوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ہاں سہیل شروع سے کتابوں کا کیزر تھا۔ اس لیے تم نیل کے کہے پر کان مت دھرو زیادہ سے زیادہ ایک لڑکی بچیوں کے لیے رکھ لو اور نگرانی کے لیے اماں ہیں نا۔۔۔۔۔۔ بچیا پیار سے مریم کو سمجھانے لگیں۔

”دیکھو یہ وقت مشکل ضرور ہے لیکن اگر تم نے صبر اور ہمت سے کام لیا تو گزر رہی جانے گا اچھی خاصی نوکری کو لوات مارنا کفرانِ نعمت ہے یہ میرا اخلصانہ مشورہ ہے باقی فیصلہ تو تمہیں خود کرنا ہے کیونکہ یہ تمہاری زندگی ہے اور اس پر سب سے پہلا حق تمہارا ہے اور ہاں۔۔۔۔۔۔ وہ چونک کر بولیں۔ ”تم جاہو تو صبح جاتے وقت بچیوں کو میرے پاس چھوڑ جایا کرو اور واپس میں لے لیا کرو خیر میری بچیوں کا کچھ پر بھی کچھ حق ہے۔“ انہوں نے دونوں بچیوں کو گلی لگاتے ہوئے پیار سے کہا۔

زندگی بے حد مشکل ہو گئی تھی۔ مریم نے بچیا کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے عذرا بھائی اور بھائی جان کی باتوں پر کان دھرنے چھوڑ دیے تھے وہ دونوں بچیوں نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ بھی بھی بیٹا نہ ہونے کی ہلک مریم کو بے چین کر دیتی تھی لیکن سہیل بیٹوں کا دیوانہ تھا بلکہ وہ اکثر مذاق میں کہتا تھا ”یاد ایک بیٹی اور آجائے تو سمجھو میرے لیے جنت پکی!“

مریم کو اس کی محبت اور خلوص پر فخر تھا۔ بچیا کے بھی دو بیٹے تھے اور بھائی جان کے بھی۔ اس لیے بچیوں کو داوی کے علاوہ پھوپھی اور پھوپا کی بھی محبت حاصل تھی یوں بھی وہ دونوں بے حد مہذب شائستہ اور سمجھ دار تھیں دونوں کا شمار اسکول کے بہترین طلباء میں ہوتا تھا جب کہ نیل کے دونوں بیٹے ماں باپ کا ریتو تھے۔ پڑھنے کے چور تھے شریر اور بد مزیز۔ یوں قدرتی طور پر داوی کا

چھکاؤ بھی پوتیوں کی طرف زیادہ ہو گیا تھا جو تہذیب اور میٹرک کا مربع تھیں۔ نیل اور عذرا کو دونوں بچیاں ایک آنکھ نہ بھائی تھیں جن کا بھی کبھی مریم کو احساس ہو جاتا تھا پھر بھی وہ اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکی تھی جس نے اسے اتنا اچھا شوہر اور سسرال دیا تھا ورنہ اس کا دنیا میں تھا ہی کون۔ اسی لیے وہ عذرا اور نیل کی باتوں کو منس کرنا لے دیا کرتی تھی کہ جہاں پھول ہوں وہاں کانٹے تو ہوتے ہی ہیں۔

مگر مریم کی خوشیوں کی عمر بہت مختصر تھی یا پھر اس کی خوش گوار ازدواجی زندگی کو کسی حاسد کی نظر لگ گئی تھی کہ ہنستا ہنستا گھر گھولوں میں ویران کھنڈ بن گیا۔ اس دن طبیعت کی خرابی کی وجہ سے مریم گھر پر ہی تھی اور سہیل اکیلے گاڑی لے کر کالج گئے تھے کہ ٹرانس نے اور ٹیک کرتے ہوئے اس کی چھوٹی سی گاڑی کو روک ڈالا۔ سہیل کو اگلی سانس لینے کا موقع بھی نہیں ملا اور بیوی اور بچیوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر وہ رانچی ملک عدم ہوا۔ موت بھی کتنی سفاک ہوتی ہے نہ موصوم بچے نظر آتے ہیں نہ جوان بیوہ نہ بوڑھی ماں کی سسکیں۔ مریم کی زندگی تو بے آب و گیاہ چھیل میدان کی طرح ہو گئی تھی۔ اس کو لگتا گھر کی دیواریں اس کو گھنچ رہی ہیں ابھی احساس ہوتا وہ ایسے گھر میں رہ رہی ہو جس کی نہ چھت اپنی ہونڈ میں۔ بچیوں کا ساتھ نہ ہوتا تو شاید وہ حرام موت کو گلے لگانے سے بھی دریغ نہ کرتی۔ سہیل کی رفاقت اس کی محبت و چاہت اور اس کے ساتھ گزر رات و وقت اسے گھٹنوں خون کے آنسو رلاتا۔ بچیا اور ان کے میاں اسے غم کے اندھیروں سے نکلنے کی کوشش کرتے۔ سہیل کے واحد اور قریبی دوست چند فون پر اس کو تسلی دیتے۔ چند نے عدت کے دوران اس مشکل وقت میں مریم کا بازو ساتھ دیا اور بچیوں کو اسکول چھوڑنے اور لانے کی ذمہ داری خود اٹھالی۔ اس پر سب سے بڑا اعتراض نیل کو تھا۔

”یہ غیر آدمی کون ہوتا ہے ہمارے گھر کی معاملات میں دخل دینے والا۔۔۔۔۔۔؟“ بچیوں کو انگٹھ میڈیم اسکول

میں پڑھانا ضروری تو نہیں وہ بھی اتنی دور۔ میرے بچوں کے اسکول میں داخل کر دیں قریب ہی ہے ہیدل مل کر چاروں چلے جایا کریں گے۔“

اس نے بچیوں کے بہترین مستقبل کے لیے انہیں شہر کے اعلیٰ اسکول میں داخل کروایا تھا۔ مریم کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا مگر اس کے بولنے سے پہلے اماں بول آئیں۔

”نہیں بالکل نہیں۔ میرے بچے کی زندگی میں جہاں بچیاں پڑھ رہی تھیں اب وہیں جائیں گی اور رہا چھوڑنے اور لینے کا سوال تو یہ ذمہ داری میں نے خود جنید پر ڈالی ہے تم اس کی فکر مت کرو۔“ اماں کا لہجہ سخت ہو گیا اور نیل کھسپانے ہو کر اٹھ گئے۔

عدت کے بعد مریم نے کالج جانا شروع کر دیا۔ ابھی تک تو اماں اس کے کمرے میں سو رہی تھیں مگر وہ پوری رات بے چین رہیں کیونکہ انہیں گھنٹوں کے دردی وجہ سے اے سی کی کولنگ سے تکلیف تھی۔ اس کے کمرے میں سونے کی وجہ سے یہ تکلیف بڑھ جاتی تھی اور مریم کو بڑی شرمندگی ہوتی کیونکہ نیل بھائی بھی اس کو بار بار جتاتے تھے کہ اس کی وجہ سے اماں تکلیف اٹھا رہی ہیں۔

عدت کے بعد ان کے آرام کے خیال سے اس نے اماں کو اپنے کمرے میں سونے پر مجبور کر دیا لیکن پہلی مرتبہ اسے نیل کی کئی شدت سے فحش ہوئی۔ اسے لگا صبح معنوں میں وہ آج بیوہ ہوئی ہے۔ پوری رات روتے اور ڈرتے گزر گئی۔ صبح اماں نے اس کی سوچی آنکھیں دیکھ کر سوال کیا۔

”رات ٹھیک سے سوئی نہیں یا روتی رہی ہو؟“

”اماں! ڈر لگ رہا تھا۔“ اس کی آواز ہیرا گئی۔

”بیٹا!“ اماں نے اس کے سر کو تھپتھپایا۔ ”یہ ڈر تو اب ساری عمر تمہارے ساتھ رہے گا شوہر کے بغیر عورت کبھی تجوری ہوئی ہے کیونکہ جب محافظ نہ ہو تو عورت کو خود

بہادر بننا پڑتا ہے۔ اب تمہیں مرد بننا ہے حوصلہ بکڑنا ہے۔ آج میں ہوں کل نہیں ہوں گی تو تمہیں خود حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ تمہیں خوف کے حصار سے نکل کر اپنی بچیوں کے لیے ہمت بکڑنی ہے اور ہاں۔۔۔۔۔۔ وہ چونک کر بولیں۔ ”سو تے وقت ٹمرہ لاک ضرور کر لیا کرو!“

پہلے دن مریم نے دروازہ لاک کیا تو بچیوں کو گری ستانے لگی کیونکہ اب وہ اے سی کا بل دینے کے قابل نہیں رہے تھے۔ مجبوراً اسے دروازہ چوٹ کھلنا پڑا اور پھر ساری رات وہ بے چین رہی اس کو لگتا کوئی کمرے میں آ جائے گا۔ پوری پوری رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہر بر لمبے انتخابی آنکھوں کا گمان ہوتا۔ خدشات اور واہموں کا آسیب اس کی فینڈاڑا دیتا۔ اس کو لگتا وہ بھی رات کو چین کی نیند سونہ پائے گی۔ اس دن بھی ابھی اس کی آنکھ ہی گلی تھی کہ اس کو اپنے قریب کسی کی موجودی کا احساس ہوا۔ اس کی چیخ نکل گئی اور سائیڈ نیل پر رکھا ہوا کالج کا گلدان چھٹانے سے ٹوٹ گیا۔

مریم کی چیخ پر سب سے پہلے اماں لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے میں آئیں۔ پیچھے پیچھے عذرا بھائی تھیں۔ وہ اماں سے پلٹ کر رونے لگی۔

”کیا ہوا۔۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

”اماں! کوئی کمرے میں تھا۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”یہاں تو کوئی نہیں ہے تم خواب میں ڈر گئی ہوگی۔“ عذرا بھائی نے تسلی دی۔

”عذرا! نیل کہاں ہے؟“ اماں نے چونک کر پوچھا۔

”وہ تو سو رہے ہیں آپ تو جانتی ہیں تھک کر آتے ہیں تو گھوڑے گدھے بچ کر سوتے ہیں۔ اس شور میں بھی ان کی آنکھ نہیں کھلتی۔“ عذرا بھائی نے سادگی سے تفصیلی جواب دیا۔

”مریم بیٹا! کیا تم کمرہ بند نہیں رکھتیں؟“

”بس بہت ہو گیا نہ کھلاؤ زہان میری! بس اس قصے کو سمجھیں رہے دو۔“ اماں غصے سے چیخ پڑیں پھر گلوگیر آواز میں بولیں۔ ”میں تو وہ بے بس ماں ہوں ایک گھٹنا کھولوں تو اپنا آپ نظر آتا ہے اور دوسرا کھولوں تو مجی اپنا ہی دکھتا ہے۔ کیا کہوں کیسے کہوں اور کس سے کہوں؟“ اماں منہ چھپا کر رونے لگیں۔

”نہیں! تمہیں بہت دکھ ہے نہ مریم کے نکاح ثانی کا۔ تم اسے بے شرم اور بے حیا سمجھتے ہو کہنے کو تو میں بھی بہت کچھ کہہ سکتا ہوں مگر کہہ نہیں چاہتا۔ یہ جنید کی میاں بیکل رہ پڑیں ہیں غور سے پڑھ لو۔ چہ ہو تو کسی سے نہ ہو۔ یہ تمہارا اس میں لکھا ہے کہ وہ بھی باپ نہیں بن سکتا۔ ایکسپٹ میں وہ اپنی یہ سناہیت کو سمجھتا تھا“ اسی لیے اس نے تاجر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور مریم بھی صرف اسی لیے اس سے شادی کرنے پر مجبوراً تیار ہوئی وہ بھی ہمارے اور اماں کے زور دینے پر کداسے معاشی معاشرتی مذہبی اور سماجی تحفظ مل جائے آج بھی سہیل اس کی یادوں میں زندہ ہے۔ وہ اور جنید گھنٹوں سہیل کی باتیں کرتے ہیں۔ جنید اپنے کمرے میں اور وہ بچیوں کے کمرے میں دروازہ بند کیسے بغیر سوتی ہے کیونکہ اسے ڈر اور خوف نہیں ہے اس کی عزت محفوظ ہے۔ تم میں اگر ذرا سی بھی شرم و حیا موجود ہو تو بس میں اتنا ہی کہوں گا کہ مریم کے بارے میں ایک لفظ بھی کہنے سے پہلے آئندہ ضرور دیکھ لینا۔“ حمزہ نے زوراً یہ کاہاتھ پکڑا اور گھر سے نکلے چلے گئے۔

نبیل کو لگا وہ اچانک آسمان کی بلند یوں سے زمین کی اٹھائے گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا ہے اندر ہی اندر بہت اندر.....!

میں جنید کی آمد کے خلاف تھا۔ ہماری ناک کے نیچے یہ گھناؤنا کھیل ہوتا رہا اور ہمیں ہی خبر نہ ہوئی۔“ ”مریم نے نکاح کیا ہے کوئی گناہ نہیں اور شرع میں شرم کسی.....؟“ وہ بھی عیسٰی اللہ کا حکم ہے کہ عدت کے بعد جتنی جلدی ہو سکے یود کا نکاح کر دینا چاہیے۔“ اماں نے اطمینان سے جواب دیا۔

”اماں! اب ان عورتوں کے لیے ہے جن کا کوئی نہیں ہوتا یوں کیوں کہتیں کہ جنید سے پہلے سے راہِ واسم بڑھ چکی تھیں۔“ نبیل جل کر بولے۔

”ہی.....! ان میاں تک زوراً یہ حمزہ کے ماتھے گھر میں راض ہوئی۔

”بس بجیا بہت ہو گیا میں کوئی گستاخی کر رہی ہوں گا“ زندگی بھر سہیل میرا رقیب بنا رہا اب اس کے مرنے کے بعد آپ نے مریم کو اس کی جگہ دے دی اور مریم کو اس کی کیا ضرورت تھی دو بچیوں کی ماں ہوتے شرم نہ آتی.....؟“

”میں پوچھتی ہوں اس کی شادی سے تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے؟“ زوراً یہ کا سوال بڑا چھتا ہوا تھا۔ نبیل کھینچے ہوئے اور اپنی کھسیا ہٹ چھپانے کو چیخ کر بولے۔

”میری طرف سے وہ جائے بھاڑ میں..... مجھے کیوں تکلیف ہوگی۔ مجھے تو حیرت ہے آپ پر اور حمزہ بھائی پر کہ چند مہینے اسے نہ رکھ سکے؟“ ”وہ تاجر ہمارے ساتھ رہ سکتی تھی مگر کس رشتے سے.....؟ میرے لیے وہ بچی بہن سب کچھ تھی مگر یہ سانجیہ معاشرہ اور یہاں کے لوگ..... سب سے بڑھ کر اللہ کا قانون! اسی لیے میں نے بہتر سمجھا کہ اس کو رخصت کر دوں اور پھر یہ شادی اماں کی اجازت سے ہی ہوئی ہے۔“ حمزہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

”اماں آپ بھی.....!“ نبیل کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ ”یقین نہیں آ رہا کہ آپ بھی مریم کی بے حیائی میں اس کی شریک بن گئیں۔“

رات گئے جب نبیل گھر آ گئے اور انہیں مریم کے جانے کا پتا چلا تو وہ تنہا فن کرتے اماں کے کمرے میں پہنچ گئے۔

”کس کی اجازت سے مریم بجیا کے گھر گئی ہے میں گھر کا سربراہ ہوں مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا۔“ وہ غصے سے بولے۔

”ابھی میں زندہ ہوں تم سے وہ کیوں پوچھتی؟“ اماں نے اطمینان سے جواب دیا۔

”ایک تو اماں آپ بھی بس..... میں سہیل کا بڑا بھائی ہوں اس ناتے حق سے میرا اس پر..... حمزہ بھائی کس رشتے سے اتنے لے گئے کوئی وہ گئے بھائی تو نہیں ہیں؟“

”سہیل کے مرنے کے بعد یہ تو تمہی ذہن پر رشتہ ہے تمہارا اس سے.....؟ تاہم ہو تم مریم کے لیے۔“ اماں نے جواب دیا۔

”ایک تو اماں مریم نے پتا نہیں کیا گھول کر آپ کو پلا دیا ہے کہ میری ہر بات کی مخالفت کرنے کی تو جیسے آپ نے قسم کھالی ہے۔ میں تو اس کے بدلے ہی کے لیے کہہ رہا تھا جائے میری طرف سے جہنم میں..... وہ غصے سے دروازے کو ٹھوکر مارتے ہوئے نکل گئے اور اماں دوپے میں منہ چھپا کر سسکتی گئیں۔

اور اب مریم کی جنید سے شادی کی خبر نے جہاں سب کو حیران کر دیا تھا وہیں نبیل غصے سے آگ بگولا تھے۔ اس نے غصے سے بہن بہنوئی سے بھی تعلقات ختم کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔

”اماں! میں نے کہہ دیا ہے اب اس گھر میں کوئی مریم کا نام نہیں لے گا۔ ہمارا اب اس سے کوئی تعلق نہیں۔ انتہا ہے بے شرمی کی..... ایسی ہی بات تھی تو ہم سے کہا ہوتا ہم خود اسے اس گھر سے عزت سے رخصت کرتے۔ یہ بجیا اور حمزہ بھائی کون ہوتے ہیں۔ اسی لیے

”اماں! بچیوں کو گری لگتی ہے میں اسے سی نہیں چلاتی۔“ وہ شرمندگی سے بولی۔

”کل سے تم اسے سی چلا کر سو گئی میں نے کہہ دیا ہے بل کی فکر نہ کرو میں خود دوں گی۔“ ان کے پہرے پر تفکرات کا جال تھا اور انکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئیں۔

دوسرے دن مریم کا کالج سے لوٹی تو زوراً یہ اور حمزہ بھائی آئے جیسے تھے وہ انہیں دیکھ کر خوش ہو گئی۔

”ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔“ زوراً یہ نے سلاسل کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”اپنا اور بچیوں کا سامان بیک کر لو۔“

”میں وہاں جا کر کیا کروں گی؟ اماں کے بغیر میرا دل نہیں لگے گا۔“ مریم بے بسی سے بولی۔

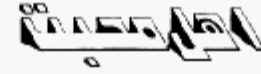
”بجیا! تمہاری مدت زور سے بھی کئی مہینے زور ہے۔ تم کالج کے علاوہ کہیں نہیں گئیں۔“ کچھ عرصے ہمارے ساتھ رہ لو میری امی بھی تمہیں یاد کر رہی ہیں۔“ حمزہ بھائی شفقت سے بولے حمزہ کی امی بھی بے حد شفقت

ہمدرد اور حلیم الطبع تھیں مگر مریم کو جانے میں تردد تھا لیکن بجیا کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ یوں بھی اس کا کالج اور بجیا کا گھر قریب قریب تھے مریم کو منع کرتے کرتے بھی دونوں میاں بیوی نے اس کا ڈھیروں سامان بیک کر لیا۔

”بجیا میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ رہ لوں گی آپ تو لگتا ہے مجھے بھر کا سامان اکٹھا کر رہی ہیں۔“ اس نے دبا دبا احتجاج کیا۔

”اچھا بس! زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مہمان آتے اپنی مرضی سے ہیں اور اپنی میزبان کی مرضی سے ہوتی ہے۔“ بجیا نے پیار سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

عذرا بھابی نے بھی اس دوران کسی قسم کی مداخلت نہیں کی بلکہ خوشی خوشی پیکنگ میں بجیا کی مدد کرنے لگیں۔ اماں کے گلے گلے مریم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو وہ بھی آب دیدہ ہو گئیں۔



جذاب اہل دل کے افق

میرا تعلق اس سرزمین سے ہے جہاں کی مٹی شاید قدرت نے محبت کے جذبات سے گوندھی ہے۔ اسی لیے یہاں عشق و محبت کی کئی کہانیاں نہ جنم لیا اور سورج بہ کینے پر مجبور ہو گئے کہ یہاں کا عشق بڑا شوریدہ شہر ہوتا ہے اور یہ سارے بندھنوں کو توڑ کر آگے بڑھتا ہے۔ زیر نظر کہانی بھی محبت میں دیوانہ ہو جانے والی ایک نوجوانہ کی ہے جو ہر قیمت پر اپنی محبت پانا چاہتی تھی۔

راوی علی رضا
تحریر منجاب خان
کراچی

میں اس وقت کراچی کے ایک بارونق بازار میں کچھ خرید و فروخت کر رہا تھا اور بازار کے شمالی حصے میں کراچی کی ایک دکان کے سامنے کھڑا تھا جب سرخ رنگ کی ایک ٹوٹا کرولا سڑک پر رکی اور اس میں سے ایک خوب صورت عورت اتر کر کسی دکان کی طرف بڑھی۔ میں نے عورت کی صرف ایک ہلکے دیکھی تھی اور سن ہو کر رہ گیا۔ وہ شانو تھی! میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں میں نے اسے بہت قریب سے اور ایک عرصے تک دیکھا تھا۔ میں اس کی ایک ایک ادا کو پہچانتا تھا۔

شانو اس وقت بالکل مختلف روپ میں تھی۔ اس نے اونچی ایڑی کی سینڈل اور جدید فیشن کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کا پُرکشش چہرہ ہلکے میک اپ میں کسی عینے کی طرح دکھ رہا تھا۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی دکان کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی کہ اسی وقت اس کی نگاہ میری طرف اٹھ گئی۔ اس کی خوب صورت آنکھیں حیرت سے کھلیں کھلی رہ گئیں اور چہرہ رنگ بدل گیا۔ ایک بار تو یوں لگا کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے مگر اگلے ہی لمحے وہ بالکل اجنبی نظر آنے لگی۔ اس نے پیشانی پر دھلک آنے والی بالوں کی لٹ کو سر جھٹک کر پیچھے ہٹا دیا اور دکان کی

طرف متوجہ ہو گئی۔ میں وہیں کھڑے کھڑے اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ سخت گھبراہٹی ہوئی نظر آ رہی تھی اور صاف محسوس ہوتا تھا کہ خریداری کی طرف اس کا قطعاً دھیان نہیں ہے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ میں وہیں قریب میں موجود ہوں۔

چند لمحوں بعد وہ بغیر کچھ خریدے دکان سے نکلے اور سڑک پر آ گئی۔ بازار میں خاصی گہما گہمی تھی۔ وہ لوگوں کے درمیان راستہ بناتی تیز آگے بڑھنے لگی۔ میں نے مستعدی سے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ جلد ہی وہ اپنے تعاقب سے آگاہ ہو گئی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی سراسیمگی میں اضافہ ہو گیا۔

میں کافی فاصلے سے بھی اس کے چہرے کا ہر اس واضح طور پر دیکھ سکتا تھا پھر اچانک وہ ایک گلی میں مڑ گئی یہاں خریداروں کا ہجوم زیادہ تھا۔ اس نے یہ حرکت اتنی اچانک اور ایسی سمجھ داری سے کی تھی کہ میں چکر کھا گیا۔

راہ گیروں سے دھکم پیل کرتا میں جو بھی اس تک گلی کے ناکے پر پہنچا شانو مجھے نہیں نظر نہ آئی۔ گلی کے دونوں اطراف دوپٹوں اور سلائی کی ان گنت دکانیں تھیں۔ اب تک دودھ کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ فوری طور پر میرا دھیان اس سرخ گاڑی کی طرف چلا

گیا۔ جس نے شانو کو کراچی کی دکان کے سامنے اتارا تھا۔ میں واپس مڑا اور تقریباً بھاگتے ہوئے اس دکان تک پھر پہنچ گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ کاروبار میں موجود تھی۔ ادھر عمر باوروی ڈرائیور کار کے قریب کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا شاید اسے توقع نہیں تھی کہ کمال دکان پر لگا میں گی۔ وہ اسکوٹر جس پر میں یہاں پہنچا تھا دکان کے سامنے ہی کھڑا تھا۔ میں نے اسکوٹر وہاں سے ہٹایا اور کچھ فاصلے پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ یہاں سے میں اس کار پر بخوبی نگاہ رکھ سکتا تھا۔ سب سے پہلے تو میں نے کار کا نمبر نوٹ کیا اور پھر اسکوٹر پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا کہ کب وہ ہر اسان ہرنی واپس پہنچے اور گاڑی میں بیٹھے۔ اگر وہ نہ بھی پہنچتی تو کوئی خاص فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ میں کار کا تعاقب کرتا ہوا آسانی سے اس کے ٹھکانے تک پہنچ سکتا تھا۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے گمان تھا شانو واپس نہیں لوٹی ڈرائیور بار بار گھڑی دیکھتا رہا اور بے قراری سے اپنی چندیا کھجاتا رہا۔ ماپوی کے عالم میں اس نے قریبی دکانوں کا ایک چکر لگایا اور پریشان چہرے سے گاڑی میں آ بیٹھا۔ اب شام گہری ہو چکی تھی۔ شانو کو گاڑی سے اترے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے یقیناً ڈرائیور اس سے زیادہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھائی اور تیزی سے روانہ ہو گیا۔

میں نے مختار انداز میں گاڑی کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ مختلف سڑکوں اور گلیوں سے ہوتی ہوئی آخر یہ گاڑی ایک شاندار گھوٹے کے سامنے جا رہی۔ چاروں طرف سے درختوں میں گہری ہوئی یہ گلی جدید طرز پر تعمیر شدہ تھی۔ میں نے کوئی کی نیم پلیٹ پر بھی اور اس کی تفصیلات ذہن نشین کرتا ہوا واپس آ گیا۔

یہ گلی وقار ملک نامی شخص کی تھی۔ میں نے تھوڑی سی تک دودھ کے بعد اس کے نام اور پتے کی تصدیق

کر لی اور ٹیلی فون نمبر نوٹ کر لیا۔ اسی روز دوپہر کے وقت میں نے اس نمبر پر فون کیا۔ ایک گھریلو ملازمہ نے فون اٹھایا میں نے اس سے پوچھا۔

”وقار صاحب گھر پر ہیں؟“

میری توقع کے مطابق ٹی میں جواب ملا تب میں نے کہا کہ ”بیگم صاحبہ کو بلاؤ۔“

یہ تیرنشا نے پریشان تھوڑی دیر بعد ریسپور سے جو شیریں اور کھٹک دار آواز سنائی دی وہ شانو کی ہی تھی اگرچہ اب ولجہ بہت حد تک تبدیل ہو چکا تھا مگر یہ تبدیلی کم از کم میرے کانوں کو دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ میں نے شانو کے ہیو کے جواب میں کہا۔

”دیکھو شانو! فون بند نہ کرنا کیونکہ اس میں تمہاری ہی بہتری ہے۔“

”تک... کون ہو تم؟“ دوسری جانب ڈری اور سہمی ہوئی آواز آئی۔

ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ یہ خوف زدہ کمزور آواز شانو کی نہیں ہو سکتی وہ ایسے لرزاں لہجے میں کہیں بات کرتی تھی۔ کل بھی جب میں نے اسے بڑی نزاکت سے دکان کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا تھا تو وہ مجھے بڑی عجیب سی لگی تھی۔ شانو تو ایک تندہ گولے کا نام تھا جو دھڑ سے گڑ رہا ہر شے کو الٹ پلٹ کر رکھ دیتا تھا مگر کچھ بھی تھا فون پر دوسری طرف شانو ہی تھی۔

”شانو! میں علی رضا ہوں۔ تمہارے بچپن کا ساتھی...! کل میں نے تمہیں گاڑی سے اترتے دیکھ لیا تھا۔ اسی گاڑی نے مجھے تمہارے ٹھکانے سے آگاہ کیا ہے۔“

دوسری جانب سے اس کی سرسبز آواز سنائی دی۔

”کون ہو تم؟ مجھے تمہاری باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آ رہیں اور میرا نام شانو نہیں سنا ہے۔“

”شانو یا شانو! تم بے حد خوف زدہ ہو رہی ہو۔ شاید

شانو کا گھر گاؤں میں ہمارے پڑوس میں تھا۔ وہ نیس بیس برس کی انتہائی خوب صورت لڑکی تھی۔ اُس وہ اپنے چلنے سے اتنی بے پروا نہ رہتی تو کہیں زیادہ دلکش نظر آتی پھر بھی اچھے ہوئے لمبے بالوں اور سلیجے لباس کے باوجود وہ دل موہ لینے والی شخصیت رکھتی تھی۔ اسی مذاق بھول دھانسا کاروڑ کا معمول تھا۔ وہ ہم لڑکوں کے ساتھ لڑکوں والے کھیل کھیلتے ہوئے جوان ہوتی تھی اور اس کی چال و حال میں لڑکوں کی سی تیزی و ہمدردی پائی جاتی تھی۔ ایک روز اس کے باپ نے اسے مارا نہ ہوتا تو وہ اب بھی گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ گلی و نڈا کھیل رہی ہوتی یا اپنی سڈول کلائی کسی گھبرو کے ہاتھ میں دے کر اس کو سمجھا رہی ہوتی کہ کلائی چھڑانے کے لیے کیسے زور لگنا چاہیے اور کلائی پکڑتے ہوئے کیا چال لگنا چاہیے۔ شانو کا قد ساڑھے پانچ فٹ اور جسم متناسب اور مضبوط تھا۔ باپ کی اچھی خاصی زمینیں تھیں۔

چنگر میں خوش حالی تھی جس کا ایک ثبوت اس کے سرخ انار جیسے گال تھے۔ غصے کے عالم میں یہ گال اور بھی سرخ ہو جاتے تھے یوں لگتا تھا جیسے ابھی ان میں سے خون پھٹک پڑے گا۔ وہ میری ہی عمر کی تھی۔

ایک دفعہ ہم گاؤں سے باہر قبرستان کے قریب کھلے میدان میں کئی فٹڈ اکھیل رہے تھے کہ کھیل کے دوران ہانپتے ہوئے شانو نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سرخ انارچے گال پر رکھ دیاور بولی۔

میں نے پورا ایک دن اسے سوچنے کا موقع دیا اور اگلے روز پھر اسی وقت فون کیا۔ اتفاقاً اس روز شانوہی نے فون اٹھایا لیکن اس نے ایک بار پھر مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ وہ سخت متذبذب محسوس ہو رہی تھی۔ ڈری اور لکھی ہوئی۔ میں نے فیصلہ کن اہج اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”وہ جھوٹا نو! میرے پاس زیادہ وقت نہیں! میں کل ٹھیک دو بجے واپس چل کر تمہارا انتظار کروں گا۔ اچھی طرح ذہن نشین کرلو۔“ وچ ٹھیک دو بجے! اس کے بعد حالات کی ذمہ داری تم پر ہوگی اور تم گمان بھی نہیں کر سکتیں کہ حالات کتنے ختمین ہو سکتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے میں نے فون بند کر دیا۔

اگلے روز ٹھیک ساوا دو بجے میں اور شانورہ سٹورٹ میں آئے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ شانورہ نے خود کو ہلکے رنگ کی ایک چادر میں اس طرح چھپایا ہوا تھا کہ اس کے چہرے کا کچھ حصہ ہی بہ مشکل نظر آسکے۔ اس نے پلکیں اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ آج اس کی آنکھوں سے گہری شناسائی جھانک رہی تھی۔ وہ ایک نیک مجھے سمجھتی چل گئی اور پھر بالکل اچانک اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو تھاما اور ان پر اپنا چہرہ جھکا کر ہچکچکیوں اور سسکیوں سے رونے لگی۔ چادر کے اندر اس کا خوب صورت جسم بری طرح لرز رہا تھا اور میرے ہاتھ اس کے آنسوؤں کی گرمی محسوس کر رہے تھے اس

”دیکھ علی! میرے گال کیسے تپ رہے ہیں۔“
اس کی اس خطرناکی حرکت سے میں دل ہی دل
میں بہت لطف اندوز ہوا تھا۔ اس کے گال کی نرمی اور
حالت میں عرصے تک فراموش نہ کر سکا۔ میں نے نئی
بار سوچا کہ کاش! پھر کسی دن شانو کے گال دیکھنے لگیں
اور وہ میرا ہاتھ بے نیازی سے پکڑ کر اپنے رخسار پر رکھ
لے مگر پھر بھی ایسا نہ ہوا۔

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ گاؤں کے دوسرے لڑکوں کی طرح میں بھی شانوکے ایک طرف عشق میں گرفتار ہو گیا لیکن وہ لڑکین کے اسی دور سے یوں اندھی اور طوفان کی طرح گزری تھی کہ ہم سب ہم تمہیں ملتے رہ گئے تھے۔

ان دنوں میں 'ایف' اے کا امتحان دے کر فارغ
ہو رہا تھا کہ میں نے دوستوں سے سنا کہ شہر سے
نوبدری ریاست کا ایک دوست شہباز آیا ہوا ہے اور
سے کاؤں اس قدر پسند آیا ہے کہ وہ یہیں اپنے لیے
ویلی بنوا رہا ہے۔ یہ کوئی حیران کن بات نہیں تھی
بلکہ حیران کن بات تو یہ تھی کہ شانو اس پر مرثی تھی۔
رحمت کے زمانے میں انسان کے پاس سوچنے
کے مجھے تو بہت کچھ ہوتا ہے لہذا میرا ذہن بھی ان دنوں
وچوں کا اکھاڑ بنا رہتا تھا۔ ان میں سب سے
ایاں سوچ شہباز اور شانو کی بابت تھی۔ میں سوچا
رتا تھا کہ اس معاشرے کا انجام کیا ہوگا۔

جہاں تک آغاز کا تعلق ہے تو یہ اس دن شروع ہوا جب گھڑ سواری کے دوران شہباز کا گھوڑا بڑک گیا شہباز زمین پر گر پڑا تھا۔ گھوڑا اپنے معمول سے کھینے کے درپے تھا کہ اچانک سامنے گھر سے شامو بھڑکی اور انٹھی لے کر گھوڑے پر پل پڑی۔ اس نے گھوڑے کے منہ پر اسے تابوڑ چلے کیے کہ اس کو بکھلا کر شہباز کو چھوڑ دیا اور ایک سمت بھاگ نکلا۔

شورن کر میں بھی گھر سے باہر نکلا تو دیکھ کہ شہباز
 وحیِ حاتم میں رشتن پر پڑا کر اور رہا ہے۔ شانوں نے اپنی
 بہادری سے شہباز کی جان بچ لی تھی جب حالات قابو
 میں آ گئے تو ادھر ادھر کونوں میں دُکے ہوئے لوگ بھی
 نکلتے اور ہاں جمع ہو گئے۔ میں اور شانو سہارا دے
 کر شہباز کو شانوں کے گھر لے گئے۔ اس کے زخم شدید
 ضرور تھے مگر تخمین نہیں تھے۔ شانو اس کی مرہم پٹی
 کرنے میں دُلت گئی۔ شہباز ایک خوش شکل جووان تھ
 اور صورت ہی سے باخلاق اور مستعار نظر آتا تھا۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا شان و اور شہباز کے عشق کا.....
پہلے پہل مجھے یہ خبر برا ہی عجیب لگی تھی، یقین نہیں آیا
کہ شاد و سبکی زندگی کا ایک یہ رخ بھی ہو سکتا
ہے بہر حال بہت جلد گڑبڑ کے دوسرے لوگوں کی
طرح میں نے بھی بہت کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ
لیا۔ میں نے کئی بار شان و کو شہباز کی طرف گھورتی ہوئی
نظروں سے دیکھتے پایا۔ ایک روز تو مجھے سخت حیرت
ہوئی کہ شان و شہباز کی نئی تعمیر شدہ حویلی میں بھی
صفائی کر رہی تھی اس نے دو پناکس کرکیر سے باندھ
دیا تھا اور جھانڈ دینے میں مصروف تھی جب کہ
شہباز بے بسی کے عالم میں باہر کھڑا تھا۔ میں اس کی
مزاج پر ہی کی خاطر اس کے پاس جا پہنچا تو وہ
روانے لہجے میں بولا۔

”یا رایہ لڑکی تو میری جان کو آگنی ہے۔ ہر وقت سر پر سوار رہتی ہے دو دن سے کہہ رہی تھی کہ میں خود نیزے گھر کی صفائی کروں گی۔“

شہزاد نے اگرچہ یہ باتیں بڑے دھمے لہجے میں کہی تھیں مگر شہزادوں کی تیز کانوں سے محفوظ نہ رہیں۔
 حجاز و یمن کے لوگوں کی طرح آئی اور تنگ کر بولی۔
 ”کون سر بر سوار ہے؟“

شہباز جھلٹا کر بولا۔ ”تو اور کون.....! عاجز آ گیا

اس شرط کے ساتھ کہ میں اس کو اس کے حال پر چھوڑ دوں گا اور کسی طرح مجھ کو جسے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مجھ سے عدم مداخلت کا عہد لینے کے بعد اس نے دونوں ہاتھ میرے سامنے جوڑ دیے تھے اور ایسا التجائی لہجہ اختیار کیا کہ میں نے خلوص دل سے وعدہ کر لیا کہ اگر میں اسے فائدہ نہ پہنچا سکا تو نقصان بھی نہیں پہنچاؤں گا اور اگر اس کے بتائے گئے حالات کے مطابق واقعی میرا خاموش رہنا مناسب ہوا تو میں اس خاموشی کو مصلحت سمجھ کر قبول کر لوں گا۔ اس کے بعد شانو نے جو روادار سنا اس کا لب لباب یہ ہے۔

اس رات شہباز پر جو قحطان حملہ ہوا تھا وہ نہ شانو نے کیا اور نہ اس کے بھائیوں میں سے کسی نے اس کا ذمہ دار چوہدری سخاوت بھی نہیں تھا بلکہ اس حملے کا ذمہ دار خود شہباز کا دوست ریاست تھا۔ وہ خود شانو سے شادی کا خواہش مند تھا جب اسے پتا چلا کہ شانو اس کے دوست شہباز سے محبت کرنے لگی ہے تو اس نے بہت تھکا وہاب کھائے۔ اسی دوران شہباز شہباز کی شادی طے ہو گئی اور شانو اور شہباز کی ملاقات کا واقعہ ہو گیا۔ اس دن چوہدری ریاست شانو کے راستے میں گھات لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ شانو جب واپس جا رہی تھی تو چوہدری نے اسے راستے میں روک لیا اور اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس سے شادی پر تیار ہو جائے اس نے شہباز کو بھی برا بھلا کہا۔ شانو نے غصے میں آ کر اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا اور کہا کہ اس کی گھر والی بننے سے بہتر یہ ہے کہ جتنی کہ زہر بھانک لے۔ چوہدری شانو کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا ان میں سے ایک دھمکی یہ بھی تھی کہ وہ شہباز کو جان سے مار ڈالے گا۔ کچھ تیز و تندہ کاموں کے بعد وہ رانت چٹکی تاتا ہوا واپس چلا گیا۔

اسی رات کو جب شہباز اپنے کمرے میں پہنچا تو

گاؤں میں رہائش پر خوش نہیں تھا۔ تیسری بات یہ رہ جاتی تھی کہ شانو کے دونوں بھائیوں نے مل کر یہ کام کیا ہے۔ قصہ مختصر پولیس نے ان تینوں خطوط پر بھر پور تفتیش کی مگر اس بھی کا کوئی سراہا نہ نکلا۔ کافی عرصہ گزرنے کے بعد جب شانو کی کشدگی کا کوئی سراغ نہیں ملا تو سب یہی کہنے لگے کہ یہ سارا کام شانو ہی کا تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ شہباز شہر میں شادی کر رہا ہے تو اس نے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں اور بعد میں اس دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیا اور فرار ہو گئی۔

اس کے باوجود کچھ لوگ ایسا نہیں سمجھتے تھے اور ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ میں نے شانو کو بہت قریب سے دیکھا تھا ہم ساتھ چھیل کر ہی جوان ہوئے تھے۔ وہ بچپن سے میری ساتھی تھی میں اس کے باپ کو چاچا کہتا تھا۔ چاچا جو کی سیاری اولاد کی عقل اور ہوش مندی جیسے شالو میں آئی تھی۔ وہ ہاتھ چھوٹ اور دوسرے ہونے کے ساتھ بڑی ذہین تھی البتہ لاابالی ہونے کے باوجود نہایت ٹھنڈے دل و دماغ کی مالک تھی۔ مجھے پتا تھا وہ بڑے مضبوط کردار کی لڑکی تھی۔ ممکن ہے شہباز کی شادی کا سن کر اس کے دل کو ٹھیس پہنچی ہو اور اس نے تنہائی میں شہباز سے بات کی ہوگی مگر اس گفتگو کے نتیجے میں اس نے شہباز کو جان سے مارنے کی کوشش کی یہ میرے ذہن میں نہیں ساتا تھا۔ اگر اس نے ایسا کہا بھی تھا تو اس کے پیچھے یقیناً کوئی بڑی وجہ ہوگی۔

اس واقعہ کو بغیر حل ہوئے چار برس بیت چکے تھے اور آج وہ ملی تو بس روئے جاری تھی۔ شانو روٹی اور بہت دیر تک روٹی پھر جب اس کا جی ہلکا ہوا تو ہم نے چائے وغیرہ پی۔ میرے بے پناہ اصرار کے بعد اس نے اپنی پتا سنا شروع کی لیکن

دوسرے گاؤں والوں کو بتایا تھا کہ اسے کچھ معلوم نہیں کہ حملہ وار کون تھے۔ رات آٹھ بجے سونے کے بعد اس کی آنکھ اسپتال ہی میں کھلی تھی۔ جہاں وہ پیوں میں جکڑ آئی سی پولیس پر ہوا تھا۔ اس نے کسی پر شک کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اس نے ایک اور بات بتائی کہ وقوع سے ایک دن پہلے شانو سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا اور اس واقعہ کے دو چم دید گواہ بھی موجود تھے یہ دونوں کسان تھے اور اس روز صبح منہ اندھیرے کھیتوں میں کام کر رہے تھے بعد میں مجھے یہ تفصیل ان کسانوں کے ذریعے بھی پتا چلی کہ اس روز انہیں اچانک درختوں کی طرف سے تیز بولنے کی آوازیں آئیں تو انہوں نے دیکھا کہ شانو اور شہباز کھڑے بائیں کر رہے ہیں۔ شہباز شانو کو جھڑکتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ وہ یہاں سے چلی جائے اس کی شادی کی اور سے طے ہو گئی ہے جواب میں شانو نے روتے ہوئے کہا تھا۔ ”میں دیکھتی ہوں کہ کون تیرے دل کی رانی بنتی ہے۔ میں سب کچھ بر باد کر دوں گی۔ میرا نام شانو ہے۔“ اس پر شہباز نے ہنستے ہوئے کہا کہ ”جب بر باد کرے گی تو دیکھ لوں گا۔“ تب شانو نے غضب ناک ہو کر کہا۔ ”تو نے ابھی میرا غصہ نہیں دیکھا اور نہ اللہ کرے تو مجھے دیکھے۔“

شانو کی نظریں جب دونوں کسانوں پر پڑیں تو وہ ٹھٹھک کر گاؤں کی جانب چل دی تھی۔ اس واقعے کے بعد اسی رات کسی نے شہباز پر سوتے میں حملہ کر دیا اور اسے زخمی کر دیا اور اسی رات شانو نہایت خاموشی سے اپنے گھر سے فرار ہو گئی۔ حالات اور شواہد واضح طور پر شانو کی طرف انگی اٹھ رہے تھے۔

چوہدری کی حویلی میں شہباز کا ایک کھلا دشمن بھی موجود تھا۔ یہ شہباز کے دوست چوہدری ریاست کا چھوٹا بھائی سخاوت تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ شہباز کی

ہوں۔ سر توڑ دوں گا تیرا۔“ شانو کے چہرے پر شفق سی پھیل گئی۔ عجیب انداز سے شرماتے ہوئے بولی۔

”تو تو میری جان بھی لے لے تو ہائے نہ کروں۔“ شانو کی یہ بے باکی دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا یعنی معاملہ کافی آگے نکل گیا تھا۔

میں بی اسے کے امتحانات میں مصروف ہو گیا تھا اس لیے دو تین ماہ گاؤں کی زندگی سے کٹ کر رہ گیا۔ اس روز میں اپنا آخری پرچہ دینے کے لیے جا رہا تھا جب میں نے یہ روح فرسا خبر سنی کہ کسی نے رات شہباز پر قحطان حملہ کیا ہے اور اسے شدید زخمی حالت میں شہر کے اسپتال پہنچا دیا گیا ہے اور اس کے سینے کے امکانات بہت کم ہیں۔

میں نے جیسے تیسے اپنا پرچہ دیا اور فوراً گاؤں واپس روانہ ہو گیا۔ راستے میں طرح طرح کے خیالات ذہن پر لیٹا کر رہے گاؤں پہنچا تو ایک اور حیرت انگیز خبر ملی کہ شانو گھر سے غائب تھی اور متعلقہ تھانے کا عملہ موقع پہنچ کر تحقیق کرنے میں مصروف تھا۔

اس حادثے نے گاؤں کے ہر فرد کو متاثر کیا تھا اور ان متاثرین میں میرا نام بھی شامل تھا۔ شہباز ایک ہمدرد اور شریف انفس انسان تھا۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ سردیوں کی اس تاریک رات کو کیا واقعہ رونما ہوا تھا کہ خوبو شہباز کو زندگی کے لالے پڑ گئے اور اس کے ساتھ ساتھ حسین اور چنچل شانو بھی گھر سے غائب ہو گئی۔ اس سوال کا جواب کم و بیش گاؤں کے ہر فرد کو چاہیے تھا مگر میری طبع میں کچھ زیادہ ہی رہا ہے۔ اس لیے میں اس واقعے کی تحقیق میں مصروف ہو گیا۔ میں نے اس اسپتال کے تین چار چکر لگائے جہاں شہباز زیر علاج تھا۔ میں نے اس سے بات چیت کی لیکن کوئی اہم بات معلوم نہیں ہو سکی۔ اس نے مجھے وہی کچھ بتایا جو پولیس کو اور

دھت ہو کر اسے گالیاں دینا اور بھوکا پیاسا کرے میں بند رکھنا اس کا روز کا معمول تھا۔ اس نے شانو سے شادی نہیں کی تھی اور اسے قید کر کے رکھا ہوا تھا۔ شانو اسی قید میں رات رات بھر روتی تھی اور سارا سارا دن تڑپتی تھی۔ جس محبوب کے لیے اس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، اپنی زندگی عذاب بنائی تھی، چنانچہ زندہ بھی تھا یا نہیں۔ صرف اس کی یاد میں آسو بہا سکتی تھی یا اپنے چہرے اور بالوں پر اپنے گاؤں کی خاک تھوٹ کر سکتی تھی۔ خاک کے یہ ذرے ٹکینوں کی طرح جگمگاتے تھے اور ہر ذرہ ایک داستان سناتا تھا جو اس تاریک رات سے شروع ہوئی تھی۔ جب شانو کے شہباز کو کسی نے خون میں ڈبوایا تھا اور وہ اس کی حالت پر تڑپ اٹھی تھی اور اس دامن کو جنم واصل کرنے کے لیے ہر خطرے سے بے نیاز ہوئی تھی۔

اس کے بعد گاؤں میں کیا ہوا تھا۔ اس کے ماں باپ کہاں تھے۔ اس کے بھائیوں کے ساتھ کیا ہوا۔ اس کا محبوب کہاں تھا۔ اس کو کچھ معلوم نہ تھا۔ ان سوالوں کے جواب اس سے ایسے ہی پوشیدہ تھے جیسے زندگی سے موت پوشیدہ ہوتی ہے۔

شانو کی رد و اخم ہوئی تو پیر پر پڑے تمام شو پیروز اس کے آنسوؤں کی نذر ہو چکے تھے۔ میرے اعصاب متحمل ہو گئے تھے اور سینے میں ایک الاؤ سا بھڑک رہا تھا۔ شام کا اندھیرا اس ہول تک نہیں پہنچا لیکن بہر حال شام تو ہو چکی تھی۔

میں نے اپنے سامنے شانو کے روپ میں بے بسی کی اس تصویر کو غور سے دیکھا اور میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ آج سے کچھ سال پہلے میں اس کی تیزی و طراری سے عاجز تھا۔ اس کے حسین چہرے کو دیکھا کرتا تھا اور تنہائی میں پیٹھ کر خلیوں کے تانے بانے بناتا تھا مگر آج وقت بدل چکا تھا وہ سکڑی، کمٹی، ڈری

بھرتے ہوئے کہا۔ ”یار! ان زخموں کا بدلہ بھی تو لینا ہے اور یاروں کا بدلہ یار ہی تو چکا ہے تیں۔“

چوہدری نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے عاشق کو میں نے راستے سے یونہی تو نہیں ہٹایا۔“

وقار ملک نے کہا۔ ”چنانچہ وہ بچتا بھی ہے یا نہیں اگر کچھ بھی گیا تو میں اس کو اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ اس سے شادی کر سکے۔“

”چوہدری نے کہا۔“ اس خوب صورت چڑیل کے لیے میں نے بہت پاپڑے دیے ہیں بڑا خرچ کیا ہے۔“

وقار ملک نے چوہدری کا مقصد سمجھ لیا۔ اس نے شانو کے وجود کو نگاہوں میں تو لا اور بولا۔ ”پچاس ہزار ٹھیک رہیں گے۔“

چوہدری کے چہرے پر مکراتہ تاثرات ابھرنے لگے۔ ”میرا خیال ہے ملک صاحب! یہ بات ابھی قبل از وقت ہے ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں شہباز کا کیا بنتا ہے۔“

وقار نے کہا۔ ”وہ سارے مسئلے میرے ذمہ! میں ایک لاکھ لے لوں یہ رقم تمہارے تمام اندیشوں کے لیے کافی ہوگی۔“

چوہدری کے چہرے پر نیاز مندانہ مسکراہٹ ابھری۔ ”وقار صاحب! آپ بھی کہاں کتا دی ہیں بس جو زبان سے نکال دیا پھر تکی لکیر ہو گیا ٹھیک ہے۔“

الغرض چوہدری نے وقار ملک سے ایک لاکھ روپے وصول کر کے شانو اس کے حوالے کر دی اور وہ اگلے روز اسے کراچی لے آیا۔ کراچی کی اس شان دار کوئی میں شانو کے ساتھ جو کچھ مواہد فطری، قابل بیان ہے۔ مختصر یہ کہ وقار ملک ایک نہایت مکار، کمینہ اور بے رحم شخص تھا۔ وہ نہایت عیاش تھا۔ جس روز وہ اسے گاؤں سے لے کر آیا تھا اس روز واقعی اس نے شکاری تو کھلیا تھا۔ ذرا دیر ہی بات پر اسے پیٹنا نشتے میں

چوہدری چار پائی کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ درحقیقت وہ شام ہی سے شہباز کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ایک تیز دھار کلہاڑی سے لیس تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے شہباز کے سونے کا انتظار کیا اور جب شہباز گہری نیند سو گیا تو اس نے اس پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔

اس اندوہناک واقعے کی خبر جب شانو تک پہنچی تو اس کا دھیان فوراً چوہدری کی طرف چلا گیا۔ اسے وہ ملاقات اور اس کا زہریلا لہجہ یاد آیا اور وہ سمجھ گئی کہ اس کے محبوب کو خون میں ڈبوئے والا کون ہے۔ اس کا مارے غصے کے برا حال ہو گیا۔ وہ وہی دس بارہ سال کی کھلڈری لڑکی بن گئی جو لڑکوں سے بچتا زماں کرتی تھی اور غصے میں آ کر مذ مقابل کو زمین پر دے مارتی تھی۔ وہ آنکھوں میں آنسو اور دل میں طوفان لیے زخمی شیرنی کی طرح گھر سے نکلی اور اپنے محبوب کا انتقام لینے چل پڑی۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ ایک لڑکی ہے خوب صورت ہے، زرات تار یک ہے اور گاؤں کی گلیاں سنسان۔! وہ کتنی ہی زور آور اور جوشیلی سہمی آ خر عورت ذات ہے۔ مرد اسے دیکھے تو پاگل ہو جائے۔ اس کے دل میں صرف ایک ہی بات تھی کہ اسے انتقام لینا ہے اور یہ انتقام صرف وہی لے سکتی ہے۔ وہ سیدھی گاؤں سے باہر چوہدری کے ڈیرے پر پہنچی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ رات چوہدری اپنے دوستوں کے ساتھ ڈیرے پر ہی ہوتا ہے۔ وہ غصے میں پاگل ہو رہی تھی کسی بھی اندیشے کو خاطر میں لائے بغیر وہ سیدھی ڈیرے میں گھس گئی۔ وہاں چوہدری اور اس کے دوست مہمان بھی موجود تھے۔ شانو نے اندر گھستے ہی چوہدری کو دبوچ لیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں درناقی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ درناقی چوہدری کے پہلو میں گھسا دے کہ چوہدری اور اس کے مہمانوں نے جھپٹ کر شانو کو دبوچ لیا۔ وہ بے

دریغ درناقی گھمانے لگی۔ اس کا ایک وار چوہدری کے ایک دوست کے ہاتھ پر لگا اور خون ابل پڑا۔ دوسرے نے شانو کو عقب سے جکڑ لیا اور درناقی کلائی تھام کر مروڑنی شروع کی۔ پھری ہوئی شانو نے خود کو چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر آخر کار وہ بے بس ہوئی۔ ان لوگوں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ چوہدری نے خودی مریم پٹی کر لی۔ اب بے بس شانو وحشی درندوں کے قبضے میں تھی۔ ان کے تیروں سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس سے بھر پور انتقام میں گئے۔ وہ شہباز کا انتقام تو نہ لے سکی بلکہ خود ان کے جال میں پھنس گئی تھی۔

چوہدری کے دونوں مہمانوں میں سے ایک پتلون قمیص والا کوئی شہری شخص تھا اس کا نام وقار ملک تھا۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ وقار ملک یہاں شکار کھیلنے آیا تھا۔ چوہدری اس سے مرعوب نظر آتا تھا اور اس کا نام بے تکلفی سے نہیں لے رہا تھا۔ چوہدری کے ساتھ ساتھ وقار ملک بھی شانو کو لپٹی ہوئی نظروں سے گھور رہا تھا۔ خروہ چوہدری سے بولا۔

”یار! یہ مصیبت تو میرے گلے ڈال دے۔“ اس کا اشارہ شانو کی طرف تھا۔

چوہدری نے اس کی بات کو سمجھتے ہوئے کہا۔ ”ملک صاحب! آپ کا ختم سر آنکھوں پر۔۔۔۔۔۔“

شکار کے ساتھ ایک شکار یہ بھی سہی!“

وقار نے چوہدری کے حریص چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”صبح تک اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔“

چوہدری نے کہا۔ ”ملک صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اس نے ہم تین آدمیوں پر حملہ کیا ہے۔ یہ رحم کے قابل کہاں؟“

وقار ملک نے اپنے زخمی بازو کی پٹی پر ہاتھ

سبھی رنج و اندوہ کی صورت بنی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ میں مضبوط طاقت ور اور صاحب اختیار تھا۔ آج اسے میری مدد کی ضرورت تھی اور میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کا خاموش پرستہ تھا اس کے بچپن کا سہمی تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے لیے بہت کچھ کر سکتا تھا شاید قدرت نے یہ سہرا موقع مجھے اس لیے فراہم کیا تھا کہ میں شانوی کی مدد کر کے بچپن کی حسین یادوں کو ایک خوب صورت انجام دے سکوں۔ میں نے بڑی محبت اور اپنائیت سے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

”شانو! میں تیری مدد کروں گا۔“
ایک ایک اس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے اور اس کی سبھی آنکھیں مجھے میرا وعدہ یاد دلانے لگیں۔ میں نے کہا۔
”دیکھو شانو! یہ خیال اپنے دل سے نکال دو کہ وقار ملک قابلِ تسخیر یا ناقابلِ گرفت ہے۔“

شانو نے بے قراری سے میری طرف دیکھا پھر بولی۔
”یہ تم کہا کہہ رہے؟ خدا کی قسم! وقار کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے۔“
میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور تو میرے بارے میں بھی نہیں جانتی کہ میں کیا ہوں؟“
وہ شدید حیرت سے ایک ٹک میری طرف دیکھتی چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کا ایک آنسو لرزا مگر اک خوف سے اس کے ملائم رخسار پر پھسلنے سے پہلے ہی اس کی آنکھوں میں کہیں جذب ہو گیا۔ وہ کبھی میرے چہرے کو دیکھتی اور کبھی میرے دھڑکنے پر غور کرتی تھی۔ آخر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔
”وقار ملک بہت خطرناک آدمی ہے۔“
میں نے کہا۔ ”شانو! میں نے سب انتظام کر لیا

ہے میں سب کچھ جانتا ہوں اسنے دنوں میں گھریلو ملازمین سے سب کچھ اگھوایا ہے۔ صرف ایک ڈیڑھ گھنٹے میں سب کچھ تمہارے سامنے آ جائے گا۔“
شانو ہونٹوں کی طرح میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھوں میں اس کے ہاتھ رز کر رہ گئے تھے۔

میں نے کہا۔ ”شانو! میں پولیس انسپٹر ہوں اور عنقریب ڈی ایس پی بننے والا ہوں۔ قاتل اور ڈاکو میرے نام سے کانپتے ہیں اور چوراہے تو مجھ سے دیکھتے ہی آدھے مر جاتے ہیں۔ ان چند برسوں میں بہت کچھ بدل چکا ہے۔“
شدید حیرت اس کی آنکھوں سے عیاں تھی پھر کیسے اس بڑی چھٹی وقار ملک کو پکڑا گیا اور کیسے شانو کو اس سے آزاد کرایا گیا یہ ایک لمبی کہانی ہے بہر حال شانو کو میں وقار ملک کی جس بے جا سے آزاد کرانے اپنے گھر لے آیا۔ یہاں میں اپنے والدین کے ساتھ مقیم تھا۔ شانو اپنے والدین اور بھائیوں سے ملنے کے لیے بے قرار تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ اب گاؤں میں شانو کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ دنوں بھائیوں کو کوئی ہمدرد شخص اپنے ساتھ دینی لے گیا تھا۔ میں نے کوشش کی اور اس کی بوڑھی اور نیم پاگل والدہ کو کراچی لے آیا۔ اپنی پچھڑی ہوئی ماں سے مل کر شانو کے غموں کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا۔ اس دوران اسے گواہی کے سلسلے میں کئی بار عدالت میں جانا پڑا۔ میں نے کسی موقع پر اسے تنہائی یا بے جا رگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ شانو کا مستقبل تاریک تھا۔ وہ خوب صورت اور جوان تھی۔ زندگی گزارنے کے لیے اسے کسی مضبوط سہارا کی ضرورت تھی۔ کئی بار میں تنہائی میں بیٹھتا اور شانو کا بچہ چہرہ میری نگاہوں

میں گھومتا تو وہ مجھے کچھ میں اتھڑا ہوا ایک پھول نظر آتی۔ کچھ نے اسے ڈھانپ رکھا تھا مگر اس کے رنگ اور خوش بو سے کوسوں دور تھا۔ ایسے میں میرے دل میں یہ خواہش جاگتی کہ کیوں نہ میں خود ہی اس سے شادی کر لوں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں اپنے والدین کو سنا سکتا تھا اور رہی میرے دل کی بات تو وہ آج بھی شانو کو وہی کھلندری لڑکی سمجھتا تھا اور مجھے اس کے رخسار کی وہ نرم پیش آج بھی یاد تھی۔ جہاں تک شہباز کا تعلق تھا۔ اس کا اب کچھ علم نہیں تھا۔ زمانہ ہوا وہ ہمارا گاؤں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ گاؤں میں اس کی حویلی بھی بند پڑی تھی۔ میں نے نہ سمجھ سکا کہ اس نے نہایت خاموشی سے گاؤں کیوں چھوڑا۔ اسے زندگی کی ضرورت تھی اسی لیے وہ اس پر خطر منظر سے ہٹ گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اب میرے لیے شانو کے حصول میں کوئی دشواری نہیں تھی بلکہ یہ سب کچھ اخلاقی تقاضوں کے عین مطابق تھا مگر ایک احساس مجھے پیش قدمی سے روک رہا تھا اور وہ یہ کہ شانو کی آنکھوں میں اب بھی شہباز کے نام کے دیئے روشن تھے۔ میں نے سنا سن دو پہروں اور سر مٹی شاموں میں اسے دور نہیں بہت دور رکھتے ہوئے پایا تھا۔

اچانک ایک روز میں نے سارے کام پس پشت ڈال کر شہباز کو ڈھونڈ نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے لمبی چھٹی کی اور شہباز کا سراغ لگانے میں مصروف ہو گیا۔ اس اسپتال میں گیا جہاں میری شہباز سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں میں نے بہت دوز و صوب کی اپنے تجربے اور تحقیقات کو بھی استعمال کیا اور بالآخر بہار کی وہ مہلتی شام میرے لیے کامیابی کا پیغام لے کر آئی۔ ایک ایسی ہی مہلتی شام کو میں نے پہلی بار شہباز کو دیکھا تھا اور آج پھر میں اسے اسلام آباد کے ایک پتھر میں دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے سے

بہت کمزور اور پشمرہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت تپاک اور حیرت سے ملا۔ اس کے چہرے پہ کلبازی کا ایک پرانا گھاؤ تھا لیکن اس بدنہائی کے باوجود اس کی شخصیت کی خوب صورتی عیاں تھی۔

شام کے کھانے کے بعد میں نے شہباز سے پہلا سوال یہی کیا۔
”آپ کی شادی تو نہیں ہوئی؟“
”ہو چکی ہے!“ شہباز نے کہا۔
”کس سے؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔
”میری تنہائی سے!“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
”میں نے سنا تھا کہ آپ کی شادی ہونے والی تھی؟“ میں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔
”وہ میرے چہرے کے اس بدنما داغ کے ساتھ مجھے قبول کرنے پر تیار نہیں ہوئی۔“ وہ افسردگی سے بولا۔

میرے سینے سے اطمینان کی ایک طویل سانس نکلی۔ میں نے صوفی کی پشت گاہ سے ٹیک لگائی اور کمرے کی اس مدہم روشنی میں شہباز کو اس لڑکی کی کہانی سنانے لگا جس نے محبت پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا اور جو آج بھی اس کی راوتنگ رہی تھی۔ جوں جوں کہانی آگے بڑھتی تھی شہباز کی آنکھیں پھلکتی چلی متوالوں کی قربانیاں کھی رائیگاں نہیں جاتیں۔





عطر

محترم منیر تھے افق

سلام قبول ہو

دیار غیر میں اپنی "ازبو" سے دیگر چراغ کے ساتھ تھے افق سے بھی تعلق جڑا ہے یہ اہل کم فہم اور بد نصیب لڑکی کی داستان ہے اس بد نصیب نے کھل کھل کر میری آغوش میں ہی دم توڑا تھا۔ اسے کوئی بیماری بھی نہیں تھی مگر شدید ترین پچھتاوے کا احساس تھا جو آخر اس کی جان لے گیا۔ اسی کی داستان کو میں نے کہانی کی شکل دینے کی کوشش کی ہے امید ہے آپ کے معیار پر پوری اترے گی دعاگو

راوی: نوشہ حلیل زاد

لاس ویگاس امریکا

نصرین محمد یعقوب بھٹی

آج جب وہ گھر سے نکلنے لگی تھی تو عطا بابا نے اسے روکنے کی کتنی کوشش کی تھی۔ عطا بابا نے اسے گود میں کھلایا تھا۔ وہ ان کی بے حد عزت کرتی تھی۔ وہ ملازم ہونے کے باوجود فیملی ممبر کی سی حیثیت رکھتے تھے۔

رائے کی نگاہوں میں ابھی تک عطا بابا کا آخری عکس موجود تھا۔ اسے روکنے کی کوشش میں ناکامی کے بعد ان کا چہرہ حزن و یاس کی تصویر بن گیا تھا اور شاید زندگی میں پہلی دفعہ رائے نے ان کی آنکھوں میں غم کی سرخی بھی دیکھی تھی۔ واضح طور پر وہ رائے کے رویے سے بے حد ناخوش تھے۔

رائے کا ٹیل فون کافی دیر سے گنگنا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی، یہ کال عطا بابا کی طرف سے ہے۔ اس لیے اس نے فون نہیں اٹھایا تھا۔ اب آنسوؤں نے بہہ کر دل کے بوجھ کو خاصا ہلکا کر دیا تھا۔ کال اوکے کرنے تک وہ خود کو خاصا سنبھال چکی تھی۔

"بیٹا! گھر آ جاؤ۔ خان صاحب کی حالت خاصی خراب ہے۔ دے کا شدید حملہ ہوا ہے۔ وہ تمہیں یاد کر رہے ہیں۔" عطا بابا کی ضعیف آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ "تمہیں تمہاری ضرورت ہے بیٹا!

عزیز خان کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ اس کے باوجود رائے خان گھر سے نکل آئی تھی۔ عزیز خان اس کے والد تھے۔ مگر اس کے باوجود رائے کے احساسات ان کے حوالے سے پتھر ہو چکے تھے۔

جلتی آنکھوں کے ساتھ وہ بڑی رش ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ وہ محض اپنے باپ کی محبت آمیز نگاہوں سے دور ہونے کے لیے گھر سے نکل آئی تھی۔ اسے باپ کی محبت و شفقت محض دکھاوے کی لگتی تھی۔ وہ جب بھی اپنی محبت و شفقت کا اظہار کرتے تھے۔ رائے چڑی جاتی۔ لکھیاں اس کے وجود میں تیزی سے گھٹنے لگی تھیں۔

مگر ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ یہ تبدیلی محض تین ماہ پہلے کی تھی۔ اس سے پہلے تو رائے کی جان بھی اپنے باپا میں تھی۔ یہ محبت شاید اب بھی بہت گہرائی میں نہیں موجود تھی۔ مگر اس پر منوں وزنی پتھر آ گرے تھے۔

رائے نے ساحل کے ایک ویران گوشے میں گاڑی روکی اور اسٹیرنگ سے سر ہٹا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہ آنسو باپ کی خرابی صحت کی وجہ سے کئی دنوں سے رُکے ہوئے تھے۔ باپ کی حالت دیکھ کر اس کا دل جیسے دھیرے دھیرے ٹپکلا جا رہا تھا۔

خدا کے واسطے گھر آ جاؤ۔“ آخر میں وہ باقاعدہ گڑگڑائے تھے۔

رائے کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو رواں ہو گئے۔ اس نے بڑی بے دردی سے ان آنسوؤں کو مسلا اور عطا بابا کی التجاؤں سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر ذوالقرنین آگئے ہیں؟“ گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون کر دیا تھا۔

”ہاں، وہ آگئے ہیں۔ تمہارا پوچھ رہے ہیں۔ ان کا ارادہ خان صاحب کو اسپتال لے جانے کا ہے۔ تم فوراً آ جاؤ۔“ عطا بابا کی سوئی اسے گھر بلانے پر انکی ہوئی تھی۔

رائے کو گھبراہٹ نے آ گھیرا۔ کراچی آج کل شدید سردی کی لپیٹ میں تھا اور اس موسم میں عزیز خان کے دسے کی تکلیف خاصی بڑھ جاتی تھی۔ گھر میں مصنوعی آکسیجن کا بھی انتظام تھا۔ مگر ڈاکٹر ذوالقرنین انہیں اسپتال لے جانا چاہتے تھے تو ضرور معاملہ خاصا سیریس تھا۔

دل بے اختیار بیمار باپ کی طرف کھینچا۔ اس سے پہلے کول پر اختیار نہ رہتا۔ اس نے دل کی دھڑکنوں کو چتر کرتے ہوئے سرد انداز میں کہا۔ ”میرا ڈاکٹر کے سر پر کھڑا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر ڈاکٹر ذوالقرنین انہیں اسپتال لے جانا چاہتے ہیں تو لے جائیں۔“

”تم زیادتی کر رہی ہو رانی بیٹا!“ عطا بابا لرزتی آواز میں شکوہ کناس ہوئے۔ ”آخر تم خان صاحب کو کس جرم کی اتنی کڑی سزا دے رہی ہو؟“

رائے کا سر دلچسپ برقرار رہا۔ ”انہیں معلوم ہے اور آپ کو بھی.....“ ساتھ ہی اس نے نہ صرف لائن کاٹ دی بلکہ سیل فون بھی آف کر دیا۔ عطا بابا کے سوال نے اس کے ذہن کو دوبارہ سے اُدھیر دیا تھا۔ من و شیریں یادوں

کے ایک جھرمٹ نے اسے گھیر لیا۔

بادل تو کئی دنوں سے گھرے ہوئے تھے۔ ایک لخت ایک تڑاکے سے فضا پر چھایا سکوت ٹوٹ گیا۔ بادل زور سے گر رہے تھے۔ اچانک چند لمحوں میں طوفانی بارش نے گاڑی کو ڈھانپ لیا تھا۔ سردیوں کی بارش تو اپنے اندر تسلسل اور دھیمہ اپنے رکھتی ہے، مگر رائے کے دل کی طرح موسم بھی طوفانی ہو گیا تھا۔

رائے نے گاڑی کا انجن چلا کر ہیٹر آن کر دیا اور شال اپنے شانوں کے گرد لپیٹ لی۔ اس طوفانی بارش میں جب ونڈ داسکرین کے پار کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جیسے دنیا سے کٹ گئی تھی اور یہ چلچلہ گی اسے اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ یادوں کے جھرمٹ نے اسے مکمل طور پر ڈھانپ لیا۔

اس دن بھی سرما کی بارش ہو رہی تھی مگر تسلسل سے اور دھیمی دھیمی سی۔ رائے کو ایسے موسم سے عشق تھا۔ عزیز خان اس کے مزاج کے سارے رنگوں سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے رائے کے اس عشق کے سبب اپنی وسیع و عریض کوٹھی کے دور تک پیچھے لائن میں ایک گلاس روم تعمیر کروا دیا تھا۔ ماسوائے پھت کے وہ سارے کا سارا شیشے سے بنا ہوا تھا۔ گرمیوں کی بارش اور خوش گوار موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے شیشے کی دیواروں میں کھڑکیاں بھی تھیں اور ان دیواروں کو دیرینہ دروں سے ڈھانپنا بھی جاسکتا تھا۔

اس وقت پردے سنے ہوئے تھے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ رائے دیر ایرانی قالین پر کمرش کے سہارے نیم دراز تھی، جدید ترین ساؤنڈ سسٹم پر دھیمی آواز میں ”بھیا بھیا سا دمبر ہے“ بج رہا تھا اور اس کے قریب کا جو سے بھری ایک پلیٹ پڑی ہوئی تھی۔

کا جو چہاتے ہوئے اس کی نظریں شیشے کی دیوار کے پار جاسن کے درخت پر جمی ہوئی تھیں۔ جس کے پتوں سے بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ جاسن کے درخت کے پار دور افق تک سرمئی بادلوں کے پرے کے برے جمع تھے۔

گزشتہ دو دن سے رائے کا ذہن قدرے الجھا ہوا تھا۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی محرم کے شروع ہوتے ہی پایا جانی فرانس چلے گئے تھے اور اپنی ساری الجھنیں وہ پایا جانی سے ہی شیئر کرتی تھی اور اس دفعہ تو اپنی الجھن کے سبب وہ پایا جانی کی ہر سال فرانس یا تیرا کو بھی ایک نئے زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ سوال جنم لے چکا تھا کہ پایا جانی ہر سال مخصوص ایام میں ہی کیوں فرانس جاتے ہیں۔ یہ تو وہ پایا جانی کی زبانی سن چکی تھی کہ وہ کاروباری سلسلے میں ہر سال فرانس جاتے ہیں مگر مخصوص ایام میں کیوں؟ اس سوال نے اب جنم لیا تھا۔

رائے کی الجھن کا آغاز اس وقت ہوا۔ جب وہ کالج میں بننے والی نئی فرینڈ اریبہ کے گھر گئی تھی۔ اریبہ کا گھر بھی اس کے گھر کی طرح سسٹان تھا۔ اریبہ کے ابو ایک ملٹی پتیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پر تھے اور شام گئے گھر آتے تھے۔ ایک بھائی تھا جو ایم بی بی ایس کے لیے چین میں ہوتا تھا۔ اریبہ کی امی بھی رائے کی طرح اس کے بچپن میں فوت ہو گئی تھیں۔

رائے کی خاطر تواضع کے بعد اریبہ اپنا فیملی الیم لے آئی تھی۔ اس میں اریبہ کی امی کی بھی کئی تصویریں تھیں۔ ایک تصویر میں وہ تھیں اریبہ کو گود میں لیے بیٹھی تھیں۔ اس تصویر کو دیکھتے ہوئے اریبہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے اپنی امی کی سنی ہوئی ڈھیروں باتیں رائے سے شیئر کیں۔ اسی وقت رائے کو یہ عجیب احساس ہوا کہ وہ اپنی ماں کے متعلق کچھ بھی

نہیں جانتی۔ اس نے بھی ماں کی تصویر نہیں دیکھی تھی۔ حتیٰ کہ اسے تو اپنی ماں کا نام بھی معلوم نہیں تھا۔ گھر واپسی پر وہ جتنا سوچی گئی اتنا الجھتی چلی گئی۔ اپنی ماں کے متعلق اس نے پایا جانی سے صرف اتنا سنا تھا کہ وہ فرنج تھیں اور پایا جانی نے ان سے اس وقت شادی کی تھی جب وہ فرانس میں مقیم تھے۔ رائے کی پیدائش کے چند ماہ بعد وہ فوت ہو گئیں اور پایا جانی اسے لے کر پاکستان آ گئے تھے۔

رائے کو اب محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے تو کبھی ماں کی کسی محسوس ہی نہیں کی تھی۔ پایا جانی نے خود کو مکمل طور پر اس کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کی غیر موجودگی میں عطا بابا ہوتے تھے۔ تین عدد پھوپھیاں بھی قریب ہی میں رہتی تھیں۔ بڑی پھوپھو قدرے سخت اور مختلف مزاج کی تھیں۔ دونوں چھوٹی پھوپھیاں تو اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ پھر تینوں پھوپھوں کے کل ملا کر سات بچے تھے۔ رائے بھی وہاں تو کبھی دو لوگ رائے کے گھر ہوتے تھے۔ سوائے بہن بھائیوں کی کسی بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

مگر اب رائے کو یہ بات غیر فطری لگتی تھی کہ اس کی ماں کی ایک تصویر تک موجود نہیں ہے اور وہ ان کا نام تک بھی نہیں جانتی۔ پایا جانی اور ماں کی شادی کے حالات بھی ایک دھند کے پیچھے اوجھل تھے۔ وہ اس سلسلے میں پایا جانی سے بہت سے سوالات کرنا چاہتی تھی مگر وہ فرانس میں تھے اور فون پر ایسے سوالات کر کے دو آنہیں ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتی تھی۔

پایا جانی نے ایک دفعہ اسے بتایا تھا کہ وہ اپنی ماں کا عکس ہے۔ الجھن کا شکار ہونے کے بعد اس نے کئی دفعہ نیٹے میں اپنا جائزہ لیا تھا۔ اس کے بال شہد رنگ تھے اور آنکھیں گہری سبز تھیں۔ اکثر لوگ اسے فائر بچہ نہتے تھے۔

کی رہ گئی ہے۔ جو تمہیں ماں کا خیال آیا ہے۔ کیا ایسا ہی ہے بیٹا؟“ ان کی کھوجی لگائیں رائے کے چہرے پر جم گئیں۔

رائے بے اختیار ان کے بازو سے لگ گئی اور شانے سے والہانہ انداز میں چہرہ رگڑتے ہوئے بولی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے بابا!“ اس کا لہجہ بھی بھگ گیا تھا۔ ”یہ آپ کی اور پاپا جانی کی بے پایاں محبت تھی جس نے مجھے بھی بھی مہما کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔“ پھر اس نے اپنی انجمن بیان کر دی۔

عطا بابا اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے سنتے رہے۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ رائے خاموشی سے ان کے بولنے کی منتظر تھی۔ ان کے چہرے کی جھریوں میں وہ گزرا وقت دیکھنا چاہتی تھی۔ چند لمحوں بعد عطا بابا نے عمیق سانس لی اور دھیرے سے بولے۔

”تم غلط بیانی نہ سمجھنا۔ میں بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ خان صاحب کی زبان اس بارے میں ہمیشہ خاموش رہی ہے۔“ رائے سن ہی ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ عطا بابا اس سے جھوٹ بلکہ کسی سے بھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔ عطا بابا سر جھکائے کہہ رہے تھے۔

”میں بھی دوسروں کی مانند اتنا جانتا ہوں کہ فرانس سے واپسی پر وہ تمہیں ساتھ لائے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے فرانس میں ہی شادی کر لی تھی اور تمہاری ماں تمہاری پیدائش کے کچھ عرصہ بعد فوت ہو گئی تھیں۔ اس سے زیادہ انہوں نے کبھی کچھ نہیں بتایا۔“ انہوں نے افسردہ سی سانس لے کر ایک انکشاف کیا۔ ”خان صاحب کی فرانس روانگی سے پہلے تمہاری بڑی پھوپھی عطا بابا کی ان سے اس سلسلے میں بات ہوئی تھی۔“ رائے وزیر دست دیکھی محسوس ہوئی۔

دراز سے ہماری بیٹی جیسی شہزادی کو اپنے دیس لے جانے کے لیے آتا ہے؟“ پھر ان کا لہجہ معنی خیز ہوا۔ ”میرا خیال ہے سفید گھوڑے والے اس شہزادے کی کہانی ہی مناسب رہے گی۔ جس کی شکل ہمارے صمام بیٹے سے ملتی چلتی تھی۔“

صمام کے ذکر پر رائے کے عارض دہک اٹھے اور چکیں خود بخود جھک گئیں۔ پھر اس نے ٹھنک کر کہا۔ ”نہیں بابا! مجھے کسی شہزادے و زاوے کی کہانی نہیں سننی۔“ اس نے کچپ لگا کر پکڑا منہ میں ڈالا اور دانت چلاتے ہوئے بڑے آرام سے عطا بابا کے گھٹنے پر سر رکھ دیا۔

عطا بابا بیٹری کی طرف ہاتھ پھیلا کر گرم کر چکے تھے۔ انہوں نے رائے کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر کون سی سناؤں؟“

رائے باقی ماندہ پکڑا حلق سے اتار چکی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دوسرا پکڑا اٹھایا اور بڑے اطمینان سے دھماکا کیا۔

”میں آج ماما اور پاپا جانی کی کہانی سنوں گی۔ وہ کیسے ملے؟ کن حالات میں ان کی شادی ہوئی؟ وغیرہ وغیرہ اور میری ماما کی تصویریں وغیرہ اگر ہیں تو کہاں ہیں؟“

عطا بابا اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئے تھے۔ رائے کے بال سہلاتا ان کا ہاتھ بھی جلد ہو گیا تھا۔ رائے نے فوراً ہی ان کی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ سیدھی ہوٹھی۔ ”کیا ہوا بابا؟“

عطا بابا کی آنکھ سے ایک آنسو نکل کر چہرے کی جھریوں میں کہیں کھو گیا۔ رائے تڑپ اٹھی۔

”بابا! کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟“

عطا بابا نے نفی میں سر ہلایا اور بھرائی آواز میں کہا۔ ”شاید میری اور خان صاحب کی محبت میں کوئی

بابا کی گود میں سر رکھ کر کہانیاں سنتی آئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے عطا بابا کو دیکھا۔ ان کے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا ہاٹ پاٹ تھا اور دوسرے سے انہوں نے چھتری سنبھالی ہوئی تھی۔ اوور کوٹ کے اوپر انہوں نے گرم چادر بھی اوڑھ رکھی تھی، کچھ عرصہ کا قاضا تھا، ویسے نہیں سردی بھی زیادہ لگتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جوتے باہر اتار کر گلاس روم کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئے۔ دروازے کی طرف براہ سنا بنا ہوا تھا۔ چھتری بھی انہوں نے وہیں چھوڑ دی تھی۔

رائے نے اپنا بے ترتیب دوپٹا شانوں پر درست کیا اور سیدھی ہوٹھی۔ ریصوت کے ذریعے اس نے ساؤنڈ سسٹم بھی آف کر دیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی تھنڈی ہوا کا تندر یلا ہینر کے سبب نیم گرم گلاس روم میں گھس آیا تھا۔

عطا بابا نے ہاٹ پاٹ رائے کے سامنے رکھا اور ایک لمبی سی گراہ کے ساتھ اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ انہیں ریڑھ کی ہڈی کا بھی کوئی رابلہ تھا۔ جس کے سبب انہیں اٹھتے بیٹھتے تکلیف ہوتی تھی۔

انہوں نے گرم چادر اتار کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! آج تمہیں کہانی کی کیا سبب بھی؟“ رائے نے ہاٹ پاٹ کا ڈھکن اٹھا کر ایک پکڑا نکالا۔ ”بس بابا! جی چاہ رہا تھا۔“ اس نے نیم گرم خستہ پکڑے پر دانت آزمائے۔ ہاٹ پاٹ کے اندر نمٹا نو کچپ کا سا شام بھی موجود تھا۔ وہ اسے کھولنے لگی۔

عطا بابا کا چہرہ خوشی کی چھوار سے بھگ گیا تھا۔ انہیں اس کے لاڈلے نانا اور چھوٹی چھوٹی فرمائشیں پوری کرنا بے حد پسند تھا۔ انہوں نے ہنستا ہنستا کہا۔

”میری رانی بیٹی! کون سی کہانی سننے کی؟ سبز پری والی یا اس شہزادے والی جو سفید گھوڑے پر بیٹھ کر دور

اس نے زیادہ دیر آئینے میں اپنا جائزہ لیا تو آئینہ سرگوشیاں کرنے لگا۔ پھر آئینے ہی کے ایک کونے میں صمام کی گہری سیاہ اور بے حد چمک دار آنکھیں ابھرا آئیں۔ یہ ستائش بھری آنکھیں اس پر جمی تھیں۔ وہ جھبرا کر آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اس کے شہابی رخسار دہک اٹھے تھے۔

جامن کے درخت پر نظر میں جمائے اچانک ہی اس کے ذہن میں جیسے ٹکسوساچ کا تھا۔ اسے عطا بابا کا خیال آیا۔ اس نے سنا تھا کہ عطا بابا اس وقت سے ان کے گھر تھے۔ جب ان کی عمر محض آٹھ، دس سال کی تھی۔ ان کا دنیا میں آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اور انہوں نے شادی بھی نہیں کی تھی۔ پاپا جانی کی طرح ان کی محبتوں کا محور و مرکز بھی رائے ہی تھی۔

رائے کو معلوم تھا کہ عطا بابا، پاپا جانی کے بے حد قریب تھے اور یہ ہو نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کی ماں کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوں۔

رائے کا ہاتھ کارڈیں انٹرکام کی طرف بڑھا۔ گلاس روم چونکہ مرکزی عمارت سے میسر علیحدہ تھا۔ اس لیے یہاں یہ انتظام کیا گیا تھا۔

انٹرکام ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی اس کا بزر بیٹھنے لگا۔ رائے کے چہرے پر خود بخود مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ جانتی تھی کہ دوسری طرف عطا بابا ہی ہوں گے۔ جو موسم کی مناسبت سے اس کے لیے پکڑے تیار کروا چکے ہوں گے۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ اس کی آواز سنتے ہی عطا بابا نے کہا۔

”رانی بیٹا! پالک کے بچوں والے پکڑے تیار ہیں۔ تمہارے لیے بھجوا دوں؟“

”بابا! بھجوانا دیں بلکہ آپ خود لے کر آ جائیں۔“ میرا آپ سے کہانی سننے کو جی چاہ رہا ہے۔“ رائے نے بھی پچی کی طرح ٹھنک کر کہا تھا۔ میٹرک تک وہ عطا

”پھر کیا بتایا انہوں نے؟“ اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

”عطیہ بیگم کے ڈھیر سارے سوالات کے جواب میں انہوں نے صرف ایک جواب دیا تھا۔ ”رائہ ہم تن گوش ہوگئی۔ لکھ بھر کے ڈرامائی وقفے کے بعد عطا بابا بولے۔ ”انہوں نے کہا تھا، سب لوگوں کے لیے اتنی بات کافی ہونی چاہیے کہ رائہ میری بیٹی ہے اور میرے دل کا ٹکڑا ہے۔“

رائہ اپنے باپ کی محبت کے احساس سے شرابور ہوگئی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بے اختیار بھیگ گئے۔ عطا بابا نے متفکر انداز میں کہا۔

”میرا خیال ہے عطیہ بیگم زنا ہو کر گئی ہیں۔“

رائہ پہلے چونکی۔ پھر وہ بھی متفکر ہوگئی۔ صہام بڑی پھوپھو کا ہی اکلوتا بیٹا تھا۔ صہام اور اس نے چاہت کی سیرجی پر پہلا قدم نا جانے کب رکھا تھا مگر بغیر کسی عہد و پیمان کے ایک ایک سیرجی چڑھتے محبت کی سب سے بلند اور آخری منزل تک پہنچ چکے تھے اور سارا خاندان اس بات سے آگاہ تھا۔ بڑے ان دونوں کے حوالے سے سرگوشیاں کرتے دیکھے گئے تھے۔ ان دونوں کے سجا ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی مگر اب بڑی پھوپھو کے خفا ہو کر جانے کا خیال اندیشوں کو بنوادے رہا تھا پھر اس نے خود کو سلی دی۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ بہن، بھائیوں میں معمولی رنجش ہو جاتی ہیں اور پایا جانی کی واپسی کے بعد وہ ان کے گلے میں بانٹیں ڈال کر اور سینے پر سر رکھ کے اپنی ماما کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لے گی۔ یہ سوچ کر وہ مطمئن ہوگئی۔

عطا بابا اسے مطمئن نہ کر سکنے کے سبب شرمندگی محسوس کر رہے تھے اور سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اپنے خیالات کی رو سے نکلتے ہی رائہ ان کی طرف متوجہ

ہوئی اور نیا سوال داغ دیا۔

”پاپا جانی محرم کا مہینہ شروع ہوتے ہی فرانس چلے جاتے ہیں۔ کیا واقعی وہ بڑاں کے سلسلے میں جاتے ہیں؟ اور اگر یہ بات درست بھی ہے تو محرم کے مخصوص مہینے میں کیوں جاتے ہیں؟“ اس نے باقاعدہ وکیلوں کے انداز میں جرح کرتے ہوئے دوسرا سوال بھی کر دیا تھا۔

”وہ واقعی کاروباری سلسلے میں جاتے ہیں مگر میرا خیال کہ وہ تمہاری ماں کی قبر پر قرآن خوانی اور دس محرم کو پھول وغیرہ بھی ڈالتے ہیں۔“

رائہ نے سوچ کر طمانیت کا سانس لیا کہ اس کی ماما کم از کم مسلمان تو تھی۔ ورنہ آزاد خیال معاشرے میں پیپر میرج کرنے والے جوڑے اپنے اپنے مذاہب پر قائم رہتے ہیں۔

بہر حال اس کے دل میں اپنی ماں کے حوالے سے زبردست تجسس بیدار ہو چکا تھا۔ اگلے دن اسی تجسس کے زیر اثر وہ اپنی سب سے اچھی پھوپھو خدیجہ بیگم کے گھر جا دھمکی۔ خدیجہ بیگم اسے سب سے زیادہ پیار کرتی تھیں اور ان کی آنکھوں سے رائہ کے لیے ہمیشہ سے پناہ گاہ تھی۔ ان کے چار بچے تھے اور رائہ کی ان چاروں سے خوب مٹتی تھی۔

قریب ہونے کے سبب رائہ پیدل ہی آگئی تھی۔ جیسے ہی اس نے گیٹ سے اندر قدم رکھا، دس ساڑھے تھیل دوڑتا ہوا آ کر اس سے لپٹ گیا۔ وہ پھوپھو خدیجہ کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ رائہ نے اسے گود میں کھلایا تھا۔

”آئی! آج آپ پورے تین دن اور چھ گھنٹے بعد ہمارے گھر آئی ہیں۔“ اس نے شکوہ کیا۔ اتوار ہونے کے سبب وہ اس وقت گھر میں تھا۔ رائہ نے جواب دیا۔ ”تم نے پورا حساب رکھا ہوا ہے؟“

اتھ ہی اس نے تھیل کے بال کھینچے۔ تھیل نے تردید ہوتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”باقی سب کہاں ہیں؟“ غیر معمولی خاموشی کے بعد رائہ نے پوچھا۔

”ممی، پاپا تو مارکیٹ گئے ہیں۔ باقی کمبلوں میں بسے اور ٹی وی پر چڑھے ہوئے ہیں۔“ اس نے کچھ طرح سے منہ بنایا تھا کہ رائہ کی فہمی چھوٹ گئی۔ سے یاد آیا کہ فی 20 ورلڈ کپ شروع ہو چکا تھا۔ ٹیل، صائم اور حرا کرکٹ کے دیوانے تھے۔ تھیل کو کرکٹ بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ فٹ بال کا شیدا ماں رائہ نے تھیل کے ساتھ پوری جی جان بدمقدم جاتے ہوئے کہا۔

”تم باپ سردی میں کیا کر رہے ہو؟“ بارش رگ کی تھی مگر سردی کی شدت بدستور قائم تھی۔

”آپ ہی کی طرف آ رہا تھا۔“ پھر اس کا انداز ازاد رائہ ہوا۔ ”دراصل میں نے عدیل بھائی، ماما اور حرا آئی کا ایک کارٹون بنایا ہے۔“ اس میں مذمتی طور پر تصویریں بنانے کی صلاحیت تھی اور اپنے کو بھی مصوری سے دلچسپی تھی۔ وہ تھیل کی حوصلہ افزائی کرتی رہتی تھی۔

”اوہ۔۔۔ دکھاؤ!“ رائہ نے زبردست دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

تھیل نے فوراً اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک طے کیا ہوا کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ رائہ نے پرتج کی سیرجیوں میں رگ کرکٹ لڑنے کی ذہنی استعداد پر حیران رہ گئی۔ ایک ہی شکل کے تین پو پوکل کارٹون تھے۔ جنہوں نے فی وی کو جکڑا ہوا تھا۔ فی وی پر کرکٹ کچھ گنہایاں کیا گیا تھا۔ ایک کونے میں دو پو پوکل کارٹون کی شکل کا ننھا سا کارٹون بھی نظر آ رہا تھا۔ جس کے ہاتھوں میں فٹبال تھی۔

ایک جیسی شکلیں ان کے آپس میں خوفی رشتے کو ظاہر کر رہی تھیں۔ پیغام بے حد واضح تھا۔ کرکٹ کے شیدا بڑے بہن، بھائیوں کے ساتھ ساتھ فی وی پر ان چھوٹوں کا بھی حق ہے۔ جنہیں کرکٹ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

”ونڈرفل یار! مجھے یقین ہے تم ضرور اس میدان میں پام پیدا کرو گے۔“ رائہ نے تحقیقی تحسین سے کہا۔ تھیل کے چہرے پر رنگ کھڑ گئے۔ اپنی محنت کا صلہ اسے مل گیا تھا۔ بولا۔

”آئی! میں سوچ رہا ہوں۔ اسے بچوں کے ایک میگزین کو بھیج دوں۔“

رائہ نے چٹکی بجائی۔ ”زبردست آئیڈیا ہے، اس کے بعد ہم ان تینوں کو شرمندہ بھی کر سکتے ہیں۔ خیر تمہارے گھر میں، میرے خیال میں ایک سے زیادہ فی وی ہیں، تم فٹ بال کے بیچ دوسرے فی وی پر دلچسپی لیتے ہو۔“

تھیل نے براہ راست منہ بنایا۔ ”مامی! فی وی اور پلازما ذراتی وی میں بہت فرق ہے۔“ رائہ نے ہنسیوں اچکا میں۔ تھیل ادھر ادھر کی کچھ بات کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ دیگر کزنز سے نمٹ کر اپنے کمرے میں آنے کی اس نے رائہ کو خصوصی تاکید کی تھی۔

رائہ فی وی لاؤنج میں داخل ہوئی تو عدیل بھنگڑا ڈال رہا تھا۔ جب کہ صائم اور حرا کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ رائہ کو دیکھتے ہی عدیل چمکا۔

”آئیے۔۔۔ آئیے! تمہارا پاپا اپنی پیاری کزنوں کا دکھ بانٹنے اور پھر بکن میں جا کر ان کا ہاتھ بنائے۔“ رائہ ہر معاملے میں عدیل کے مقابلے میں صائم اور حرا کی سائیڈ لیتی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ ضرور عدیل نے کوئی میدان مارا ہے۔ ”کیا ہوا؟ یہ صاحب اتنا اچھل کیوں رہے

سرسری سے انداز میں رائے سے اپنے ماموں کی خیریت وغیرہ دریافت کی اور پھر عدیل کی طرف متوجہ ہو گئی۔ رائے جانتی تھی کہ اسے کرکٹ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے، مگر عدیل کی گہری دلچسپی کے سبب وہ بھی کرکٹ میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ رائے نے وہاں سے اٹھ جانا ہی بہتر سمجھا۔ وہ ٹیبل کے کمرے میں چلی گئی۔

رات کو وہ خدیجہ پھوپھی کو انگوٹھی میں نکھسی ہوئی تھی۔ عطا بابا کو اس نے فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ رات کو وہیں رہے گی۔ ایسا اکثر ہی ہوتا تھا اور وہ سوئی بھی پھوپھو کے ساتھ ہی تھی۔

پھوپھی کی ہدایت پر اس نے بیس بیئر آف کر کے ٹائٹ بلب آن کیا اور دوبارہ سے پھوپھو کے ساتھ ٹیبل میں گھس گئی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے ذہن میں الفاظ تشکیل دیے اور پھر گویا ہوئی۔

”پھوپھو! میری ماما کے بارے میں آپ کو کتنا معلوم ہے؟“

خدیجہ بیگم چونکی۔ پھر تاجا جانے کیا سوچ کر انہوں نے طویل سانس لیا اور بولیں۔

”وہی جو کبھی جانتے ہیں۔ بھائی جان نے کبھی اس بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں۔“ پھر انہوں نے رائے کی طرف کرکٹ لی اور اس کی پیشانی چوم کر کہا۔

”تجھے یہ خیال آج کیسے آیا؟“

اس نے اپنی اہمیں پھوپھو کے گوش گزار کر دی اور یہ بھی بتا دیا کہ اس موضوع پر پایا جانی اور بڑی پھوپھو کے درمیان تلخ کلامی بھی ہو چکی ہے اور بڑی پھوپھو خفا ہو کر ان کے گھر سے گئی تھیں۔ یہ اطلاع پا کر خدیجہ بیگم بھی متفکر ہو گئیں۔ وہ رائے اور صمام کے معاملات سے بھی آگاہ تھیں اور یہ بھی جانتی تھیں کہ ان کی بہن

نجمہ اور بھانجی عازنہ آج کل کس چکر میں لگی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف وہ اپنی بڑی بہن کے مزاج اور خیالات سے بھی بخوبی آگاہ تھیں۔ ان کی انگلیوں سے رائے کے بالوں میں سرسراہٹ لگیں۔ انگلیوں سے کہیں زیادہ برقی رفتاری سے ان کا ذہن چل رہا تھا۔ صمام اور رائے کے حوالے سے وہ بے حد متفکر اور پریشان ہو گئی تھیں۔

عطیہ بیگم اس نظریے کی حامی تھیں۔ باپ پر بیٹا، پتا پر گھوڑا، بیٹا نہیں تو گھوڑا۔ اسی طرح ان کا خیال تھا کہ بیٹیاں بھی ماؤں کا عکس ہوتی ہیں۔ بہت زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ تو ماؤں کی فطرت اور مزاج و عادات کا پرتوان میں نظر آتا ہی ہے۔

اس حوالے سے وہ صمام اور رائے کے رشتے پر کئی تحفظات رکھتی تھیں۔ خدیجہ بیگم کا دل اچانک ہی لرزنے لگ گیا۔ انہیں کئی سال پہلے کی ایک بات یاد آ گئی تھی۔ عطیہ بیگم نے کہا تھا کہ ممکن ہے رائے ان کی ناجائز اولاد ہو۔ اس لیے بھائی صاحب اس کی ماں کے بارے میں کچھ نہیں بتاتے۔ اس بات سے خاندان کے اور بھی کئی لوگ واقف تھے۔ خدیجہ بیگم کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے زیر زمین ڈھروں اداؤں کی چکا ہے اور باہر نکلنے کی راہ ڈھونڈ رہا ہے۔ آتش فشاں کس بھی وقت پھوٹ سکتا تھا۔

خدیجہ بیگم کو اس معصوم سی بھتیجی پر بے طرح ترس آیا۔ ان کا شفقت بھر اس بات سے ہی اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور ننھی سی بیٹی کی مانند وہ ان کے بازو سے لپٹی ہوئی تھی۔ وہ گھر کی بلی بڑھی بیٹی تھی۔ ممکن ہے اس کی ماں کی فطرت میں کوئی کمی ہو، مگر وہ تو شہنہ کی طرح پاکیزہ فطرت کی مالک تھی۔ ڈھونڈنے سے بھی اس میں کوئی عیب و بُرائی نہیں مل سکتی تھی۔ اس کے ذہن کے کورے کا خد پر صرف صمام کا نام لکھا ہوا تھا مگر منہ زور اور اپنی بات پر ڈٹ جانے والی فطرت

ہیں؟“ اس نے صائمہ اور حرا کی طرف دیکھتے ہوئے مکمل آگاہی چاہی اور فوراً ہی عدیل کے چھوڑے کسبل میں گھس گیا۔ حرا اور صائمہ کو اس کی موجودگی کے سبب کچھ ڈھارس بندھی۔ صائمہ نے کہا۔

”ناس پر شرط لگی ہوئی تھی۔ عدیل ہارتا تو جا کر دہلی والوں سے حلیم لے آتا۔“

عدیل درمیان میں کوا۔ ”اور یہ دونوں یہاں ہارتمیں تو میرے لیے انڈوں کا حلوہ بنائیں۔ میں یعنی پاکستان ٹاس جیت گیا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے آنکھیں ماتھے پر رکھیں۔ ”فورا سے پہلے میرا کسبل چھوڑ دو اور کچن کی راہ لو۔ میں اتنے میں ابتدائی اوور دیکھ لوں۔“

رائے نے ان کی کرتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ ”انڈوں کا حلوہ بھی بن جائے گا۔ پہلے ابتدائی اوور کی تو ایک دو ”فٹنی“ کھیل لیں۔“ صائمہ اور حرا نے فوراً ہی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

عدیل نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو تینوں نے شور مچا کر اسے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ بڑی مشکل سے اس نے چیخ کر کہا۔

”فو.....فو.....نو..... پہلے انڈوں کا حلوہ پھر کوئی اور بات بلکہ مجھے بھی اپنی پارٹی کے بندے بلا لینے چاہئیں۔“ اس نے ٹراؤزر کی جیب سے اپنا سیل فون نکالا۔

حرا نے فرضی آستینیں چڑھائی۔ ”بلا لو..... بلا لو..... اپنی اس کچھ لگتی اور ”سالی“ کو۔“ اس نے سالی پر زور دے کر اور کچھ اس طرح دانت کچکا کر کہا کہ صائمہ اور رائے ہنسنے لگیں۔ بعد میں حرا بھی اس ہنسی میں شریک ہو گئی۔

بھانجی پھوپھو نجمہ کی بیٹی ثمان سے عدیل کی نسبت ملے گی اور چند ماہ تک شادی ہونے والی

تھی۔ ثمان اور اس سے بڑی عازنہ کے سوا عدیل کی خوب بھتیجی تھی۔

عدیل جے پیر کی بی بی بٹائی وی لاؤنج میں ٹیبل تھا۔ رائے نے اس کا ٹیبل چھوڑنے سے صاف انکار دیا تھا۔ سدا کی تابعدار بہن صائمہ نے ہم آنکھیں پھیر لی تھیں۔ مجبوراً اسے خود جا کر اسٹور میر سے کبل لانا پڑا۔ میچ شروع ہو گیا تھا۔ پاکستان کی ٹیم ٹینگ کر رہی تھی۔ کبھی کی دلچسپی اس طرف مبذول ہوئی مگر عدیل کا انڈوں کے حلوے کا داویلا چارو رہا۔ رائے نازل نہ ہوئی تو وہ میچ سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ حلوہ سے بھی لطف اندوز ہوتا۔

کچھ دیر بعد عدیل کو کمک میسر آ گئی۔ ثمان نے آتے ہی شور مچا دیا۔ ”میرے ہونے والے مجازی خدا کے ساتھ اتنی زیادتی۔ کچھ خدا کا خوف کرو لو کیو؟“ اس نے صائمہ اور حرا پر آنکھیں نکالیں۔ ”اٹھو اور کچن میں گھس جاؤ۔ میرا دل بھی انڈوں کے حلوے کے لیے چل رہا ہے۔“ اس نے رائے کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔

رائے کا وجود کئی سے بھر گیا۔ کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ یہ دونوں بہنیں اس سے کھنچی کھنچی سی رہنے لگی ہیں اور اسے دانستہ نظر انداز کر دیتی ہیں۔ عازنہ کے ٹانے کی وجہ بھی یقیناً اس کی موجودگی تھی۔

رائے کو یہ بھی معلوم تھا کہ آج کل عازنہ کا زیادہ تر وقت صمام کے گھر گزارتا تھا۔ عطیہ پھوپھی کی وہ خاصی چپقلی تھی۔ شوکر کے سبب عطیہ پھوپھی ناگلوں میں درد رہتا تھا۔ عازنہ ان کی ناگلوں سے بھی دلچسپی لیتی تھی۔

رائے ان خدمت گزاروں کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔ صائمہ اور حرا نے امداد طلب نظروں سے رائے کی طرف دیکھا۔ مگر اس نے کندھے اچکائیے۔ ثمان کے رویے کے سبب وہ بھی اس سے گریزاں تھی۔

عدیل کی تمام تر توجہ میچ کی طرف تھی۔ ثمان نے

کی مالک عطیہ بیگم کی آنکھوں پر تو اپنے نظریے کی
پٹی بندھی تھی اور وہ ہر صورت رائے کی ماں کے بارے
میں جاننا چاہتی تھیں۔
خدیجہ بیگم کو اپنے بڑے بھائی پر بھی غصہ رہا تھا۔
جنہوں نے خواہ مخواہ ہی اس معاملے کو بڑا سراہا بنادیا
تھا۔ ان کی طویل ہونی خاموشی کے سبب رائے نے کہا۔
”کیا سوچ رہی ہیں پھوپھو؟“ اس کی آنکھیں
بدستور بند رہی تھیں۔ ماں جیسی محبت کرنے والی پھوپھو
کی انگلیاں جیسے اس کی انجینیں کھینچ رہی تھیں۔ وہ
بڑی طمانیت و سکون محسوس کر رہی تھی۔
”کچھ نہیں؟“ خدیجہ بیگم نے روایتی جواب دیا اور
مزید کہا۔ ”تو زیادہ فکریں نہ پال۔ تمہارے پاپا
آجائیں، میں ان سے سب کچھ معلوم کر لوں گی۔“ یہ
کہتے ہوئے ان کا لہجہ اعتماد سے عاری تھا۔ عزیز خان،
رائے کے بچپن میں ایسی کئی کوششیں ناکام بنا چکے تھے۔
رائے نے مطمئن ہو کر ان سے گلے میں بازو ڈال
دیا۔ اسے تھکتے ہوئے خدیجہ بیگم کو ایک خیال آیا۔ اس
خیال کے سبب انہوں نے رائے سے کہا۔
”صمام سے تیری ملاقات کب ہوئی ہے؟“
صمام کے ذکر پر رائے کی دھڑکنیں بے ترتیب
ہونے لگی۔
”اسلام آباد روانگی سے ایک دن پہلے گھر آیا
تھا۔“ رائے سرخ ہو گئی۔ پھوپھو کی بغل میں سر دیتے
ہوئے اس نے اشات میں سر ملایا۔
صمام نے امریکن اسٹوڈنٹ ویزے کے لیے
اپلائی کیا تھا۔ امریکی سفارت خانے کی طرف سے
انٹرویو کی کال آئی تھی اور اسی سلسلے میں وہ اسلام آباد
گیا تھا۔
خدیجہ بیگم نے اسے سمجھانے والے انداز میں
کہا۔ ”وہ واپس آجائے تو ذرا اس کے کان کھینچ۔ اس

کے امریکہ جانے سے پہلے تم دونوں کے رشتے
کا باضابطہ اعلان ہو جانا چاہیے۔ اسے بول رشتے
کے لیے اپنی ماں کو تیرے گھر بھیجئے۔ اس کی ماں کے
دل میں اگر کچھ ہے تو وہ بھی سامنے آ جائے گا۔“ خوشی
کا متوازن جھولا اچانک ہی ڈگمگانے لگا تھا۔
اندیشوں نے یلغار کر دی۔ رائے نے گھبرا کر آنکھیں
کھول دیں۔

”میں اسے صبح ہی کہہ دیتی ہوں۔“
خدیجہ بیگم نے اس کے سر پر آہستہ سے چپت
لگائی۔

”ارے پاگل! اسے آجانے دے۔ ایسی باتیں
فون پر کرنا مناسب نہیں ہے۔“
کچھ دیر بعد رائے سوچتی تھی۔ مگر خدیجہ بیگم کی
آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ صمام بے حد خوبرو
اور پُر اعتماد جوان تھا۔ اس کی اور رائے کی جوڑی بلاشبہ
چاند سورج کی جوڑی تھی۔ مگر ایک بات خدیجہ بیگم کو
پریشان کر رہی تھی۔ ان کی بڑی بہن عطیہ بیگم دہنگ
اور اپنی بات منوالینے کی بھرپور اہلیت رکھتی تھیں۔ صمام
پر اپنی ماں کا اثر بہت گہرا تھا۔ خود اعتمادی سے بھرپور
صمام آج بھی ماں کے سامنے محض چند سال کا بچہ ہی
تھا۔ ماں کی موجودگی میں وہ دب سا جاتا تھا۔

خدیجہ بیگم یہ سوچ کر مزید پریشان ہو گئیں کہ اگر
صمام کو اپنی ماں کے سامنے رائے کا مقدمہ لڑنا پڑا تو وہ
لڑنے کا حق ادا نہیں کر پائے گا۔
خدیجہ بیگم نے اپنی معصوم بیٹی کے لیے خدا
سے ڈھیروں دعائیں مانگیں اور پھر سونے کی
کوشش میں لگ گئیں۔

☆.....☆.....☆
صمام واپس لوٹا تو بے حد خوش تھا۔ اسے یقین تھا
کہ وہ انٹرویو میں کامیاب رہا اور اسے امریکن ویزا مل

جائے گا۔ رائے بھی اس کی خوشی میں خوش تھی۔ مگر اس کی چار سالہ جدائی کا خیال بھی سوہان روح تھا، وہ چپکے چپکے کئی دفعہ آنسو بہا چکی تھی۔

اس وقت بھی وہ دونوں لاگت ڈرائیور پر نکلے ہوئے تھے۔ رائے اس کی خوش مزاجی کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی مگر یہ خوشی بغیر روح کے تھی۔ کچھ دیر بعد صمام نے اس بات کو محسوس کر لیا۔ اس نے سرگما کر رائے کی طرف بغور دیکھا اور پھر رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔

”اوئے، کیا بات ہے؟ مجھے محسوس ہو رہا ہے تمہیں کوئی بات پریشان کر رہی ہے؟“

تنہائی میں جب وہ رائے کو ”اوئے“ کہہ کر مخاطب کرتا تھا تو رائے کو بہت اچھا لگتا تھا۔ اس پل بھی ایسا ہی ہوا۔ اس نے خوش گوار انداز میں کہا۔

”اوپنہ! تمہیں ایسا محسوس ہوا؟“

ایک خیال صمام کو سر پر کر گیا۔ ”لگتا ہے تمہیں کو میری چار سالہ جدائی کے خیال نے اندر ہی اندر افسردہ کیا ہوا ہے۔ رائے خاموش رہی۔

”ایسا ہی ہے نا؟“ اس کی والہانہ نظریں رائے پر جمی تھیں۔

رائے کو آنسوؤں کا گوارا حلق میں پھنستا محسوس ہوا۔ اس کی آنکھیں تیزی سے سرخ ہوتی چلی گئیں۔ صمام نے لب سمجھتے ہوئے ایک منسوبی جگہ دیکھ کر گاڑی سڑک سے نیچے اتار کر روک دی۔ ارد گرد ویرانی تھی۔ صمام نے اس کا گلابی گداز اور زندگی کی حرارت سے بھرپور ہاتھ تھام کا سہلایا۔

”تم سے چار سالہ جدائی کا خیال میرے دل کو تڑپا رہا ہے۔“ اس کی آواز میں بے پناہ جذبوں کی شدت تھی۔ ”امریکہ جا کر اپنی تعلیم مکمل کرنا میرا خواب ہے، مگر یہ خواب تمہارے آنسوؤں کی قیمت پر مجھے قبول نہیں۔ میں امریکہ نہیں جاؤں گا۔“ اس نے غصے سے

انداز میں کہا۔

رائے کے لیے آنسو روکنا ممکن نہیں رہا۔ اس نے بے اختیار صمام کے شانے پر سر رکھ دیا۔ صمام کی انگلیاں اس کے شہد رنگ بالوں میں سرسرا لگیں۔ رائے نے ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا۔

”تم ضرور امریکہ جاؤ میں تمہارا انتظار کروں گی۔ مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔“ اس کی قربت صمام کو پگھلا رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ شوخ ہوا۔

”بے فکر رہو، کوئی میم مجھے اپنے جنگل میں نہیں پھنسا سکتی۔ میں تو پہلے ہی پھنسا ہوا ہوں۔“

رائے نے اس کے شانے سے سر اٹھایا۔ صمام اسے تنکے ہی گیا۔ آنسوؤں سے بھیگا چہرہ، متورم آنکھیں اور تھر تھراتے گلابی لب۔ اس نے گہرا سانس لے کر خود کو سنبھالا۔ رائے کسی اور کیفیت میں تھی۔ عام حالات میں تو وہ اس کی نظروں کا زاویہ بدلتے ہی سرخ ہونے لگ جاتی تھی۔

رائے نے کہا۔ ”مجھے کسی میم سے نہیں تمہاری ماس سے ڈر لگتا ہے۔“

صمام بات کی تہہ تک نہیں پہنچا تھا۔ اس کا شوخ انداز برقرار رہا۔ میری ماس اور تمہاری عزیز از جان پھوپھو کے لیے یہ انکشاف ہوگا۔ رائے نے خود کو سنبھال کر اسے گھورا۔ صمام نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ ایسی کیا بات ہوئی کہ تم ماس سے ڈرنے لگی ہو؟“ اس کی استغناء پر نظریں رائے پر جم گئیں۔ رائے نے نشو سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”بڑی پھوپھو، میری ماس اور پاپا کی بد اسرار شادی کو بہت اہمیت دینے لگی ہیں۔ وہ میری ماس کا بیک گراؤ نہ جانتا چاہتی ہیں۔ نا جانے ان کی نظروں میں یہ معاملہ کیوں اتنا اہم ہو گیا ہے۔ میں انہی کی ٹوہ میں

کھیل کر جوان ہوئی ہوں۔ انہیں مجھے دیکھنا چاہیے، آخر میں ان کی بیٹی ہوں۔“ رائے الجھتی گئی تھی۔ ”خدا جانے ان کے دل میں کیا ہے۔ مجھے اندیشے اور وسوسے پریشان کرتے ہیں۔“

صمام متفکر سا اسے دیکھے چار ہاتھ تھا۔ ماں کے خیالات سے وہ چند دن پہلے ہی آگاہ ہوا تھا۔ اگر وہ خیالات رائے تک پہنچ جاتے تو رائے ہمیشہ کے لیے ان سے متفر ہو جاتی۔ اس لیے صمام نے انہیں خود تک ہی محدود رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بھئی سے ہونے والی آخری مخفی آمیز ملاقات کے بعد عطیہ بیگم نے واشگاف انداز میں صمام پر واضح کر دیا تھا کہ جب تک یہ معلوم نہیں ہوتا کہ رائے اپنے والدین کی جائز اولاد ہے اور اس کی فرخ ماں نے باقاعدہ اسلام قبول کر کے اسلامی طریقے سے عزیز خان سے نکاح کیا تھا۔ اس وقت تک رائے ان کی بہو نہیں بن سکتی۔

انہیں یہ کسی صورت قبول نہیں تھا کہ ایک ناجائز نرکی ان کی بہو بنے۔ کوشش کے باوجود صمام اپنی ماں کے سامنے رائے کے حق میں کوئی دلیل نہیں دے سکا تھا۔ ماں کے سامنے وہ ایسے ہی کمزور پڑ جاتا تھا۔

ماں نے اسے اس بارے میں رائے سے واضح بات کرنے کے لیے کہا تھا کہ وہ اپنے باپ سے اپنی ماں اور ان کی شادی کا بیک گراؤ نہ معلوم کرے۔ صمام کو بھی یہ بات منسوب ہی معلوم ہوئی تھی آخر ایسا کیا تھا جسے ماموں نے اب تک چھپایا تھا۔ اگر سارے معاملات ہی جائز طریقے سے ہوتے تو انہیں بتا دینا چاہیے۔ آخر ان کی اگلوٹی بیٹی کی ساری زندگی کا معاملہ تھا۔

صمام کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا اور آج رائے نے خود ہی اسے موقع فراہم کر دیا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت سے بے خبر رائے کہہ رہی تھی۔

”آج کل عازنہ بی بی کو بڑے پھوپھو کی خدمت کا بھوت چڑھا ہوا ہے۔“ اس کا لہجہ سچ ہوا تھا۔ ”موصوف زیادہ تر تمہارے گھر پائی جاتی ہیں۔ بڑی پھوپھو اس پر صدقے داری ہو رہی ہیں۔“

”کچھ جلنے کی بو آ رہی ہے۔“ تمام تر سنگینی کے باوجود صمام باز نہیں آیا تھا۔

رائے نے اس کے کندھے پر ہکا مارا۔ ”تمہیں مذاق سوچ رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کوئی چھڑی ضرور پک رہی ہے۔ میرا دل کہتا ہے ہمیں جدا کرنے کی کوئی سازش بڑی تیزی سے پروان چڑھ رہی ہے۔“ آخر میں وہ روہاسی ہو گئی۔

صمام نے ایک دفعہ پھر اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی گہری سبز آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”ایسی کی تھی سر زین کرنے والوں کی۔“ محبت نے اس کے لہجے کو بڑا زلفیق بنادیا تھا۔

وہ بالکل سچ ہی ہوئی۔ اس کا دوسرا ہاتھ خود بخود صمام کے ہاتھ پر چلا گیا تھا۔ وہ کچھ دیر بے خودی کی سی کیفیت میں رہے۔ ہاتھوں کا لمس ہمیشہ ساتھ بھانے کا وعدہ کر رہا تھا۔ واپسی پر رائے نے بات چھیڑی۔

”تم پھوپھو کو میرے گھر بھیج دینا۔“

”کس لیے؟“ صمام نے آن جان بن کر اسے چھیڑا۔

”مجھے جوتے لگانے کے لیے کہ میں نے تمہیں دل کیوں دیا؟“

اس کے اس جملے کے انداز پر صمام کھلکھلا کر ہنس دیا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ پھر رائے بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گئی۔ کچھ دیر بعد صمام نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”مما کو تو میں بھیج دوں گا مگر پہلے تم ماموں سے بات کرو۔“

”میں کیا بات کروں؟“ رائے نے جڑ بڑھ کر کہا۔
”میرا مطلب ہے، پہلے تم انہیں مجبور کرو کہ وہ تمہاری ماما کے بارے میں زبان کھول دیں۔“ رائے نے زخمی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ صمام نے فوراً ہی اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ لیا۔
”دیکھو! میری بات کو کسی غلط رخ سے نہ دیکھو۔ تمہیں مجھے اور باقی خاندان کو بھی تو تمہاری ماما کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔ آخر ایسا کیا ہے جو ماموں اس بارے میں کچھ بتانے کے لیے رضامند نہیں ہیں؟“
”مجھے، خود کو اور خاندان کو درمیان نہ لاؤ۔“ رائے کا انداز سرد ہو گیا تھا۔ ”اس بارے میں تمام تر دلچسپی اور کھوج تمہاری ماما کو ہے اور اس دلچسپی کے پس منظر سے تم بھی شاید واقف ہو گے۔“ دل میں چھپی بات آخر رائے کی زبان پر آ گئی تھی۔
صمام نے گہرا سانس لیا۔ ایک دفعہ وہ جی چاہا کہ رائے کو اپنی ماما کی دلچسپی کے پس منظر سے آگاہ کر دے۔ اس نے بمشکل خود کو روکا۔ مگر رائے کو مطمئن کرنا بھی ضروری تھا۔ اس نے نرم الفاظ تراش کر کہا۔
”تمہارا انداز درست ہے۔“ اس نے وند اسکرین کے پار نظریں جمائیں۔ رائے کی نظریں بھی سامنے سڑک پر تھیں۔ چند ہی لمحوں میں ان کے درمیان تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ جس کے سبب وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے بھی گریزاں تھے۔ صمام نے سلسلہ کلام جوڑا۔
”تمہیں بخوبی معلوم ہے میری ماما خاندانی شرافت و نجابت کو اچھی خاصی اہمیت دیتی ہیں۔ اسی سلسلے میں وہ تمہاری ماما کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں جاننا چاہتی ہیں۔“ رائے کو اپنے حلق میں کڑواہٹ سی کھلتی محسوس ہوئی مگر وہ بولی کچھ نہیں۔

صمام چند لمحوں کے بولنے کا منتظر رہا۔ پھر دل کڑ کر کے اس نے کہا۔
اس کے علاوہ وہ یہ بھی جاننا چاہتی ہیں کہ تمہاری ماما نے اسلام قبول کیا تھا اور شادی اسلامی طریقے سے ہوئی تھی؟“
رائے کو محسوس ہوا کہ وہ جیسے زلزلے کی زد میں آ گئی ہے۔ سگی پھوپھو اس کی شخصیت کے تمام مثبت پہلوؤں کو نظر انداز کر کے گڑھے مردے اکھاڑنے پر تل گئی تھیں۔
اس کی ذہانت و معاملہ فہمی اسے باور کر رہی تھی کہ صمام نے نرم الفاظ کا سہارا لیا تھا۔ یقیناً پھوپھو کے الفاظ و خیالات زیادہ سخت ہوں گے۔ اس کا دل جلنے لگا مگر آنکھیں خشک ہی رہیں۔ وہ بو جھل انداز میں بولی۔
صاف کہو پھوپھو یہ جاننا چاہتی ہیں کہ کہیں میں اپنے والدین کی ناجائز اولاد تو نہیں ہوں۔“
”تم جذباتی ہو رہی ہو۔“ صمام بوکھلا گیا۔ ”ماما نے ایسا کچھ نہیں کہا۔“ اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔
رائے نے سیٹ کے پشتے کے ساتھ سر لگا دیا۔ آج اسے اپنا وجود بے محسوس ہو رہا تھا۔ صدیوں کی جھٹکن جیسے اس کے چہرے پر اتر آئی تھی۔ آنکھیں موندتے ہوئے وہ ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔
”فرض کرو اگر میں واقعی ناجائز ہوئی تو تمہاری ماما اور خاص طور پر تمہارا فیصلہ کیا ہوگا۔“ اس نے بڑے گنہگار انداز میں کہتے ہوئے صمام کو ایک دوراہے کی طرف جھیل دیا تھا۔
صمام کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔
”خود کو سنبھالو رائے! تم ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو رہی ہو۔ تمہارا رویہ تباہ کن ہے۔“ رائے کا سوال اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔

”میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے صمام۔“ رائے نے بے حد ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔
صمام کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ ماں کے سامنے کھڑے ہونے کے خیال سے اس کی ٹانگیں کاٹنے لگی تھیں۔ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔
”میں ماما کو منالوں گا۔“
رائے ہذیانی انداز میں ہنسی۔ ”مجھے یقین ہے۔ ورنہ تمہاری ماما تمہیں تو منائی لیں گی۔“ اس کا گھر نزدیک آ گیا تھا۔ اس کے کہنے پر صمام نے گاڑی روک دی تھی۔
رائے گاڑی سے اتر گئی تھی۔ صمام نے اسے آواز میں دیں مگر وہ رکی نہیں۔ آنسو بڑی تیزی سے یلغار کر رہے تھے۔ صمام کے کمر و انداز نے اسے توڑ دیا تھا۔ وہ تو صمام سے چٹانوں سے ٹکرا جانے والے عزم کی امید لگائے ہوئے تھی۔ مگر ان لمحوں میں وہ بھول گئی تھی کہ صمام کتنا اپنی ماما کے اثر میں ہے۔
صمام اس کے پیچھے ہی آ گیا تھا۔ رائے نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا۔ وہ صمام کے سامنے آنسو بہانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے پندار محبت کو زبردست ٹھیس پہنچ گئی تھی۔ صمام اسے پکارتا ہی رہ گیا پھر اس کی آواز میں عطا بابا کی آواز بھی شامل ہو گئی۔ مگر وہ ٹکے میں منہ چھپائے روئی رہی۔ جب دستک اور پکارنے کی آوازیں بند نا ہوئیں تو اس نے ہذیانی انداز میں جڑا جڑا کر صمام کو چلے جانے کے لیے کہا۔ پھر غالباً عطا بابا صمام کو وہاں سے ہٹا کر لے گئے تھے۔
اگلے کئی دن تک وہ خود ترسی کی سی کیفیت میں رہی۔ صمام نے اس سے منے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر رائے اسے دیکھتے ہی کمرے میں بند ہو جاتی تھی۔ اس نے گھر سے نکلتا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ اگر وہ واقعی ناجائز اولاد بھی تو اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ اس

بات کے ذمہ دار تو اس کے والدین تھے۔
اسے ساری دنیا سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ باپ سے، پھوپھو سے، صمام..... حتیٰ کہ اپنے وجود سے بھی۔ اس نے اپنا خیال تک رکھنا چھوڑ دیا تھا۔
عطا بابا اس کی حالت دیکھ کر بے حد پریشان تھے۔ صمام کی زبانی انہیں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ عزیز خان کا روزانہ ہی کسی وقت فون آ جاتا تھا۔ رائے فون پر خود کو نارمل ظاہر کرتی تھی۔ عطا بابا کا بھی یہی حال تھا۔ عزیز خان دس کے مرخص تھے اور ذہنی دباؤ یا پریشانی دے کے حملے کا باعث بن کبھی تھی۔
عزیز خان کی واپسی تک رائے نے خود کو خاصا سنبھال لیا۔ صمام کے ساتھ بھی اس کا رویہ نارمل ہو گیا۔ اپنے طوڑ پر خود کو ناجائز اولاد سمجھ لینا مناسب نہیں تھا۔ قسط بات تو اس کے پاپا جانی جانتے تھے اور وہ ان سے بات کرنے کا مصمم ارادہ کر چکی تھی۔
دس محرم گزار کر عزیز خان واپس پاکستان آ چکے تھے۔ اگلے دن شام کو جب کہ وہ اور رائے ٹی وی لاؤنچ میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ رائے نے ان کے گھٹنے پر سر رکھ دیا۔
عزیز خان کا شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پر آ نکلا۔ وہ صوفے پر گھٹنوں پر چادر پھیلائے بیٹھے تھے۔ جب کہ رائے قلعین پر دھڑے کشن پر بیٹھی تھی۔ رائے نے ریموٹ کے ذریعے ٹی وی آف کر دیا اور دھڑے سے بولی۔
”پاپا جانی! میں نے ایک بات پوچھنی تھی آپ سے۔“
اس کے انداز نے عزیز خان کو چونکا دیا۔ ”پوچھو بیٹا! پھر وہ دھڑے سے ہنسنے۔“ ”میرے بیٹے کا انداز آج اجازت لے کر پوچھنے والا کیوں ہے؟“
”بات ہی کچھ ایسی ہے پاپا جانی۔“ رائے کا انداز

خاصا گھبر تھا۔

اس دفعہ عزیز خان کا دل لرزے لگا۔ رائے کا یہ انداز اور عطیہ بیگم سے ہونے والی آخری ملاقات، انہیں ایک ہی سلسلے کی کڑیاں محسوس ہونے لگی تھیں۔ بہر حال وہ رائے کے بولنے کے منتظر تھے۔ چند لمحوں کی پوچھل خاموشی کے بعد رائے نے کہا۔

”پاپا جانی! میں اپنی ماما کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔“ عزیز خان کے اعصاب میں ٹھنڈک اتر آئی ان کی چھٹی جس کا اشارہ ٹھیک ہی تھا۔ رائے کہہ رہی تھی ”وہ کون تھیں؟ آپ کی شادی ان سے کیسے ہوئی؟ ان کا کوئی فیملی ریک گروئنڈ؟ ان کی میں نے کبھی کوئی تصویر بھی نہیں دیکھی؟“ اس نے باپ کے گھٹنے سے چہرہ رگڑتے ہوئے کہا۔ ”ان کے بارے میں کچھ بتائیں پاپا جانی؟“ اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگ گئی تھی۔

عزیز خان جیسے پتھر کی مورتی میں تبدیل ہو گئے تھے۔ وہ سختی عود کرتی تھی، جو رائے کی ماں کے متعلق استفسار کے ساتھ ہی ان کے جسم و جاں کو اپنی زبان بند رکھنے کی توانائی عطا کرتی تھی۔ ایک وعدے، بہت مضبوط عہد کی ناقابل شکست زنجیر ان کی زبان پر تالا لگا دیتی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ ان کا گداز دل جسم کے ساتھ ہی پتھر ہو گیا۔ وہ بولے۔

”تم میری بیٹی ہو رائے!“ ان کی زبان بھی سگھار ہو گئی تھی۔ ”صرف میری بیٹی، تمہاری ماں، تمہاری پیدائش کے بعد اس دنیا میں نہیں رہی تھیں۔ اب بھی میں انہی کی قبر پر پھول اور آنسو کھیر کر آیا ہوں۔ تمہارے لیے اور جن کی زبان تمہارے منہ میں ہے۔ ان کے لیے اتنا جاننا کافی ہے کہ تم میری بیٹی ہو۔“ پھر ان کا انداز فلسفیانہ ہوا۔ ”جو لوگ گڑھے مردے کھاڑتے ہیں۔ ان کے ہاتھ صرف خاک ہی

آتی ہے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے آنسوؤں سے رائے کا سر بٹایا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔ ان کے قدموں میں صدیوں کی تسکین تھی۔ رائے کے ساتھ یہ انداز اختیار کرتے ہوئے ان کا دل خون ہو گیا تھا۔ مگر کیا کرتے وہ مجبور تھے۔ ان کے سدا بہار رنجوں سے تازہ خون رسنے لگا تھا۔ رائے اپنی جائے گم صم اور خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھی رہ گئی تھی۔ پاپا جانی پر جو اسے مان تھا وہ آج ٹوٹ گیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ پاپا جانی، اسے اس طرح جھٹک دیں گے۔ اسے تو یقین تھا کہ پاپا جانی اپنا ماضی کھول کر اس کے سامنے رکھ دیں گے اور اس کی ماما کے بارے میں سب کچھ بتا دیں گے۔ مگر اس کا یقین ریت کا گھر وندا ثابت ہوا تھا۔

اس کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہنے لگے۔ کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ وہ ناجائز اولاد ہے۔ اپنے والدین کی جوانی کی لغزش کا نتیجہ۔ اس لیے تو اس پر جاں نچھاور کرنے والے پاپا جانی کی زبان بند ہو گئی تھی اور انہوں نے اسے بھی پتھر نہیں بتایا تھا۔ وہ کہتی کہ پچی ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ پھر اسے اپنا وجود بے معنی اور اس دفعہ تو قابلِ غرت محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ تیزی سے ٹھنڈی چلی گئی۔

اس دن کے بعد وہ بڑی تیزی سے سب سے دور ہوتی چلی گئی۔ پھوپھوں کے گھر جانا اس نے چھوڑ دیا۔ وہاں سے کوئی آجاتا تو رائے پوری کوشش کرتی تھی کہ اس کی ٹوٹ چھوٹ کو کوئی محسوس نہ کر سکے۔ مگر اس کی پوری شخصیت پر مردونی سی چھا گئی تھی۔ جسے کبھی محسوس کرتے تھے۔ پوچھ پوچھ کر ان کے منہ خشک ہو گئے تھے مگر رائے بڑے آرام سے ان کا وہم قرار دے دیتی تھی۔

حقیقت سے صرف صمام واقف تھا۔ رائے نے

دوبارہ سے اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ وہ جان گئی تھی کہ یہ تل منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ اس کے پاپا جانی، اس کی ماما کے بارے میں کچھ بتائیں گے نہیں اور بڑی پھوپھو محسوس ہوئے بغیر بھی صمام اور اس کے رشتے پر رضامند نہیں ہوں گی۔ صمام سے بھی اسے زیادہ امید نہیں تھی۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ وہ کبھی بھی اس کے حق میں ماں کے سامنے کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ پاپا جانی اور اس کے درمیان پیدا ہونے والی دراڑ تیزی سے بڑھتی چلی گئی۔ ایک غیر محسوس سا کھچاؤ تھا جوان دونوں اور خاص طور پر رائے کو دو مخالف سمتوں میں کھینچ رہا تھا۔

رائے کا دل رفتہ رفتہ باپ کی طرف سے پتھر ہوتا جا رہا تھا۔ رائے محسوس کرتی تھی۔ جیسے پاپا جانی تیزی سے بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ کوئی ڈکھ تھا جو انہیں تیزی سے کھا رہا تھا۔ رائے جانتی تھی کہ یہ دکھ اس کے رویے اور دوری کا ہے۔ جو ان باپ، بیٹی کے درمیان پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی تیزی سے ٹھنڈی صحت دیکھ کر بھی گھبراہٹ رائے کا دل پھٹتا تھا مگر وہ خود کو آگے بڑھنے سے روک لیتی تھی۔ اپنے تئیں وہ اپنے باپ کو زبان بند رکھنے اور ناجائز اولاد پیدا کرنے کی سزا دے رہی تھی۔

باپ بیٹی کے درمیان ایک پل تھا عطا بابا، مگر وہ بھی شکستہ ہو گیا تھا۔ رائے نے ان کی بھی ایک نہیں چلنے دی تھی۔ رائے کے پتھر ہو جانے والے دل سے سرگڑا اکلوا کر انہوں نے خود کو بھی زخم زخم کر لیا تھا۔

رائے کو شک ہوتا تھا کہ عطا بابا ان سارے سوالوں کے جوابات جانتے ہیں، جن کی اسے تلاش تھی مگر شاید وہ اس کے پاپا جانی کے سبب مجبور تھے۔ پھر ایک دن عطیہ پھوپھو اس کے گھر آئیں۔ رائے کو یقین نہیں آیا۔ بہت دنوں بعد دھڑکنوں کا آہنگ خوش گوار ہوا۔ شاید اس کی محبت نے صمام کو

اپنی ماما کے سامنے کھڑا ہونے کی طاقت عطا کی تھی۔ اس نے رائے کے حق میں دلائل دیئے تھے کہ اگر اس کی ماں کے بارے میں ماموں کچھ نہیں بتانا چاہتے تو یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ اگر رائے ناجائز اولاد بھی ہے تو اس میں اس کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کے کردار میں تو کوئی کمی نہیں۔ وہ تو شبنم کی طرح پاکیزہ اور موتیوں کی طرح شفاف دل و دماغ کی ہے۔ یہ سوچ کر رائے کی آنکھیں برسے لگیں۔ عطیہ پھوپھو، پاپا جانی کے کمرے میں تھیں۔ کچھ دنوں سے پاپا جانی کی طبیعت زیادہ ہی گری گری سی تھی، ان کا زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں ہی گزارتا تھا۔ رائے کو کوشش کے باوجود چھپ کر ان کی باتیں سننے سے خود کو باز نہ رکھ سکی۔ رائے کے کانوں میں عطیہ پھوپھو کی تیز، نوکیلی اور ٹھوس آواز گونجتی۔

”عزیز! زندگی میں پہلی دفعہ کمزور انداز میں سی مگر میرے بیٹے نے مجھ سے اختلاف کیا ہے۔ اس نے زور کر مجھ سے رائے کو مانگا ہے، میں ماں ہوں، ڈائن نہیں۔ جو اپنے بچے کی خوشیوں کو کھا جاؤں۔ میں رائے کو صمام کے لیے تم سے مانگنے آئی ہوں۔“ ان کا انداز سوالی سے زیادہ احسان کرنے والا تھا۔

رائے کو اپنا وزن بڑھتا محسوس ہوا۔ بہتے آنسوؤں کے درمیان اسے بے پناہ طمانیت کا احساس ہوا۔ اس کی محبت نے واقعی اثر دکھایا تھا۔ صمام اپنی ماما کے سامنے کھڑا ہو رہی گیا تھا۔ عطیہ پھوپھو کو آخر اپنی ضد چھوڑنی ہی پڑ گئی تھی۔ اس کے پاپا جانی کی کمزوری آواز ابھری۔

”رائے تمہاری بیٹی ہے۔ جب چاہے آ کر لے جاؤ۔“ ”مت کہو اسے میری بیٹی۔“ عطیہ پھوپھو کی پھنکار نے رائے کے وجود سے جیسے روح نکال لی۔ ”وہ تمہاری

اور ایک فریج فاش کی بیٹی ہے۔“
”عطیہ.....!“ اس کے پاپا جانی اتنی قوت سے چلائے تھے کہ ان پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ رائے کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ جیسے ابھی پلسیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔

پاپا جانی نے کھانسی کے وقفوں کے درمیان کہا۔
”مست دوا ایک عظیم عورت کو اتنی بڑی گالی۔ معافی مانگو اللہ سے، لاعلمی کے سبب تم نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔“ رائے نے ان کے ہاتھ کی آواز سنی۔
عطیہ پھوپھو پونے زہریلے طرز سے کہا۔ ”تم ختم کر دو میری لاعلمی، بتا دو کہ کون تھی وہ نیک پروین اور اس نے تمہاری شخصیت کے سحر کی بجائے اسلام کی آفاقی سچائی کے سبب قبول اسلام کر کے تم اسلامی طریقے سے شادی کی تھی۔“

پاپا جانی کو چپ لگ گئی تھی۔ رائے کو ان کی یہ خاموشی زہر محسوس ہو رہی تھی۔

”چپ کیوں ہو گئے عزیز خان!“ پھوپھو عطیہ کی تمسخرانہ آواز ابھری۔ ”بتاؤ اور پھر دکھاؤ کوئی ثبوت، یقین کرو اس کے بعد میں تمہارے پاؤں مچھو کر اپنے الفاظ کی معافی مانگوں گی۔ بولو..... بولو..... کیوں چپ ہو۔ سچے لوگوں کے سر تو تمہاری طرح جھکے نہیں ہوتے۔ تو زہر دو آج یہ خود ساختہ خاموشی یا پھر تسلیم کر لو رائے تمہاری ناجائز اولاد ہے۔ تمہاری جوانی کی ایک بھول۔“

”تم زیادتی کر رہی ہو عطیہ!“ پاپا جانی کی کمزور سی آواز ابھری۔ رائے کا دل چاہا کہ دیواروں سے اپنا سر پھونڈ لے۔ انہیں کمزور پا کر عطیہ پھوپھو اپنی بات پر ڈٹ گئی تھیں۔

”جوانی کی بھول کو تسلیم کر لو عزیز! میں بیٹے کی خوشی کی خاطر ایک ناجائز لڑکی کو اپنی بہو بنالوں

گی۔ مگر شاید اسے اس کا منقبتی مقام منڈے سکوں۔ مگر کم از کم تم میرا ذہن تو صاف کر دو۔ حقیقت کو تو تسلیم کر لو۔“ ان کے سچے میں سراسر احساس برتری اور اتنا بول رہے تھے۔

رائے کو پاپا جانی پر بے طرح غصہ آ رہا تھا۔ وہ بولتے کیوں نہیں..... کیوں نہیں بولتے۔ پاپا جانی کی خاموشی پتھروں کا سینہ شق کر دینے والی تھی۔ چند لمحوں بعد انہوں نے شکست سے انداز میں کہا۔

”اس معصوم کو نا کر وہ گناہوں کی سزا منہ دو عطیہ! اس کی ماں ایک مسلمان تھی۔ بچی اور کھری مسلمان۔ اس کے علاوہ مجھ سے اور کچھ نہ پوچھو۔“ پاپا جانی کھڑے رہے تھے۔

”تو پھر کیا ہے؟ جسے تم چسپا رہے ہو؟“ عطیہ پھوپھو حقیقی عنوان میں ابھڑی تھیں۔

پاپا جانی نے ایک دفعہ پھر خاموشی کی چادر اوڑھ لی تھی۔

عطیہ پھوپھو کچھ دیر ان کے بولنے کی منتظر ہیں۔ پھر ان کے گہرا سانس لینے کی آواز سنائی دی۔

”ٹھیک ہے عزیز! میں بیٹے کی خوشی کے لیے مجبور ہوں۔ مگر تم نے مجھے مطمئن کرنے کی بجائے مزید الجھا دیا ہے۔“ پیران کا انداز وارن کرنے والا ہو گیا۔ ”مگر میں اسے بھی اس کا مقام نہیں دے پاؤں گی، بعد میں کوئی گناہ کرنا۔“ یہ کہہ کر غالباً وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ”صمام کو امریکن ویزا مل گیا ہے۔ اس کے جانے سے پہلے ان دونوں کی منگنی کر دیتے ہیں۔ شادی صمام کی واپسی پر ہوگی۔“

پاپا جانی نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

”تمہاری مرضی! میں بھی کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔“

اس دوران رائے ایک قطعی فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔ اس کے مجرم کا بھی جتنی تعین ہو گیا تھا۔ ہاں! اس کے پاپا

جانی ہی اس کے واحد مجرم تھے۔ جن کی زبان پر لگے تالے کھلنے میں نہیں آ رہے تھے۔

عطیہ پھوپھو کے جانے کے بعد پاپا جانی نے رائے کو اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔ عطا بابا نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے منت بھرے انداز میں کہا۔

”وہ بہت ٹوٹے ہوئے ہیں۔ انہیں تمہاری ضرورت ہے رانی بیٹا!“

”آپ کو میری ٹوٹ پھوٹ کا بھی اندازہ ہے پاپا؟“ اس نے عطا بابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ”میری ماسے وابستہ آ خرایسا کیا راز ہے جو وہ چسپائے بیٹھے ہیں۔“

عطا بابا کی نگاہیں جھک گئیں۔

”وہ بتا کیوں نہیں دیتے کہ میری ماما کون تھی؟ یا یہ تسلیم کیوں نہیں کر لیتے کہ میں ان کی ناجائز اولاد ہوں۔“ وہ ہذیانی انداز میں چیخیں۔

عطا بابا نے پہلے زخمی اور پھر شکوہ انگیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ مگر بولے کچھ نہیں۔

”بس آپ کو بھی چپ لگ گئی نا۔“ رائے کے لہجے میں زہریلا تمسخر در آیا تھا۔ اس کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ ایسا کتنی دنوں سے ہو رہا تھا۔ شاید رو رو کر آنسوؤں کے سوتے خشک ہو گئے تھے۔ اس لیے آنسوؤں کی بجائے اب آنکھوں میں جلن اتر آئی تھی۔

وہ پاپا جانی کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ عطا بابا باہر ہی رہ گئے تھے۔

پاپا جانی بستر پر دراز سینے تک مکمل اوڑھے ہوئے تھے۔ وہ برسوں کے بیمار نظر آ رہے تھے۔ ان کی حلقوں میں اتری ہوئی پیاسی اور یاسیت بھری نظریں رائے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

رائے کا دل گداز ہونے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ پاپا جانی کے سینے پر سر رکھ کر اگر کچھ آنسو بچے ہیں تو بہا

دے۔ دل بے اختیار ہونے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ مکمل بے اختیار ہو جاتی اس نے خود کو سنبھالا، دل کو زبردستی پتھر گرلیا اور خاموشی سے جا کر بیڈ کے قریب بڑی کرسی پر جا کر بیٹھی۔ دل میں غمی سی امید جاگئی کہ شاید وہ اس کی ماما کے بارے میں کچھ بتا دیں، ورنہ اس طلب کا مقصد تو وہ خوب جانتی تھی۔

پاپا جانی نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر اپنے کمزور ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھام لیا اور دھیرے سے تمہید باندھی۔

”آج تمہاری پھوپھو عطیہ آئی تھیں۔“

رائے خاموش رہی۔ معمولی سی امید کر کرن بچھ گئی تھی۔

”وہ جانتی ہے صمام کے امریکہ جانے سے پہلے تم دونوں کی منگنی کر دی جائے۔“

پتھر ہونے سے پہلے ہی وہ سرخ ہو جاتی مگر پتھروں کے بھلا کہل کوئی جذبات ہوتے ہیں۔ اس کے ذہن سے بے تاثر آواز برآمد ہوئی۔

”مجھے صمام سے شادی نہیں کرنی۔“ یہ الفاظ انہیں کوئی دھکا تھا۔ جنہوں نے پاپا جانی کو اچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم بیٹا؟“ انہوں نے بے پناہ تحیر سے پوچھا تھا۔

”وہی جو آپ نے سنا۔“ رائے کا انداز برقرار تھا۔

”اگر میں آپ پر بوجھ ہوں تو پھر کسی بے نام و نشان خاندان میں بیاد دس مجھے۔ ایک بے نام و نشان لڑکی کو شرافت و نجابت کے مالک ایک اونچے خاندان کی بہو بننے کا کوئی حق نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”رانی.....“ دروازے سے نکلنے ہوئے اس نے پاپا جانی کی سسکی سنی مگر وہ رکی نہیں۔

”اس کے بعد جس نے سر مارا اسی کا سر پھونٹا۔ مگر

رائے کے انکار کو اقرار میں نہ بدل سکا۔ صمام بے حد
خفا ہو کر امریکہ کے لیے قلاتی کر گیا تھا۔

طوفانی بارش اب ریم جھم میں تبدیل ہو گئی تھی۔
رائے بھی ماضی سے حال میں لوٹ آئی تھی۔ اس کی
آنکھیں یوں جل رہی تھیں جیسے کسی نے ان میں
سرخ مرچیں بھر دی ہوں۔ وہ مٹی دیر استیر تک سے
سر نکالے رہی۔ پھر اچانک ہی اس کا دل گھبرانے لگا۔
رفیقہ گھبراہٹ بڑھنے لگی۔ گھبراہٹ کی بظاہر کوئی
وجہ نہیں تھی۔ رائے کو اپنے ہاتھوں، پیروں سے جان
نکلنے ہوئی محسوس ہوئی۔

انجن پہلے سے اسٹارٹ تھا۔ اس نے گاڑی کو گیسٹر
میں ڈالا۔ اس کا رخ گھر کی طرف تھا۔ اس عالم میں
اسے ابھی نہیں رہا کہ اس کا سیل فون آف ہے۔
وہ گھر پہنچی تو گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اس کا
وجود لرز نے لگا۔ اس نے گاڑی اس نجی اسپتال کی
طرف دوڑائی، جس سے ڈاکٹر ذوالقرنین منسلک
تھے۔ اسپتال پارکنگ میں جانی پہچانی گاڑیاں دیکھتے
ہی اختلاج قلب بڑھ گیا۔ پایا جانی سے متعلق
اندیشوں نے اسے گھیر لیا تھا۔

انتہائی نگہداشت کے شعبے کی راءداری میں اس کا
سارا خاندان موجود تھا۔ رائے کی آنکھوں کے سامنے
اندھیرا چھانے لگا۔ عطیہ پھوپھو سسکیاں لے رہی
تھیں۔ عطا بابا اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے ہوئے
تھے، سبھی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خدیجہ پھوپھو
تیزی سے اس کی طرف بڑھیں۔ رائے کو بانہوں میں
لیٹے ہی وہ دھڑکیں مارنے لگیں۔

”چلے گئے تیرے پاپا جانی اس دنیا سے چلے گئے۔“
رائے کو زمین اپنے منہ سے ہوتی ہوئی۔ اسے
بڑے زور کا چکر آیا۔ اگلے ہی لمحے وہ بے جان ہو کر

خدیجہ پھوپھو کی بانہوں میں جمول گئی۔ شدید صدمے
کے زیر اثر وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

رائے کو ہوش آیا تو اس کی دنیا لٹ چکی تھی۔
آنسوؤں کے سوتے دوبارہ پھوٹ پڑے تھے۔ وہ پایا
جانی کے سفید کفن میں لیٹے بے جان وجود سے لپٹ
کر دھازیں مار مار کر رونے لگی۔

پاپا جانی کے نیم والپ جیسے اب بھی اسے پکار
رہے تھے۔ عطا بابا کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا
تھا۔ جب جنازہ اٹھا تو رائے ایک دفعہ پھر بے ہوش
ہو گئی تھی۔

پاپا جانی کا چالیسواں ہو چکا تھا مگر رائے کے آنسو
خشک نہیں ہوئے تھے۔ پاپا جانی آخری سانسوں تک
اسے پکارتے رہے تھے۔ تڑپتی آنکھیں پتھرا گئی
تھیں۔ رائے سے رابطے اور تلاش کی ہر کوشش ناکام
رہی تھی، پاپا جانی نے دروازے کی طرف دیکھتے
ہوئے دم توڑا تھا۔ رائے کی شدید ناراضگی کا بوجھ سینے
پر لیے انہوں نے دنیا چھوڑی تھی اور شاید رائے کی ماما
سے متعلق ہر راز اپنے سینے میں لیے منوں مٹی کے
نیچے جا سوتے تھے۔ رائے کو رہ کر اپنی زیادتیاں یاد
آتی تھیں اور آنکھیں برسے لگتی تھیں۔

خدیجہ پھوپھو اتنے دن سے اس کے ساتھ ہی
تھیں۔ عطیہ پھوپھو بھی کئی دن رہ کر گئی تھیں۔ پاپا جانی
کی وفات کے بعد سے ان کا رویہ بدلا بدلا سا تھا۔ وہ
رائے سے بے حد شفقت سے پیش آرہی تھیں۔
خدیجہ پھوپھو آج ہی کچھ دیر کے لیے اپنے گھر گئی تھیں
کہ عطا بابا ایک چھوٹے سے بیگ کے ساتھ رائے
کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ رائے بڑی طرح سے
چونک گئی۔ عطا بابا نے جھکے سر کے ساتھ کہا۔

”رائی بیٹا! اجازت دو۔ میں اس گھر سے جاتا ہوں۔“

رائے کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ عطا بابا کا تو
دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ یہ گھرائی کا تو گھر تھا۔ وہ کہاں
جانے لگے تھے۔ رائے نے بمشکل کہا۔

”کہاں جا رہے ہیں عطا بابا؟“ اس کا انداز بے
رابط تھا۔ اسے مناسب الفاظ ہی نہیں سوجھے تھے۔

عطا بابا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”خدا کی بنائی
کائنات بہت بڑی ہے۔ جہیں تو سر چھپانے کو جگہ مل
جائے گی۔“ ہر دم تیار آنکھیں فوراً ہی برسے لگیں۔

مجھے کس کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہیں؟“
رائے نے آنکھوں کے درمیان کہا۔

عطا بابا جو یہاں سے چلے جانے کا مضبوط ارادہ
باندھ چکے تھے۔ وہ ٹھہرنے لگا۔ ان کی آنکھوں میں
نئی تیر گئی۔ انہوں نے لرزتی آواز میں کہا۔

”مجھے کمزور نہ کرو بیٹا! میرا چلے جانا ہی بہتر ہے۔“
”کیوں بابا؟“ رائے نے ان کا کانٹا ہوا ہاتھ تھم لیا۔

عطا بابا کے لہجے نے مضبوطی پکڑی۔ ”تمہیں دینا
ہوں تو خان صاحب کے آخری لمحات یاد آ جاتے
ہیں۔ تم نے جوانی کے ساتھ کیا وہ نہ کیا ہوتا تو شاید آج
بھی وہ زندہ ہوتے۔“ ولی کیفیت زبان پر آئی گئی تھی۔
رائے کا سر جھک گیا۔ سسکیوں میں تیزی آئی۔ عطا بابا
نے اپنا ہاتھ چھڑایا تو رائے کا بازو ولی شاخ کی طرح اس
کے پہلو میں آگیا۔ اس نے سستے ہوئے کہا۔

”مجھے اپنی زیادتیاں کا بخوبی انداز ہے بابا! مگر
میں کیا کرتی۔ آپ میرے دل میں بھی تو جھانک کر
دیکھیں۔ بے نام و نشان ہونے کا احساس کیا ہوتا
ہے۔ میں بے شک زیادتیاں کی مرتکب ہوئی ہوں
مگر میری کیفیت کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے اتنی کڑی
سزا نہیں دینی بابا!“ اس کے آنسوؤں میں شدت آ گئی۔
”مجھے چھوڑ کر نہ جائیں بابا! میں مرنے لگی۔“

عطا بابا نے جیسے خود کو چھڑ کر لیا تھا۔ رائے کی

بیگم اقبال دہلوی..... بھکر
پڑھنے کا سلیقہ ہو تو پڑھ لیتے ہیں کچھ لوگ
پانی پہ بھی لکھی ہوئی تحریر ہوا کی
راجا محمد صدیق..... راولپنڈی
پیوست نہ ہوں دلجوئی سے تو تیر و سناں بھی بے مصرف
چہہ جائے سلیقے سے تو عدم اک تیر یک بھی کافی ہے
عنان حسین انصاری..... فیصل آباد
پھوٹ بنے دو انہیں یار کے آگے آتش
دل کا احوال بھی آنکھوں کو بیاں کرنے دو
منزہ شزادی..... فیصل آباد
پھر وہ سوئے چمن آتا سے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستان کے ہوا داروں کا

التجائیں بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔ انہوں نے بھیجی
آواز میں کہا۔

”خان صاحب نے دنیا چھوڑتے ہوئے بھی
اپنی پلکوں پر تمہاری راد کے کانٹے چن دیے ہیں، تم
تبنا نہیں رہو گی۔“ رائے چونکی۔ عطا بابا بولے جا رہے
تھے۔ ”آخری لمحوں میں انہوں نے عطیہ بیگم کو ایک
ہی کوکھ اور دودھ کا واسطہ دے کر کہا تھا کہ رائے کو بہو
بنالینا اور اسے اس کا مرتبہ بھی دینا۔ عطیہ بیگم نے آنسو
بہاتے ہوئے ان سے اس کا وعدہ کیا تھا، تم سے بھی
یہی درخواست تھی کہ صمام کو قبول کرلو۔ یہ باتیں کرنی
تو خدیجہ بیگم نے نہیں مگر میں کر رہا ہوں۔ تم تبنا نہیں
رہو گی۔ سارا خاندان تمہارے ساتھ ہے۔“

رائے کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل پھٹ جائے
گا۔ پاپا جانی کو دم توڑتے ہوئے بھی اس کا خیال تھا۔
عطا بابا کی ذہنی روپا پاجانی کی طرف مڑ گئی تھی۔ ”سبھی
ہاتھ دھو کر خان صاحب کے پیچھے پڑ گئے تھے کہ
تمہاری ماں کون تھی؟ کن حالات میں شادی وغیرہ
ہوئی؟ مگر کسی نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ انہوں

عطا بابا نے ایک دل دوز بچی کے ساتھ سلسلہ کلام جوڑا۔ ”کیا خوب صلہ دیا ہے تم نے انہیں ان کی

عطا بابا نے اسی دیوانی سی کیفیت میں کہا: ”بہت شوق ہے ہاتھ میں اپنی ماں کے بارے میں جاننے

قیام

محترم بھائی عمران احمد قریشی!
السلام علیکم

ایک نئی کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ قارئین کو یہ تحریر پڑھنے میں فکشن محسوس ہوگی۔ لیکن درحقیقت یہ ایک سچی کہانی ہے اللہ میرے انداز تحریر اور کچھ ضروری تبدیلیوں کے باعث اس کا رنگ اور انداز مختلف ہو گیا ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے یہ کہانی قارئین کو ضرور پسند آئے گی۔

والسلام
سید عبداللہ شاہد
حیدر آباد

جون 2006ء کی نرم گرم شام تھی۔ مملکت خدا داد ہو جاتی ہیں۔

کے ایک بڑے شہر میں واقع اسپتال میں معمول کی چہل پہل تھی۔

یہ سواچھ بجے کا وقت تھا۔ عبدالباطن اپنی نو مسلم بیوی اسماء کے پاس اسپتال کے پرائیویٹ روم میں اپنے نومولود بیٹے کی پیدائش پر خوشی دوسرت سے نہال ہو رہا تھا۔ شادمانی کی یہی کیفیت دوسری طرف اسماء کی بھی تھی۔ وہ خوشیاں چکر ورنے کے روپ میں جس خدا نے مطلق کو بھگوان اور مختلف دیوتاؤں کے نام سے پکارتی تھی مسلمان ہونے کے بعد اس کا دل محض اللہ کے اسم جبروت سے پہلے سال ہی تشکر اور نیاز مندی کے احساس میں ڈھل گیا تھا۔ آج تین بجے سہ پہر اس کے ہاں ولادت ہوئی تھی۔ وہ ناتوانی کے باوجود ممتا کے اندر جذبات سے آشنا ہو رہی تھی۔ پھر شام کا بھٹپٹا ہونے تک وہ ماں ہونے کی سرشاری میں ہر طرح کی نقاہت کو بھول گئی۔ اب وہ جلدی گھر جانے کے لیے اپنے آپ کو بے قرار محسوس کر رہی تھی۔ تاکہ پر جوش انداز میں اپنے نومولود اور گول مٹول بچے کو کھلائے پلائے۔ اس کے ناز و نخرے اٹھائے۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحبہ نے اسماء کو احتیاط برتنے کی ہدایت کی تھی۔ مگر ممتا بھی تو دوسرے جذبات کی مانند اندھی اور بیجاان خیز

بہر کیف اس وقت اسماء اپنے شیرخوار بچے کو گود میں لیے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر عبدالباطن با وقار انداز میں مسکراتے ہوئے بیوی کی کیفیت سے محفوظ ہو رہا تھا۔

ایک بارگی اسماء نے اپنے والہانہ پن سے چونک کر شوہر کی جانب دیکھا۔

”ہم ماں بننے کو ایسے کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟“ اسماء نے مصروفی سے لہجے میں پوچھا۔

”محبت پداری کے احساس میں تمہاری ممتا بھری ادائیں بہت بھلی لگ رہی ہیں اسماء! اس کی وجہ تمہارے اندر چھپی شاید وہ اچھی ماں ہے جو بچے کا ہر لحظہ خیال رکھے گی۔“

عبدالباطن نے بیوی کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی! کسی بچے کے ماما پتا ہونے کا احساس دوسرے رشتوں سے بے حد انوکھا اور خوب صورت ہوتا ہے۔ آپ بھی تو باپ بننے سے ویسی ہی خوشی محسوس کر رہے ہوں گے۔“ عبدالباطن!۔

”واقعی اسماء! تم درست کہہ رہی ہو ماں باپ کے لیے اولاد کی محبت آبائی زمین کی مانند بہت گہری

اور متاثر کن ہوتی ہے۔ آدمی پر مخصوص جذباتوں سے مسحور ہو جاتا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے عبدالباطن نے چند لمحوں توقف کیا اور پھر خوش گوار لہجے میں اسماء سے کہا۔

”ہمارے شہزادے کا کیا نام سوچا ہے بھی تم نے؟“

”مجھے تو اس بات کا دھیان ہی نہیں رہا عبدالباطن! اسماء اپنے بھلکھو پن پر جھینپ کر بولی۔

”بچے کا کوئی اچھا سا نام آپ ہی رکھ دیں۔“

”اچھا بھئی! میں بیٹے کا اچھا سا نام سوچتا ہوں۔“ عبدالباطن نے پرسوج انداز میں کہا چند لمحوں غور کرتے ہوئے بولا۔

”محمد بلال کیسا نام رہے گا اسماء؟“

”بہت سندر اور چاہت بھرپور ہے۔ یہ نام!۔“ ”تو ٹھیک ہے ہم اپنے شہزادے کا نام محمد بلال رکھ لیتے ہیں۔ یہ اسم مبارک اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے اس شخص کا رکھا تھا جو بلال حبشی کے نام گرامی سے مؤذن اول کہلائے۔“

عبدالباطن نے بیوی کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے پر جوش لہجے میں کہا۔

دوسری طرف اسماء کا چہرہ بھی خوشی و ممتا خیزی سے تھمتھار رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا منتخب جگر محمد بلال کے روپ میں ماضی کی شلیا چکرورتی کے بیولے کو مندرجہ کر رہا ہو اور نو مسلم اسماء کے ناتواں جذبات کو ڈھارس دے رہا ہو۔

وہ ذات کی برہمن اور تین بھائیوں کی اکھوتی لاڈلی بہن تھی۔ والدین سمیت پورا خاندان کٹر ہندو تھا۔ وہ ان سب کو چھوڑ کر عبدالباطن کی محبت میں اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔ اس لیے اپنوں کی جدائی اور مخالفت یاد کر

کے اسماء او اس اور غمگین ہو جاتی تھی۔ محمد بلال کی پیدائش سے اس کی محبت سرخرو ہو گئی تھی۔ اللہ نے اس کے دکھ کے مداوے کی غرض سے ہی اسے اولاد دینے عطا کی تھی۔ وہ نومولود بیٹے کو ”محمد بلال“ کہہ کر پکارنے لگی۔ اسے لگا جیسے رگ دے میں دوڑتی طمانیت اور شاد کامی اس نام کے سبب بڑھ گئی ہو۔

عبدالباطن بیوی کی جذباتی کیفیت کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اسماء نے کسی خیال سے چونک کر شوہر کو دیکھا اور پر جوش لہجے میں بولی۔

”اب میں محمد بلال کو لے کر گھر جانا چاہتی ہوں عبدالباطن تاکہ اسپتال کی وحشت سے دور اپنے گھر کے پرسکون ماحول میں اسے لاڈ پیار کروں۔“

”میرے خیال میں تمہیں کم از کم ایک دن تو یہاں رکنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحبہ کی بھی یہی ہدایات ہیں کہ تمہیں زیادہ سے زیادہ آرام کرنا چاہیے۔ محض چند گھنٹے تو گزر رہے ہیں ڈیویری کو۔“ عبدالباطن نے نرم لہجے میں اسماء کو سمجھایا۔

ادھر اسماء ممتا کے جذبات سے بے قرار اور فکر مند دکھائی دے رہی تھی۔ یوں کہ اس کے ہر لگ جائیں اور وہ محمد بلال کو لے کر اڑتی ہوئی گھر پہنچ جائے وہ بصد اصرار دوبارہ عبدالباطن سے بولی۔

”پلیز آپ ڈاکٹر صاحبہ سے ڈسچارج لینے کی کوشش کریں۔ میری طبیعت پہلے سے اچھی ہے بس تھوڑی کمزوری ہی تو ہے۔“

اس نے قدرے توانا لہجے میں شوہر کو بتایا۔ ماں ہونے کی خوشی سے اس کے چہرے کی تمازت دیدنی تھی۔ یہ دیکھ کر عبدالباطن کے ہونٹوں پر ہنس کود کتا پلا۔

”اچھا بھئی! اب تم ضد کر رہی ہو تو ڈاکٹر صاحبہ سے ڈسچارج کے بارے میں بات کرتا ہوں۔“ شوہر کی شفقتی سے اسماء کی ممتا کو کچھ قرار آیا۔ ادھر

عبدالباطن بیوی کی کیس فائل لیتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کے قدموں کا رخ اسپتال کی مقرر کردہ گانا کا کلبسٹ لیڈی ڈاکٹر کے کمرے کی جانب تھا۔

ماضی حال اور مستقبل کے پیمانوں کو جانچنے پر کھنے کا اختیار محض وقت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور تیز رفتار وقت کی تغیر آمیزی کو سمجھنا یا اس کے نتیجے میں درپیش حادثوں سے بچنا بے حد محال ہوتا ہے۔ آدمی اپنی تمام احتیاط اور غور و تدبر کے باوجود وقت کی بے رحمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ عبدالباطن کے ساتھ بھی وقت کی سنگ دلی نے کچھ ایسا ہی ابھورنگ کھیل کھیل کر اولاد نرینہ کی خوشی اس کے لیے گہرے دکھ میں بدس گئی۔ وہ اس صدمے پر غم سے پھرا گیا تھا۔ یہ جانکا حادثہ محض اس کی بیوی اسماء کی ناگہانی اور ضد کے باعث ہوا۔

کوئی پندرہ منٹ تک عبدالباطن ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں اسے ڈسچارج کی غرض سے قائل کرتا رہا۔ ادھر لیڈی ڈاکٹر بھی اپنے فرائض منصبی پر کوئی سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہ تھیں اور اس امر پر بضد تھیں کہ وہ جو بیس گھنٹے سے پہلے زچہ و بچہ کو ڈسچارج نہیں دے سکتی تھیں۔ عبدالباطن نے اس ضمن میں مزید تنک و دو کی تو آخر کار تندرے فطرتی سے ڈاکٹر صاحب نے اسماء کی کیس فائل پر ڈسچارج کی غرض سے دستخط کرتے ہوئے باور کرایا کہ وہ بے جا اصرار پر زچہ و بچہ کو گھر لے جا رہے ہیں۔ لہذا نا سازی طبع کی صورت میں وہ خود سد دار ہوں گے۔

عبدالباطن نے خندہ پیشانی سے اس کی بات سنی پھر وہ دستخط شدہ فائل لیے کمرے سے نکل آیا۔ باہر آ کر اس نے چند گہرے سانس لیے اور چارج شیٹ کے ارادے سے جنرل کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا۔ اس وقت شام کے سکوت کی وجہ سے علی مرتضیٰ

اسپتال میں لوگوں کی آمد و رفت آفتی۔ یہ واسطہ درجہ کا ایک صاف ستھرا نئی اسپتال تھا۔ جو کسی حد تک جدید سہولتوں سے آراستہ تھا۔ عبدالباطن اپنے مختصر سے گھرانے کے ساتھ انداز پچاس کلو میٹر کی مسافت پر نواحی قصبے سخن آباد میں رہتا تھا۔ علی مرتضیٰ اسپتال چونکہ مضاماتی علاقوں سے سب سے نزدیک تھا۔ اس لیے مختلف قصبوں کے مکین کسی بھی ایمر جنسی کی صورت میں ادھر ہی کا رخ کرتے تھے۔ آج صبح دس بجے عبدالباطن اپنی حاملہ بیوی کو لے کر سخن آباد سے گاڑی میں نکلا تھا اور کم و بیش نصف گھنٹے میں اسپتال پہنچ گیا تھا۔

جنرل کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے عبدالباطن نے کنسلٹنٹ لاؤنچ کی جانب سرسری طور پر نظر دوڑائیں۔ ملاقاتیوں کی سہولت کی غرض سے لاؤنچ آرام دہ نشستوں سے مزین تھا۔ یہ کاؤنٹر سے بائیں طرف قدرے کشادہ اراضی پر محیط تھا۔ علاج معالجے کے لیے آنے والے افراد کی تفریح طبع کی غرض سے دیوار گیر اسینڈ پر مکین ٹی وی موجود تھا۔ عبدالباطن نے دیکھ لاؤنچ میں موجود زیادہ تر لوگ ٹی وی پر کرکٹ میچ کو خاصے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ شاید اس وقت میچ کسی نتیجہ خیز موز پر تھا۔

لوگوں کا ذوق و شوق دیکھتے ہوئے عبدالباطن ہولے سے مسکرایا۔ پھر کاؤنٹر پر پہنچ کر اس نے کیس فائل کو میل ری پوسٹمنٹ کی جانب بڑھا دیا۔ کوئی دس منٹ میں وہ ڈسچارج جنگ کے مرحلے سے فارغ ہوا۔ ادائیگی کے بعد وہ اطمینان سے چلتا ہوا اس کمرے کی جانب چل دیا جہاں اس کی بیوی اسماء نومولود بیٹے کو لیے بیچینی سے اس کی منتظر تھی۔

ادھر اسماء دل ہی دل میں دعائیں کر رہی تھی کہ ڈاکٹر صاحب سے گھر جانے کی اجازت مل جائے۔

نہانے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ شیر خوار محمد بلال کے ساتھ آج کی رات اسپتال کے اس کمرے میں ٹھہری تو کوئی اتہوئی ہو جائے گی۔ کوئی انجانا خوف تھا جو اس کے لاشعور میں کہیں دبکا اسے ڈرا رہا تھا اور اسماء اس کی وجہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ عبدالباطن کمرے میں داخل ہوا تو اس نے جھٹ سے فکر مند کی سے پوچھا۔

”کیا ڈاکٹر صاحب مان گئیں عبدالباطن۔“
”ہاں بھئی مبارک ہو شاید یہ تمہاری ممتا بھری دعاؤں کا مجرہ ہے کہ انہوں نے تم دونوں کو گھر لے جانے کی اجازت دے دی ہے۔“ عبدالباطن نے خوش گفتاری سے جواب دیا۔
شوہر کی بات سن کر اسماء نے خوشی اور طمانیت سے گہرا سانس لیا۔

”اللہ پاک تیرا شکر ہے۔“ نو مسلم بیوی کا تشکر آ میز لب و لہجہ سن کر عبدالباطن کو ایمان پرور خوشی کا احساس ہوا۔ شلیا چکر ورنی اس کی بیوی اسماء کے روپ میں اسے بے حد دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ یہ سچ ہے کہ اللہ جسے چاہے ہدایت کی روشنی عطا کر دے۔
اسما محمد بلال کو سنبھال رہی تھی۔

اگلے چند لمحے عبدالباطن نے بیوی کی مدد کے خیال سے دوائیں اور ضروری سامان سمیٹ کر رکھا پھر وہ قدرے توقف سے بولا۔

”تم اسے اپنا حجاب لوسا۔! جب تک میں باہر سے تازہ پانی پی کر آتا ہوں۔“
”بہت اچھا عبدالباطن!“ جوابا اسماء نے اثبات میں سر ہلایا۔

عبدالباطن دوبارہ کمرے سے نکل گیا۔
باہر کوریڈور میں متوازن قدموں سے چلتے ہوئے وہ اسپتال کے اوپن گراؤنڈ میں آیا۔ پھر کنسلٹنٹ

لاؤنچ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے لوگوں کے داد و تحسین آمیز لہجوں کی گونج سنی۔ شاید کرکٹ میچ کے سنسنی خیز لمحات کسی ایک ٹیم کے حق میں فیصلہ دے چکے تھے۔

”کرکٹ بھی کیسا مشاق اور توجہ خیز کھیل ہے۔ لمحہ لمحہ جوڑتے ہوئے ایک ایک بال سے پہاڑ کی مانند مضبوط ٹارگٹ اسکور کیا جاتا ہے۔ پھر قدم بہ قدم چڑھائی کرتے ہوئے اس ٹارگٹ کو محض اکائی کی برتری سے حاصل کیا جاتا ہے۔“ عبدالباطن نے چلتے ہوئے خوش گواری سے سوچا۔ فریزر مشین بالائی منزل کی مغربی دیوار سے متصل تھی۔ جس میں بیٹنوں کے عزیز و اقارب کے لیے تازہ اور ٹھنڈا پانی ہر وقت دستیاب رہتا تھا۔ وہ سبک روی سے زینہ چڑھتے ہوئے فریزر کے قریب پہنچا۔ اس نے پرسکون انداز میں ایک گلاس پانی پیا۔ ابھی اس نے آخری گھونٹ حلق سے اتارنا تھا کہ ایک بارگی عبدالباطن کو نیچے گراؤنڈ فلور سے دھماکا خیز شور و غل سنائی دیا۔ نیچے موجود لوگوں پر کوئی افتادہ آپڑی ہو۔ اس نے چونکتے ہوئے بالکونی سے نیچے کی سمت دیکھا۔

قیامت خیز شور کنسلٹنٹ لاؤنچ سے اسپتال کے ماحول میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ وسیع احاطے میں موجود لوگ یوں بھاگتے ہوئے تیزی سے لاؤنچ کی جانب لپک رہے تھے جیسے اسپتال میں ایمر جنسی نافذ ہو۔ اس ہنگامہ خیزی کے باعث اسپتال کی پرسکون فضا درہم برہم ہو گئی تھی اور طول و عرض سے خوف و اندیشوں کے سناٹے جھانکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

ماحول کی یہ ابتری چند ثانیوں کا نتیجہ تھی۔ عبدالباطن نے گولگی حالت میں بالکونی سے یہ سارا منظر دیکھا۔ کرکٹ میچ کا اختتام اور یہ قیامت خیز کھرام! اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیوں ممکن تھا؟ پھر وہ سرعت سے

”تھینک یو میں ہوشیار رہوں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے کار کو آگے بڑھادیا۔ گاڑی ذیلی سڑک پر آئی تو پچھلی سیٹ پر بیٹھی اسماء نے متشکر لہجے میں پوچھا۔

”اتنی سخت سیکورٹی کیوں ہے عبدالباطن! شہر کے حالات کیسے چاہتے خراب ہو گئے ہیں؟“

”ابوسعید اسودی کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے اسماء کے کارکنوں نے شہر میں احتجاجاً ہنگامہ برپا کر دیا ہوگا۔“ عبدالباطن نے ڈرائیونگ کے دوران افسردہ لہجے میں بیوی کو بتایا۔

اس کی بات سن کر اسماء پریشان ہو گئی پھر وہ پر تشویش لہجے میں بولی۔

”اب کیا ہوگا؟ ہو سکتا ہے کہ وہ ناکہ بندی کر کے بیٹھے ہوں اور ہماری گاڑی کو بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔“

وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ونڈا سکرین سے دور تک دیکھ رہی تھی۔ ذیلی سڑک اسپتال کے قرب و جوار میں ہونے کی وجہ سے روشن اور ہر امن نظر آ رہی تھی۔ انکا ڈھکا گاڑیاں بھی آتی دکھائی دے رہی تھیں۔

”تم پریشان نہ ہو خدا خیر کرے گا۔“ عبدالباطن نے بیوی کو تسلی آمیز لہجے میں جواب دیا۔

اس لمحے شیر خوار محمد بلال رونے لگا تو اسماء بچے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ کوئی دس منٹ بعد گاڑی مین روڈ پر آ گئی۔ ادھر شام کے سائے بھی تیزی سے گہرے ہو رہے تھے۔ اب عبدالباطن محتاط انداز میں درمیانی رفتار سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ کوئی پندرہ منٹ بعد وہ شہر کے وسطی علاقے سے قریب متبادل راستے سے گزر رہے تھے۔

عبدالباطن اپنی سیٹ پر خاصا چاق و چوبند تھا اور قدرے تیزی سے اس علاقے سے گاڑی نکال رہا تھا۔

جبکہ اسماء کی آنکھیں خوف و اندیشوں سے بھری نظر آ رہی تھیں۔

دونوں میاں بیوی بچہ پچھلی نظروں سے اس متبادل سڑک پر کھڑی جا بجا کارکنوں کو دیکھ رہے تھے۔ جنہیں اسماء کے کارکنوں نے آگ لگا کر ٹریفک معطل کر دیا تھا۔ بجلی کے بریک ڈاؤن کے باعث وہ علاقہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ البتہ کہیں کہیں مکانات سے چمکتی گیس لیمپ کی روشنی میں وہ دھڑکتی بجلی اتاری اور توڑ پھوڑ کو دیکھ کر نوجوانوں کے اشتعال کا اندازہ لگا سکتے تھے۔ کارکنوں نے اپنے عظیم لیڈر کی ہلاکت پر شدید غم و غصے کا مظاہرہ کیا تھا اور ہنگامہ آرائی سے ناخانا مکمل شہر ڈاؤن کر دیا تھا۔ یہ خوف ناک صورت حال دیکھ کر پچھلی سیٹ پر موجود اسماء نے سراسیمگی سے محمد بلال کو اپنے سینے سے بٹھانچ لیا تھا۔ وہ انجانا خوف جو اسپتال کے کمرے میں اسماء کو لا شعوری طور پر بے چین کر رہا تھا اس لمحے سے یانا گیا تھا۔

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے عبدالباطن! خدا نا کرے کوئی ناگہانی پیش آ جائے۔“ اسماء پچھلی سیٹ سے خوف زدہ لہجے میں شوہر سے بولی۔

”تم گھبراؤ نہیں! میں گاڑی تیزی سے یہاں سے نکال رہا ہوں۔ اسماء!“ جواباً عبدالباطن نے کار کی ہیڈ لائٹس میں آگے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

سڑک پر جا بجا کارکنوں میں جن سے نقل و حواں اٹھ رہا تھا۔ وہ قدرے سرعت سے ان کے درمیان سے گاڑی نکالتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ دونوں اطراف چھائی تاریکی میں سے شہریند افراد ایک باہر سڑک پر آ کر انہیں روک سکتے تھے۔ اس وقت خوف و دہشت سے سڑک پر موت کا سا ساٹا چھایا ہوا تھا۔ مشتعل لوگوں کے شدید رد عمل کے ڈر سے پولیس کو کوئی بندہ بھی دور تک نہیں دکھائی دے رہا

زینہ اترتے ہوئے نیچے آیا۔ اسپتال کا احاطہ ویران ہو گیا تھا۔ لوگوں کا جم غفیر کنسلٹنٹ لاؤنچ میں کھڑا تھا۔

”ہوسکتا ہے کہ کسی اہم نیوز بریک کی وجہ سے ہنگامہ لگا ہو!“ یہ سوچتے ہوئے عبدالباطن پر جس قدموں سے لاؤنچ کی جانب لپک گیا۔ پھر اس کا ہاتھ ٹھکڑا اور اٹھانے والے اس اہم خبر کی طرف متوجہ تھے۔ جو منٹ کے اختتامی لمحات کے درمیان ٹی وی کے ذریعے نشر کی جا رہی تھی۔ عبدالباطن لوگوں کے جھوم میں سب سے پیچھے کھڑا تھا۔ اسے صورت حال سمجھنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی کہ اسی اثنا میں نزدیک موجود ایک سن رسیدہ شخص واپس احاطے کی جانب پلٹتے ہوئے دکھ سنا۔ بھرتے ہوئے بولا۔

”آخر ظالموں نے ابوسعید اسودی کو بھی شہید کر دیا۔ آہ! میرے خدا! انہیں ہدایت دے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ادھیڑ عمر شخص آگے بڑھ گیا۔ جب کہ عبدالباطن اس کے غم انگیز جملے سن کر اپنی جگہ بہت کھڑا رہ گیا تھا۔ یہ خبر اس کے لیے ایسی جانکاہ تھی۔ یہ وہی جانتا تھا۔ انقلابی رہنما ابوسعید ملک گیر تقسیم کے مرکزی صدر تھے۔ وہ اصلاح عامہ کی تحریکوں کی وجہ سے لوگوں میں بے حد مقبول اور تابخ روزگار شخصیت تھے۔ عبدالباطن کے لیے ابوسعید کا سایہ شفقت باپ سے بڑھ کر تھا۔ وہ نظریاتی طور پر ان سے متاثر تھا۔ اسے ابوسعید سے چند ایک مرتبہ شرف ملاقات بھی حاصل ہوا تھا۔ یہ سچ تھا کہ عبدالباطن ایک سچا اسودی تھا۔ اس لحاظ سے اپنے عظیم رہنما کے اچانک ملنے کی خبر سن کر اس پر سستہ طاری ہو گیا تھا۔

ادھر نیوز بریک ختم ہوا لوگ افسردگی سے منتشر ہوتے ہوئے باہر احاطے کی جانب واپس پلٹنے لگے۔ تب کسی کے ٹپو کے سے عبدالباطن کو ہوش آیا۔ دکھ سے اس کی آنکھوں میں آنسو اُٹھ آئے تھے۔ غم ناکی کی اسی

کیفیت میں اس نے چند لوگوں سے نشر کی گئی خبر کی تفصیلات سے آگاہی حاصل کی۔ جس کے مطابق ابو سعید اسودی کو مسجد سے گھر واپسی کے دوران گھات لگا کر بیٹھے نامعلوم افراد نے فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا تھا۔ ان کے چند دوست و احباب بھی اس فائرنگ کی زد میں آ کر ہلاک و زخمی ہو گئے تھے بعد میں حملہ آور فرار ہو گئے تھے۔

اپنے مشفق استاد اور راست گورہنما کی شہادت سے عبدالباطن پر حزن و ملال کی کیفیت طاری تھی۔ بہر کیف وہ افسردگی سے قدم بڑھاتا بیوی بچے کو لینے کی غرض سے چل دیا۔

کوئی دس منٹ بعد عبدالباطن اسماء اور بلال کو لیتا ہوا۔ اسپتال کے مرکزی دروازے سے پارکنگ لاٹ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ گاڑی کے قریب پہنچ کر اس نے اسماء کو سہارا دے کر پچھلی نشست پر بٹھایا پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے ہوئے اس نے گاڑی کو رپورس کیا۔ اس وقت اسپتال کی حدود میں معمول سے زیادہ سیکورٹی گارڈز نظر آ رہے تھے اور آنے جانے والوں کی کڑی نگرانی کی جا رہی تھی۔

ادھر محمد بلال کو گود میں لیے اسماء تعجب خیز نگاہوں سے ماحول کی کشیدگی کو دیکھ رہی تھی۔ جبکہ عبدالباطن کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ محض ابوسعید کی شہادت کا رد عمل تھا۔ وہ کارنا ہستہ روی سے چلاتے ہوئے پھانک سے باہر نکلنے لگا۔ مین اس لمحے ایک سیکورٹی گارڈ نے اسے روکے ہوئے بائیں جانب لہجے میں کہا۔

”سینے! جاتے ہوئے محتاط رہیے گا۔ شہر کے حالات خراب ہیں۔ شہریندوں کی ہنگامہ آرائی سے ممکن ہے آپ کو دشواری پیش آئے۔“ گارڈ نے حفاظا تقدیم کے تحت اسے خبردار کیا تھا۔ جواباً عبدالباطن نے خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ کہنے کے دوران اسے دھماکے سے کار کا بوٹ کرنے کی آواز سنائی دی۔ پھر مشتعل لڑکوں نے ڈنڈوں سے کار کا اگلا حصہ تباہ کر دیا۔ وڈ اسکریں بھی ایک ہی جھٹکے میں چٹکانا چور ہو چکی تھی۔

”بکواس بند کرو۔ ڈیلیوری ہوئی ہے تو کیا ہم ابو سعید کی شہادت کے صدمے کو فراموش کر کے بیٹھ جائیں؟ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ جب تک قاتلوں کو گرفتار کر کے پھانسی نہیں چڑھا دیا جائے گا۔ ہم جین سے نہیں مینیں گے۔ ہر گاڑی کو آگ میں جھونک دیں گے۔“ دوسرے کارکن لڑکے نے آگ بگولہ ہو کر عبدالباہن سے کہا۔

یہ وہ لمحہ تھا جب عبدالباہن سمیت تمام مشتعل افراد اسماء کی بیچنی چلائی پکار پر متوجہ ہوئے تھے۔ وہ کار کی توڑ پھوڑ کے دوران حواس باختہ ہو کر باہر نکلی تھی۔ اسماء خوف و دہشت سے شوہر کو زور و کوب ہوتا دیکھ رہی تھی۔ اسے نومولود محمد بلال کا مطلق ہوش نہ تھا جسے اس نے بدعوا سی میں کار کی سیٹ پر لٹا دیا تھا۔ ادھر عبدالباہن کی مزاحمت پر غضب ناک سے زباڑتے کارکن نے مار پیٹ شروع کر دی تھی۔

یہ دیکھ کر اسماء تڑپ گئی اور تیزی سے شوہر کو بچانے کے لیے آگے بڑھی۔

”میرے شوہر کو چھوڑ دو۔ انہیں کیوں مار رہے ہو؟ آخر ہمارا قصور کیا ہے؟“

اسماء دہائیاں دیتی اور بین کرتی ہوئی عبدالباہن کو مشتعل نوجوانوں سے چھڑانے کی ٹیگ دو د کرنے لگی۔ اس لمحے گروہ کے سرغنڈی سفاک آواز گونجی۔

”اس گاڑی کو آگ لگا دو تا کہ دوسرے لوگ باہر نکلنے کی جرأت نہ کریں۔“ اس کے بعد بے بس بیوی کی نظروں کے سامنے کار میں آنا فانا آگ بھڑک اٹھی۔ اسماء پچھلی سیٹ پر لیٹے محمد بلال کو چیخ چیخ کر پکارتی رہی

نکلتا وحشتانہ انداز میں اس کی جانب سرعت سے بڑھ رہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی اسماء ان نوجوانوں سے بے خبر تھی۔ جب کہ بوٹ کے قریب کھڑے عبدالباہن کے قدم اپنی جگہ ٹھنک گئے تھے۔ جس کا اسے ڈر تھا۔ وہ احتیاط کے باوجود سانسے آ گیا تھا۔

اسود کے نوجوان لڑکے وحشتانہ انداز میں بھرتے ہوئے تیزی سے گاڑی کی جانب لپک رہے تھے۔ ان میں بعض نے الاؤ اٹھا رکھے تھے۔ جنہیں دیکھ کر عبدالباہن کی آنکھوں میں تشویش عود کر آئی تھی۔ اسے مشتعل لڑکوں سے نہایت خندہ پیشانی سے بات کرنی تھی۔ مہوا وہ غم و غصے سے گاڑی کو جلانے کی کوشش کریں۔ کچھ دیر میں لڑکوں نے کار کو گھیر لیا۔ چنگاریاں اڑانی آگ سے سڑک کے اطراف میں دونوں طرف اور سگت اجالا کھڑ گیا۔

”کیا تم جانتے نہیں ہو کہ ابو سعید کی شہادت کے بعد مکمل سپریم جام کر دیا گیا؟“ ایک جوان شخص جوشید اس گروہ کا سرغنڈہ تھا عبدالباہن کو گریبان سے کھینچتے ہوئے دباڑا پھر اس نے بوٹ سے پرے کرتے ہوئے عبدالباہن کو ایک جانب دھکیلا۔

”کڑو میری بات سنو!“ عبدالباہن نے مدافعت لہجے میں پلٹتے ہوئے چیخ کر کہا۔

”اب سننے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟ ایک ہے اور حب وطن رہنما کو سازش کر کے بیہما نہ طریقے سے قتل کر دیا گیا لیکن ہم لوگوں کو پروا نہیں شرم و غیرت ختم ہو گئی ہے ہماری۔“ ایک اور کارکن جس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا عبدالباہن کو عقب سے پکڑے ہوئے نفرت سے بولا۔

جواباً عبدالباہن نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”دراصل میری بیوی کی آج ہی ڈیلیوری ہوئی ہے اور اس وقت ہم اسپتال سے گھر جا رہے ہیں۔“

اسماء نے تائیدی انداز میں ہلکے سے سر کو جنبش دی۔

چند منٹوں تک گاڑی سرسیمہ اور مہیب ہوا کے جھونکوں سے کمراتی آگے بڑھتی رہی۔ لنک روڈ جو مرکزی شاہراہ تک متصل تھا۔ سوٹ پہلے بائیں طرف ایک چھوٹی سڑک ان کے قصبہ عمن آباد کو مڑتی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی اس موڑ سے ابھی کچھ فاصلے پر تھے کہ دفعتاً گاڑی زور شوراً واز سے چلتے چلتے رگ گئی۔

”کیا ہوا عبدالباہن؟“ اسماء نے اچانک کار کے رکنے پر حیرت و خوف سے پوچھا۔

”شاید انجن میں کوئی خرابی ہوئی ہے۔“ عبدالباہن نے چابی انٹیشن میں گھماتے ہوئے قدرے متذبذب سے جواب دیا۔

اس نے دو طرفہ چھائی نیم تاریکی میں مکانوں اور درختوں کے سایوں کو گھورتے ہوئے دیکھا۔ خاموش ماحول کی ہولناکی اسے احساس دلای تھی کہ اسود کے کارکنوں کے احتجاجی رد عمل سے روڈ کے قریب وجہ کی آبادی بھی متاثر ہوئی تھی۔ سرسیمہ ہوا میں احتیاط برتنے کی غرض سے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

ادھر اسماء کی آنکھوں میں بھی اندیشے لہرا رہے تھے۔ عبدالباہن نے پراعتاد لہجے میں بیوی سے کہا۔ ”محمد بلال کا خیال رکھنا۔ کہیں ڈر کے رونے نہ لگ جائے۔ میں گاڑی کا انجن دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر عبدالباہن نے دروازہ کھولا اور کار سے باہر نکلا پھر وہ کار کے سامنے آ گیا۔ ابھی وہ بوٹ اٹھا کر انجن کو چیک کر رہا تھا کہ اچانک مخالف سمت سے نیم تاریکی میں غم و غصے سے بھرتا اور لٹکاتا شور سے سنائی دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ نفرت آمیز اور مشتعل جذبوں سے چیختے چلاتے نوجوانوں کا ایک گروہ اس کی گاڑی پر ٹوٹ پڑنے کے لیے مکانوں اور درختوں کی اوٹ سے

عبدالباہن اگرچہ خود بھی اسود کا ایک ہمدرد اور عام کارکن تھا اور ابو سعید سے گہری عقیدت اور نیاز مندی کے جذبات رکھتا تھا۔ لیکن اپنے سن پسند لیڈر کے قتل پر غم و غصے سے بھرتے تند و تیز جذبات میں لوگوں کو اپنے یا غیر کی تفریق کا احساس نہیں رہتا۔ مشتعل احتجاج میں آنا فانا سب کچھ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ پر خلوص چاہنے والوں کی نفرت انگیزی سے ہمدرد بھی تکلیف اور اذیت ناک سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے عبدالباہن کو بھی یہ خدشہ لاحق تھا تاہم وہ محتاط انداز میں کار کو آگے بھگاتے جا رہا تھا۔

مبادا مشتعل افراد سے اس کی مدد بھیڑ ہو۔ متبادل سڑک سے موڑ لیتے ہوئے اس نے چند گہرے سانس لیے۔ یہ ایک لنک روڈ تھا جو مرکزی شاہراہ تک جاتا تھا۔ عبدالباہن نے فوراً کیا یہاں سڑک پر قدرے روشنی تھی۔ جو کنارے پر موجود بعض بجلی کے پلڑے کے راستا دکھاتے ققموں کی بدولت تھی۔ اطراف میں کہیں کہیں مکانات کے ساتھ کھلیاں کا سبزہ اور لہلہاتی فصلیں نظر آ رہی تھیں۔ البتہ تریفک نہ ہونے کی وجہ سے دور تک ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے گاڑی کی رفتار کو قدرے متوازن کیا تا کہ ذہنی تناؤ کچھ کم ہو۔ پیچھے موجود اسماء نے بھی خوف کم ہونے پر دم لیا تھا۔

”میری ناقص ضد کی وجہ سے آپ پریشان ہوئے۔ اگر میں ڈسپارچ کے لیے اصرار نہ کرتی تو اچھا ہوتا۔ ان حالات میں باہر نکلتا بےوقوفی ہی تو ہے۔“ اپنی مرضی سے انسان کچھ نہیں کرتا۔ خدا جو کرتا ہے بندے کی بھلائی کے لیے مہیا ہے۔ ممکن ہے تمہاری ضد میں خدا کی کوئی مصلحت چھپی ہو۔“ عبدالباہن نے جواباً کہا۔

اور خراگارش کھا کر سڑک پر گر پڑی۔

عبدالباطن دل گرفتہ اور مضروب حالت میں اسماء کو سنبھالنے کی غرض سے آگے بڑھا۔ لیکن ادھر اسماء صدے سے بے ہوش ہو چکی تھی۔

جلتی کار سے پلٹتے شعلوں کو دیکھ کر عبدالباطن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ اللہ نے آج اسے اولاد دینے سے نوازا تھا اور محض چند گھنٹوں میں ہی اپنی امانت کو واپس لے لیا تھا۔ مشتعل نوجوانوں کا گردہ پر جوش نعرے لگاتے اور ابو سعید کے قاتلوں کو لکارتا ہوا واپس لنک روڈ کے قریبی مضافاتی علاقے کی جانب بڑھ گیا۔

پانچ برس بعد کی بات ہے۔

اسماء استور کی صفائی میں مصروف تھی۔ اس وقت وال کلاک میں دو پہر کا ایک بج رہا تھا۔ عبدالباطن ابھی آفس سے گھر نہیں لوٹا تھا۔ دفعتاً استور سے دائیں طرف بند دروازے سے ایک معصوم بسورتی آواز اسماء کو سنائی دینے لگی۔

”انی انی..... دروازہ کھولے نا! مجھے شوشو لگا ہے۔“ اس بچے کو اسماء نے کمرے میں کچھ دیر پہلے بند کیا تھا۔ یہ اس کا بیٹا کی تھا جو ماں کی بے توجہی کی وجہ سے ضدی اور خود مر ہو گیا تھا۔ کئی آج اسکول بھی نہیں گیا تھا اور اپنی شریر عادتوں کی وجہ سے اسماء کو پریشان کرتا رہا تھا۔ اس نے آخر تک آ کر کئی کو کمرے میں چھوڑا اور باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

”چپ ہو کر کمرے میں رہو۔ میں ابھی دروازہ نہیں کھولوں گی۔“ اسماء رضائیوں کو جھڑتے ہوئے بند دروازے کی جانب منہ کر کے بولی۔ ”تم روز بروز گڑے جارہے ہو کئی اسکول سے چھٹی اس لیے کی تھی کہ مجھے پریشان کروا!“ اسماء اپنی جگہ کھڑی بیٹے سے

بولی تھی۔

دوسری طرف دروازے کے پیچھے سے کئی کی روتی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”آپ دروازہ نہیں کھولیں گی تو میں شوشو سے کمر ا گندرا کروں گا!“ کئی نے جواباً سرکش لہجے میں کہا۔ اسماء جو استور کی صفائی کی طرف متوجہ تھی بیٹے کی نا ظنی محسوس کرتی ہوئی تند و تیز انداز میں کمرے کی جانب بڑھی۔

”تھک رہی ہو تم پٹائی کے بنا نہیں مانو گے کئی!“ یہ کہتے ہوئے اسماء نے دھڑ سے دروازہ کھولا۔

”ادھر ماں کے غصے سے کئی کا تیکر گیا ہو گیا اور ساتھ ہی کار پیٹ بھی تر ہو گیا تھا۔ اسماء نے معصوم بچے کا لحاظ کیے بغیر اسے دو تھپتھپے رسید کر دیے۔

”لعنتی! بد بخت! ماں سے ضد کرتے ہو اس کا کہنا نہیں مانتے ہو۔“ اسماء روتے ہوئے چھ برس کے کئی پر گرے گی۔ اس کا انداز سوتیلی ماں جیسا تھا۔

”چلو اب جاؤ غسل خانے میں..... صبح سے ناک میں دم کر رکھا ہے شیطان نے.....“ اسماء نے جھٹکے سے کئی کو پرے ہٹایا۔ پھر اس نے کار پیٹ کے ناپاک حصے کو عارضی طور پر سمیٹ دیا۔

عین اسی لمحے کال بیل کی مخصوص آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی کچھ دیر میں دروازہ کھولنے پر عبدالباطن گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے بریف کیس میز پر رکھا اور تھکا ماندہ سا براؤڈے میں رکھی کرسی پر بٹھے گیا۔

”لگتا ہے بہت تھک گئے ہو؟ شاید آج آفس میں مصروف دن گزارا ہے۔“ اسماء نے محبت بھری ملاحت سے شوہر سے کہا۔ اس کا انداز دل جوئی والا تھا۔

”نہیں بھئی معمول کی تھکاوٹ ہے۔ تم سناؤ کھانا تیار ہے یا کچھ انتقاد کرواؤ گی۔“ عبدالباطن نے خوش

گوار انداز میں مجسم لہجے میں پوچھا۔

”دیر تو ہے مگر چند منٹ کی۔“ جواباً اسماء نے قدرے نرمی سے کہا۔ پھر وہ اپنائیت سے شوہر کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”آپ منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو جائیے میں تب تک دسترخوان پر کھانا لگاتی ہوں۔“

اسماء کی بات سن کر عبدالباطن نے ٹھیک ہے کہہ کر اثبات میں سر ہلایا۔ اسی لمحے کئی کے رونے کی آواز عبدالباطن کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ غسل خانے سے برآمدے میں آتے ہوئے ہچکیاں بھر رہا تھا۔ اس نے قدرے چونکتے ہوئے بیٹے کو قریب بلایا۔ ادھر اسماء بھی کچن کی طرف جاتے جاتے اس خیال سے رک گئی تھی کہ شوہر سے بیٹے کی خود سری کی شکایت کرے گی۔

عبدالباطن نے مشفقانہ لہجے میں بیٹے سے پوچھا۔ ”کیا ہوا کیوں رو رہے ہو؟“ باپ کے دریافت کرنے پر کئی نے چند لمحے خوف زدہ نظروں سے اسماء کی جانب دیکھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ باپ سے کچھ کہتا اسماء شکایتی لہجے میں بول پڑی۔

”آج اس نالائق کی وجہ سے کتنی پریشان ہوئی ہوں۔ بتائیں سکتی۔ آپ نے اس کی اسکول سے چھٹی کروا کے اچھا نہیں کیا۔ اس کی اچھل کود نے مجھے سکون سے کام کرنے نہیں دیا۔“

بیوی کی بات سن کر عبدالباطن نے کھوجتی نگاہوں سے کئی کے معصوم چہرے کو دیکھا۔ تاہم اسے جیسی ہچکیوں سے لرزتے بیٹے کے چہرے پر معصومیت کے تاثرات دکھائی دیے۔ بیوی کے مبالغے سے عبدالباطن کے تئیر میں دفعتاً سرد مہری عود کر آئی۔ اس نے اسماء کو نظر انداز کرتے ہوئے کئی کو نرمی و شفقت سے چمکاتے ہوئے پوچھا۔

”بیٹا! تم کیوں رو رہے ہو۔ بتاؤ کیا بات ہو گئی

ہے؟“ باپ کے لہجے میں نرمی کے ساتھ قدرے سرزنش بھی تھی تاکہ کئی خوف زدہ ہونے کے بجائے اصل بات کہہ دے۔ جواباً بچے نے اٹکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ابو! میں نے کچھ نہیں کیا۔ امی جھوٹ بولتی ہیں۔ آپ کٹانے سے پہلے جب یہ کام کر رہی تھیں تو انہوں نے مجھے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے میرا شوشو بھی نکل گیا تھا۔“

بیٹے کے اندھے آنسوؤں کو دیکھ کر عبدالباطن کا چہرہ متغیر ہو رہا تھا۔ پھر اس نے غصہ ضبط کرتے ہوئے ناراضی سے اسماء کی جانب دیکھا۔

یہ سچ تھا کہ کئی باپ سے زیادہ مانوس ہے۔ جب کہ ماں ہونے کے باوجود اسماء کا رویہ اس کے لیے عجیب طرح کے بغض و عناد اور روک ٹوک والا تھا۔ اس بارے میں عبدالباطن نے بار بار اسماء کو بیٹے سے نرم اور مشفقانہ سلوک کی ہدایت کی تھی۔ محض اس وجہ سے دونوں کے درمیان کئی دفعہ تند و تیز بحث و تکرار ہوئی تھی۔ آج بھی اسماء نے کئی کے ساتھ سنگ دلائے برتاؤ کیا تھا۔ جس کے باعث عبدالباطن بیوی سے جیسا ہی بد ظنی محسوس کر رہا تھا۔ صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے اس کے چہرے پر اذیت کٹا ٹار تھے۔

ادھر اسماء سے تاویل میں دینے کے لیے پرتول رہی تھی۔ اس لمحے عبدالباطن کو وہ ماضی کی خود پسند شلپا چکرورتی محسوس ہوئی۔ محض ایک غیر اور بے پروا عورت جسے شوہر اور بچے کی پریشانی کا مطلق ہوش نہ تھا۔

آخر عبدالباطن نے سچے لہجے میں بیوی سے کہا۔ ”اسماء! تجھے بیٹے کے ساتھ تمہاری نفرت میرے لیے ناقابل فہم ہے۔ حالانکہ اس کو تکلیف دے کر تم مجھے دکھ پہنچاتی ہو۔ نجانے کب تمہیں اپنے ظالمانہ رویے کا احساس ہوگا؟“ اتنا کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑا

ہوا۔ پھر وہ اسماء کا کوئی جواز سنے بغیر کسی کو ہمراہ لیے اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

شوہر کی پرہیزی سے اسماء کی ساری خوش مزاجی غارت ہو چکی تھی اور وہ بیٹے پر بیچ دتا بکھائی اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

.....●●●.....

دراصل محمد بلال کی حادثاتی موت سے اسماء جس صدمے سے گزری تھی۔ اس نے اسماء کو نفسیاتی طور پر ذہنی مریضہ بنا دیا تھا۔ بھڑکتے شعلوں میں جلتی دہکتی گاڑی کا وہ بھیسا تک اور دل دوز منظر اس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ جس میں اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا تخت جگر جل کر قلعہ اجل بنا تھا۔ وحشت سے لٹکارتے اور چلاتے اسود کے مشتعل غنڈوں کا ٹولہ کار کو آگ لگا تا ہوا اسے جب بھی یاد آتا تو شدید نفرت سے اس کے رگ و پے سیٹکے ٹٹکتے۔ اس کی زخمی متانت قائم مزاجی سے جوش مارنے لگتی۔ اس لمحے اسماء کا دل بے اختیار چاہتا کہ وہ اسود کے کارکنوں کے گھروں کو اور ان کے بچوں کو بھی آگ میں جھونک دے۔

بار بار طاری ہونے والی اس کیفیت نے اسماء کے دل و دماغ پر فحشی اثرات مرتب کیے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس دکھ سے ذہنی مریضہ بن گئی۔ ایک سال بعد جب اس کے یہاں دوسرے بچے کی ولادت ہوئی تو پہونچی کے بیٹے محمد بلال کی یاد سے بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو اُٹھ آئے تھے۔ اس بار عبدالباطن بیوی کی ضد کی وجہ سے زچگی کے لیے لیڈی ڈاکٹر کو گھر ہی لے آیا تھا۔ وہ اسماء کے برعکس دوسرے بیٹے کی پیدائش پر بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ جب اس نے بیوی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو سمجھ گیا کہ اسماء محمد بلال کی یاد سے آشک بار ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ایک برس گزرنے کے باوجود وہ اس

خونچکاں واقعے کو بھلا نہ سکی تھی اور بیٹے کو یاد کر کے رونے لگتی تھی۔ بیوی کو تران و ملال کی تصویر بنے دیکھ کر عبدالباطن نے دیر تک اس کے دکھ کو زائل کرنے کی کوشش کی اور اسے سمجھایا کہ خدا کی مرضی کے سامنے ہر جذبہ بر تعلق اور ہر سعی عاجز و بے بس ہے اس لیے اسے بھی بیٹے کی موت کو بھلا کر اس کی رضا میں راضی ہونا چاہیے اور دوسرے بیٹے کی پیدائش پر اس خالق کائنات کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے دوبارہ انہیں اولاد جیسی نعمت عطا کی تھی اور اپنی قدرت سے ان کے دکھ کا مداوا کر دیا تھا۔

شوہر کی باتوں سے متاثر ہو کر اسماء نے آنسو پونچھے۔ اس کے بعد دونوں معصوم بچے کی طرف متوجہ ہو گئے اور جگہ جگہ ہلکے خوش گوار انداز میں بیٹے کی باتیں کرنے لگے۔

عبدالباطن نے محبت بھرے لہجے میں اسماء سے کہا۔

”اسماء! تم انداز نہیں کر سکتیں کہ بیٹے کی ولادت پر میں کتنا خوش ہوں۔ اللہ نے آج میری بیوی آرزو پوری کر دی ہے۔“ خوشی و مسرت سے دمکتا شوہر کا چہرہ دیکھ کر اسماء نے نا سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

”کیا مطلب، کیسی آرزو؟“

”دراصل اس مرتبہ میں نے سوچ رکھا تھا کہ بیٹا ہوا تو اس کا نام ابو سعید رکھوں گا۔ جو ایک سچے اور عظیم رہنما تھے اور جنہیں شہید کر دیا گیا۔“ عبدالباطن نے جوش و جذبے سے لبریز لہجہ میں کہا۔

اس کی بات سن کر اسماء کے چہرے پر خلاف توقع نا پسندیدگی کے تاثرات عود کر آئے تھے۔ ابو سعید کے نام سے اس کی نگاہوں میں مشتعل نوجوانوں کا چہنچہاٹا آگ کے لاؤ بھراتا وہ گردہ آگیا تھا جنہوں نے اس کے معصوم بچے کی پردا کیے بغیر کار کو آگ لگا دی تھی۔

اسماء جانتی تھی کہ عبدالباطن تنظیم ”اسود“ سے ہمدردی کے جذبات رکھتا تھا اور اس کے راہ نمہ ابو سعید اسود کی کامقصد تھا لیکن محمد بلال کی موت اس کی متا کے لیے دھچکا ثابت ہوئی تھی جو اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس لیے وہ شوہر کے لاکھ سمجھانے پر بھی اسود کے لیے نفرت محسوس کرتی تھی اور اس کے نوجوان کارکنوں سے سخت بدظن تھی۔ اب جب کہ عبدالباطن نے اپنے رہنما کے نام پر بچے کا نام رکھنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ اندرونی پر خاش کی وجہ سے ٹھن اور بے بسی میں مبتلا ہو گئی۔ بیوی کو خاموش دیکھ کر عبدالباطن نے چونک کر پوچھا۔

”کن سوچوں میں کھو گئی ہو؟ کیا تمہیں اچھا نہیں لگا۔“

شوہر کے استفسار پر اسماء سر جھکا کر متعرق تھی۔ ایک بارگی اندرونی کشش سے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے پھر وہ زیادہ دیر تک ضبط نہ رکھ سکی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”میں اس نام سے اپنے بچے کو کبھی نہیں پکاروں گی۔“ محض اتنا کہہ کر اسماء بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

.....●●●.....

دوسرے بیٹے کی پیدائش کے بعد کسی پیچیدگی کے باعث عبدالباطن کے یہاں کوئی اور اوداد پیدا نہ ہوئی۔ لہذا اب بھی میاں بیوی دونوں کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ عبدالباطن کبھی کبھی لاؤ پیار سے اسے کی کے نام سے پکارتا تھا۔ ادھر اسماء اس کے لیے متضاد سوچیں رکھتی تھی۔ اس لیے وہ جیل و جوت سے بچے کا یہی نام لیتی تھی۔ جس کی وجہ سے میاں بیوی کی اختلافی سوچ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کہیں نہاں خانوں میں دبی رو گئی تھی۔

کئی ایک ہونہار اور حساس بچی تھا۔ اسماء کے دو نلے اور ترش رویے کے سبب وہ اپنے شفیق باپ سے رفت رفت قریب اور مانوس ہوتا چلا گیا۔ حالانکہ اس عرصے میں کسی کے ڈر و خوف محسوس کر کے عبدالباطن نے کئی بار اسماء کی متا کو جھجھونے کی کوشش کی۔ اسماء نرم و گرم لہجے میں سمجھاتا کہ اکلوتے بیٹے کے ساتھ نرمی و شفقت سے پیش آئے اور اسے اپنی متا کی ٹھنڈک کا احساس دلانے ایسا نا ہو کہ اس کی عاقبت نا اندیشی کی وجہ سے کسی کسی بیماری یا احس کسرتی کا شکار ہو جائے۔ بندہ کفران نعمت کرنے لگتا ہے۔ تو اللہ اپنی نعمتوں کو واپس لے لیتا ہے۔ کئی کو کھونے کے بعد وہ دونوں تنہا اور بے اولاد ہو گئے تو کیا وہ خوشی سے جی پا کیں گے؟

ادھر اسماء کا حال یہ تھا کہ وہ عبدالباطن کی بار بار نصیحتوں کو ایک کان سے سنتی اور دوسرے کان سے نکال دیتی۔ بیٹے کی موت کے مہمب اثرات اور عبدالباطن کی اسود سے غیر معمولی عقیدت کے باعث وہ گئے بیٹے سے دور ہوتی چلی گئی۔ لاشعور میں پچھی متنت مزاجی اسے بے چین کیے رہتی۔ وہ شوہر کی عدم موجودی میں کئی کو بات بے بات جھڑک دیتی اور معصوم بچے کے ساتھ سوتیلی ماں کی مانند جیش آتی۔

آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ کئی نے باپ سے ضد کر کے اسکول سے چھٹی کی تھی۔ اسماء کے لیے ذہنی پر خاش نکالنے کا یہ اچھا موقع تھا۔ خلیل میں مشغول بنتا مسکراتا کی جب اسے ایک آنکھ نہ بچا تو بری طرح جھڑکتے ہوئے اسے زبردستی لے جا کر کمرے میں بند کر دیا۔ نفرت آلود جنون میں اسے شوہر کی ناراضی کا بھی ہوش نہ رہا تھا۔

عبدالباطن اور اسماء کے متضاد رویوں میں رہتے ہوئے کئی زیادہ تر اداس اور چپ چاپ رہنے لگا تھا۔ وہ دوسری جماعت کا ہونہار طالب علم تھا۔ ان گزشتہ پانچ

برسوں میں ابوسعید کی شہادت نے ارباب اختیار پر منفی اثرات مرتب کیے تھے۔ ان کے احباب و رفقاء کی کوششوں سے ملک میں انقلاب برپا ہو گیا تھا۔ بعد میں تنظیم اسود نے ایکشن میں وضع عوامی حمایت سے کامیابی حاصل کی اور مسند اقتدار پر براہیمان ہو گئی۔ اس طرح سے عوامی لیڈر ابوسعید کی بیس سالہ جدوجہد رنگ لائی اور مملکت خدا واد کا طول و عرض امن اور آشتی کا گہوارہ بن گیا۔

عبدالباہن بھی ”اسود“ کے کارکنوں اور ہمدردوں کی طرح اس فتح و کامرانی پر خوشی اور تشکر آمیز جذبات کو دل سے محسوس کرتا رہا تھا۔ اپنے مرشد و مربی ابوسعید کی ابو رنگ قربانیوں کو یاد کر کے اس کا چہرہ اشک رواں سے تر ہو گیا تھا۔

ایک سہ پہر عبدالباہن اسٹری روم میں بک شیلٹ میں رکھی کتابوں کی جانچ پڑتال کر رہا تھا۔ معا ایک سنہری جلد والی کتاب کے سرورق پر نگاہ پڑتے ہی اس کے چہرے پر غم ناک بسم عود کرا آیا۔ اس کتاب کا عنوان ”اسودی“ تھا۔ یہ انقلابی و عظیم لیڈر ابوسعید کی سوانح حیات تھی۔ پھر عبدالباہن بانی کام چھوڑ کر کتاب کی ورق گردانی میں مشغول ہو گیا۔ اس کی یہ کیفیت اپنے لیڈر سے جذباتی وابستگی کا مظہر تھی۔ اسی اثناء میں اچانک عبدالباہن کی نظر دوسرے باب کے اس متن آلود صفحے پر پڑی۔ جسے کسی نے چھڑا کر مزی تزی حالت میں رکھ چھوڑا تھا۔ یہ بات اس کے دل پر چوٹ کے مصداق تھی۔ اسماء کے خیال سے عبدالباہن کے ہونٹ تلخ روی سے بھینچ گئے اور سخت ناراضی کے احساس سے اس کے تیور بگڑنے لگے۔ اسماء اختلافی جنون میں ایسی گھٹیا حرکت بھی کر سکتی ہے۔ یہ اس کے سامان و گمان میں بھی نہ تھا۔ پھر اسے اپنی پشت پر آہٹ

محسوس ہوئی۔

اسماء چائے لیے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ شوہر کے نزدیک پہنچ کر اس نے چائے کا گنگ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بک شیلٹ کی صفائی کے لیے مجھے کہہ دیا ہوتا۔ آپ کو تو خود کو تھکانے کا بہانہ چاہیے بس۔“

یہ کہتے ہوئے جب اس نے عبدالباہن کی جانب دیکھا تو اپنی جگہ ٹھٹک گئی۔

ادھر عبدالباہن تند و نالاں جذبات کو بہ مشکل ضبط کیے ہوئے تھا۔ اس نے چائے کا گنگ میز پر رکھا اور بیوی کی خوش گفتاری کو نظر انداز کرتے ہوئے کتاب کے پھنے دست برد کیے صفحے کو اسماء کے سامنے کر دیا۔ اس کی سوالیہ نظروں میں خاصی ناراضی تھی۔

”تم نے یہ ذلیل حرکت کیوں کی ہے اسماء!“

شوہر کے استفسار پر اسماء فحالت میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے چند لمحے سوچا۔ اس کے لیے اپنے جذبات کو اظہار کا یہ موقع اچھا تھا۔ اس نے دل جلے انداز میں جوابا کہا۔

”ایسی معمولی بات پر آپ کو ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تو ایک عام ہی کتاب کا حقیر صفحہ ہے۔ یہاں لوگ اپنے مفاد کی خاطر معصوم بچوں کو آگ میں جھونک دیتے ہیں لیکن فراموش کر دیے جاتے ہیں۔“

”بکو اس مت کرو اسماء! ابوسعید کوئی عام آدمی نہیں تھے بلکہ اپنی بے لوث قیادت کی وجہ سے لاکھوں دلوں میں دھڑکتے تھے۔ ان کی شہادت اسود کے کارکنوں کے لیے بڑا دھچکا تھا۔ ان کے مشتعل جذبات فطری رد عمل تھا۔ جس میں غیروں اور اپنوں سبھی نے جانی و مالی نقصان اٹھایا لیکن تم نے اس بات کو سمجھنے کے بجائے انتقامی سوچ کو دل میں جگہ دی۔“ عبدالباہن نے برہم ہوتے ہوئے بیوی کو یاد کروایا۔

”گودا جرنے پر ماں جس دکھ و صدمے سے گزرتی ہے آپ سمجھ نہیں سکتے عبدالباہن پانچ برس گزر جانے کے باوجود وہ آگ کے شعلے اور وہ بھیاں تک منظر آج بھی میری نظروں کے آگے آتا ہے تو میری متاثرہ اپنی ہے۔“ اسماء نے نفرت آلود لہجے میں کہا۔

”اور ایک سچے قائد کی کیا قدر و منزلت ہوتی ہے اس کا تمہیں ادراک نہیں ہے۔“

عبدالباہن نے مدلل انداز میں اسماء کی جانب دیکھا۔ اس کے تکیے لب و لہجے میں بلا کا اعتماد جھلک رہا تھا۔ اس کے سامنے مبتلا ماری ایک عورت قنوطیت کی کیفیت میں نظر آ رہی تھی۔

تم شخص ایک دن کے بچے کی موت پر غش کھا کر بے ہوش ہو گئی تھیں لیکن ابوسعید جنہیں بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ وہ سیکڑوں نوجوانوں کے لیے ماں باپ سے بڑھ کر تھے۔ ان کے خون ناحق سے ان کے دلوں پر ایک قیامت گزر گئی تھی۔ اس کے مقابلے میں تمہاری امیلی متا کی کیا وقعت ہے؟ کچھ بھی نہیں اسماء بی بی!“

اتنا کہہ کر عبدالباہن نے چند گہرے سانس لیے۔ پھر حتمی اور دو ٹوک لہجے میں بیوی سے بولا۔

”انتقامی اور گمراہ کن سوچوں سے اپنے دل و ذہن کو آزاد کرو اور میری دلچسپیوں پر اختلاف کرنے کے بجائے گھر گرہ سستی کے تقاضوں کو سمجھو۔ اسی میں تمہارے لیے بھلائی ہے۔“ یہ کہہ کر عبدالباہن چائے پیئے بغیر اسٹری روم سے باہر نکل گیا۔

انقلابی لیڈر ابوسعید کی چھٹی بری پورے جوش و جذبے اور عقیدت سے منائی جا رہی تھی۔ اگرچہ یہ معمول کا ورنگ ڈے تھا لیکن اس کے باوجود عام لوگ اپنے جذبات کے اظہار کی غرض سے تیار یوں میں سرگرم دکھائی دیتے تھے۔ مکانوں کی عمارتوں اور

راستوں پر ابوسعید کی قدآور تصاویر و پزائیاں تھیں۔ بری کو پروقار طریقے سے منانے کے لیے تنظیم اسود کے رضا کار اور کارکن شہر کے گلی کوچوں اور چورنگیوں پر پوسٹرز پینرز لگانے اور ریلیوں و جلسے و گیمما بھی میں مصروف تھے۔ الغرض دن کے آغاز سے ہی پورے شہر میں ابوسعید کے لیے خراج عقیدت کے پیغامات گونجنے لگے تھے۔ یہ ایک سو گوار دن تھا۔ اس حوالے سے سرکاری دفاتر اور تقابلی اداروں میں بھی عظیم رہنما کے لیے تعزیتی پروگرام رکھے گئے تھے۔

اسودے دلی وابستگی کی وجہ سے یہ دن عبدالباہن کے گھرانے کے لیے خاص دن تھا۔ ادھر اسماء تنہا جذبات میں گھری اڑوس پڑوس اور محلے میں ہونے والی ہنگامہ خیزی اور ان سرگرمیوں کو دیکھ کر جلن کڑھن میں مبتلا تھی۔ لوگوں کے نعرے اس کی سماعتوں سے ٹکراتے اسے بے چین کیے دے رہے تھے۔ یہ صبح کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ عبدالباہن یہ کہہ کر صبح کی آفس چلا گیا تھا کہ وہ تعزیتی پروگرام کے باعث دیر سے لوٹے گا۔ آج کی بھی اسکول جانے میں ضد نہیں کی تھی۔ اس کے اسکول میں بھی ایک تعزیتی کلاس تھی۔ جس میں انقلابی لیڈر کی جدوجہد سے بچوں کو آگاہ کیا جانا تھا۔ اسماء ہالکونی میں کھڑی کچھ دیر تک نوجوانوں کے جوشیلے نعرے سنتی رہی۔ پھر وہ نخت سے منہ بگاڑتی کمرے میں پلٹ آئی۔ اس نے ایک طرف چلتے ہی دی کی اسکرین پر نگاہ ڈالی۔ اس وقت ابو سعید کے بارے میں سرکاری دفعتی اداروں کی جانب سے تعزیتی پیغامات کے ٹیپ دکھائے جا رہے تھے۔ اس نے بے زار کن انداز میں چینل بدلا اور ایک کامیڈی شو لگا دیا۔ کچھ دیر بعد خوش گوار موڈ میں اسماء نے دی کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ ہلکے ہلکے لوازمات کے ساتھ چائے کے گھونٹ لے رہی تھی اور پروگرام سے

مظلوم بورہی تھی۔ اسی دوران اچانک اس کے سامنے
نیوی شوٹیں قتل پیدا ہوا تو نگارنی سے اس کا منہ کرکرا
ہو گیا۔ پھر کوئی دس منٹ کا بربیک نیوز ہوا تھا اور خلاف
توقع اس کے چہرے پر اچانک خوف سے دہشت کھنڈ
گئی تھی۔ اسے مطلق ہوش نہ تھا کہ چائے کا گگ اس
کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر رہا تھا اور چپکنا چور ہو گیا تھا۔ وہ تو
بچنی بچنی آنکھوں سے نیوی پر دی جانے والی اس
روح فرساز کن رہی تھی جو اس کے اکلوتے بیٹے کے
اسکول سے متعلق تھی۔ اسکول کے نام کی گونج سے اس
کے دل میں ہول اٹھے محسوس ہو رہے تھے۔ ادھر نیوی
پر خاتون نیوز کا سنہ خوفناک خبر سن رہی تھی۔ جس کے
مطابق کوئی گھنٹہ بھر پہلے جرم پیش ایک مسئلہ نے
اسے گھٹاؤنے مقاصد کے تحت اسکول کی عمارت پر
قبضہ کر لیا تھا۔ پریس سمیت نیچر اور اسٹاف کو انہوں
نے نرنے میں لے رکھا تھا اور معصوم بچوں کو ان کی
کلاسوں میں قید کر دیا تھا۔

اسماء دہشت زدہ نظروں سے نیوی پر دکھائی جانے
والی اسکول کی عمارت کو کھوج رہی تھی۔ اسکول کا طویل
عرض سمت کے سناٹے میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔ کیمبرہ
میں کمال ہوشیاری سے اندرونی مناظر بھی اجاگر کر رہا
تھا۔ ان میں کہیں کہیں آڑیں چھپے نقاب پوش ہندو
اٹھائے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سب جان کر آج
ماں کی متا بیٹے کی محبت سے دیے ہی تڑپ اٹھی تھی۔
جیسے پانچ برس پہلے پہلو بھی کی محمد بلال کے لیے بے
قرار ہوئی تھی۔ وہ بے اختیاری کی کیفیت میں اسکول
کے اندر باہر کی کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بے چین تھی
کہ اس کا لخت بھر خیریت سے تو ہے۔ شخص پانچ سالہ
معصوم بچی کے خیال سے اس پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔
بریک نیوز ختم ہوا تو شدت جذبات سے اس کے منہ
سے نکلا۔

”اللہ پاک! میرے بچے کو خیر و عافیت سے رکھنا۔
کہیں اس کو کچھ نہ ہو جائے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کانپ
رہی تھی۔

اب اسماء کو اپنی غلط سوچ اور بدسلوکی کا احساس ہو
رہا تھا۔ مٹی کی پیدائش کے بعد سے اس نے بھی اس
کے ساتھ نرمی و محبت کا برتاؤ نہیں کیا تھا۔ اسے دل سے
پیار نہیں کیا تھا۔ آج جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا
تھا تو مٹی دوسرے بچوں کے ساتھ ظالم اور سفاک
بھرموں کی قید میں تھا اور اس کی جان کو خطرہ تھا۔
بچہ تلوں سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”میرے گناہوں کو معاف کر دے خدا! میں نے
ایک ماں ہونے کا حق بھی ادا نہ کیا اور اپنی انتقامی
سوچوں سے شوہر کے دل کو دکھ بھی پہنچایا۔ مجھ سے
بڑی بھول ہوئی ہے میرے اللہ! تو مجھے معاف
کر دے۔“

اسماء روتے اور تڑپتے ہوئے ندامت سے سر
جھکائے اعتراف کر رہی تھی۔ وہ اکلوتے بیٹے کی سلامتی
کی دعا کی بھی مانگ رہی تھی۔ ماضی کی تپا چکرورنی
جو مذہبی تعصب کی وجہ سے بار بار اس کے اندر جھانکتی
تھی۔ شوہر اور بچے کی دلچسپیوں میں تفرقہ و ہوندتی
تھی۔ آج واقعہ امری تھی۔ اسے عبدالباہن کے الفاظ
یاد آ رہے تھے۔

”مٹی کو کھودینے کے بعد کیا وہ دونوں خوشی سے جی
پائیں گے؟“

زندگی بھر کے لیے بے اولاد ہونے کا خوف اسماء کی
ممتا کو ہولائے دے رہا تھا۔ اگلے لمحے وہ عبدالباہن کو
بیٹے سے متعلق ساری صورت حال سے آگاہ کرنے کی
غرض سے ٹیلی فون کی جانب بڑھتی۔

گی کی بازیابی کے انتظار میں اسماء دن بھر روتی رہی

تھی۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھیں دیران اور خشک ہوئی
تھیں۔ ادھر شام ہو چکی تھی لیکن اکلوتے بیٹے کی اسے
اب تک کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ اس نے صبح میں شوہر سے
فون پر بات کی تھی اور مٹی کے بارے میں اپنی فکر مندی
سے آگاہ کیا تھا۔ جواباً عبدالباہن نے اسے تسلی دیتے
ہوئے کہا تھا کہ وہ حوصلہ رکھے۔ مٹی سمیت تمام بچوں کو
جلد از جلد دہشت گردوں سے ربا کر لیا جائے گا۔ ابو
سعید کی بری کے دن یہ ملک دشمن عناصر کی گہری
سازش ہے جسے کانڈویونٹ ناکام بنا دے گا۔ آخر میں
عبدالباہن نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا تھا
کہ وہ آفس سے پھٹی کر کے اسکول کی جانب روانہ ہو
رہا ہے۔ اس لیے وہ زیادہ پریشان نہ ہو اور اللہ پر بھروسہ
رکھے پھر رابطہ منقطع ہو گیا اور اسماء اللہ کے حضور سجدہ ریز
ہونے کے خیال سے وضو کرنے کے لیے اٹھ گئی تھی۔

عصر کی نماز کے بعد اسماء غم سے نڈھال ہو چکی تھی۔
اس کی زبان کی خیر و عافیت کی دعا کی مانگ مانگ
کر تھک چکی تھی۔ وہ حزن و ملال سے آواز زاری کرتی
ہو جھل قدموں سے نیوی کے قریب آئی کہ نیوز چینل
سے اغوا کیے گئے بچوں کی کوئی خبر جان سکے کہ اچانک
اسے باہر سے کارکن کی آواز سنائی دی۔ کچھ دیر میں
جب کال ٹیل کی گونج اس کے کانوں سے ٹکرائی تو بے
اختیار اس کی ممتا بھری آنکھوں میں امید کے جگنو جگا
اٹھے اگلے لمحے اس کے قدموں میں بجلی لپک گئی۔
خلعت بھرے انداز میں بھاگ کر گئی اور جھٹ دروازہ
کھول دیا۔

اس کے سامنے عبدالباہن بے تاثر چہرہ لیے کھڑا
تھا اور خلاف توقع مٹی بھی اس کے ساتھ نہ تھا کسی اتھوٹی
کے خوف سے اسماء کے ہوش اڑ گئے۔ عبدالباہن پر
سوچ قدموں سے اندر داخل ہوا تو اسماء اس کے پیچھے
لپکتی بے قراری سے بولی۔

”میرا بچہ کہاں ہے؟ تم مٹی کو ساتھ کیوں نہیں
لائے؟“ وہ دکھ سے بھرائی آواز میں شوہر سے پوچھ رہی
تھی اور صدے سے کانپ رہی تھی۔ پھر لکھ بھر کھڑ
رہے ہوئے لکھ میں بولی۔

”مجھے معاف کر دو عبدالباہن! نا سمجھی میں مجھ سے
بڑی غلطی ہوئی ہے۔ میں نے گئے بیٹے کے ساتھ برا
سلوک روا رکھا، سبکی ماں ہونے کے باوجود اس پر ظلم کیا
اور آپ کا دل بھی دکھایا مجھے معاف کر دیں۔“ اسماء
ندامت سے کہتی آتھوٹوں سے رونے لگی تھی۔ اس کی
شرم ساری دیکھ کر عبدالباہن کے چہرے پر اطمینان و در
گیا۔ اس نے پرسکون انداز میں سانس لیا اور نرم روی
سے بولا۔

”شکر ہے تمہیں اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا۔ دل
پر جب تک چوٹ نہیں پڑتی ہے انسان کو اپنے ظلم و
زیادتی کا احساس نہیں ہوتا۔“

اتنا کہہ کر عبدالباہن نے دروازے کی جانب پلٹ
کر باہر ایک طرف موجود ”اسوڈ“ کے کمانڈویونٹ کے
دو سپاہیوں کو آواز دی۔

”کمانڈوز! بچے کو اندر لے آؤ!“

اسماء نے تڑپ کر دروازے کی سمت دیکھا۔ اس
کے جگر کا گوشہ اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا
تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ اکلوتے بیٹے کو اس کے اصل نام
سے پکارا۔

”ابو سعید! میرے لعل!“ اس نے بے اختیار
بانہیں پھیلا دی تھیں۔ اگلے لمحے بچہ مسکرا کر دوڑتا ہوا
اس کی آغوش میں آ گیا۔





برادریم عمران احمد
السلام علیکم

امید ہے آپ مع استغاثہ بھارت ہوں گے کسی بھی مہذب معاشرہ میں عورت کو خاندان کی عزت اور غیرت قرار دیا تھا کیونکہ وہ شہل کو آگے بڑھاتی ہے اور اس کی گونہ اولاد کی بیٹی درس گاہ کہلاتی ہے۔ کیا جاتا ہے کہ اگر ایک مرد بگڑتا ہے تو صرف وہی عذاب ہوتا ہے لیکن اگر کرسی عورت غلط قدم اٹھالے تو اس کا حصارہ آنے والی پوری شہل کو اٹھانا پڑتا ہے۔ زیر نظر کہانی بھی ایک ایسی عورت کی ہے جس نے اپنی محبت کی خاطر اپنے گھر کی پہلیوں کو بھلائی تھا۔

لہذا ہے یہ حضور محبت میں اندھی ہوجانے والی بہت سی بیٹیوں کی چشم کشائی کرے گی۔

والسلام
ظاہرہ جنیں تارا
لاہور

وہ تینوں نفوس خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔ وہ سوچوں میں غلطیاں بھی باپ کی شکل دیکھتی تو بھی ماں کی۔ اتوار کے دن ہی تو وہ تینوں دوپہر میں اکٹھے ہوتے تھے۔

میں کیسے کہوں..... کیسے آئینہ دکھاؤں..... چار سالوں میں میرے ذہن ناموس کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ زندگی وہاں جان بن گئی ہے مگر اب میں یہاں مزید نہیں رہ سکتی۔ اگر ایک دن بھی رہی تو میرا دم گھٹ جائے گا اور میں اپنے باپ کی طرح دھوکا فریب اور جھوٹ بول کر تو نہیں جاؤں گی۔ بچ! ہاں بچ ہی بولنا ہوگا۔ مگر میرے اندر ہمت کیوں نہیں ہو رہی؟ شاید میں اپنی ماں کی طرح بے حیا اور باپ کی طرح بے غیرت نہیں ہوں..... لیکن لوگوں کی باتیں اور خجارت بھری نظریں.....؟ نہیں! میں اب برواشت نہیں کر سکتی۔ مجھے یہاں سے جانا ہی ہوگا۔

”چپا! آپ میری شادی کر دیں ورنہ میں.....“ اس نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

”کیا بکواس کر رہی ہو؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی.....“

باپ کے سامنے یہ بات کہنے کی..... اپنی عمر دیکھو اور.....“ غصے سے آٹم کی رنگیں پھولنے لگیں۔

”شادی کا عمر سے کیا تعلق ہے؟ میں اٹھارہ سال کی ہو چکی ہوں اور مجھے اسی وقت کا انتظار تھا۔ میں عاقل و بالغ ہوں۔ اپنے لیے زندگی کا فیصلہ خود کر سکتی ہوں اور میں نے تو جیون سا بھی بھی تلاش کر لیا ہے۔

”ایو! میرا کلاس فیلو! آپ اور ماما سے جانتے تو ہیں۔“

”کیا! ایک غیر مسلم؟ آئندہ تم نے یہ خرافات بکس تو میں تمہاری زبان کاٹ دوں گا۔ نادو! تم نے یہ تربیت کی ہے اس کی؟ ماں کی گود پہلی درس گاہ ہوتی ہے تم نے یہ درس دیا ہے اسے.....؟“

”آٹا! ہاں! جسے آپ میری ماں کہہ رہے ہیں اس نے تو خود اپنی ماں کی گود سے یہی درس لیا تھا۔ لہذا مجھے بھی اپنی گود سے یہی درس منتقل کیا ہے۔ چپا! ایک مثال دینی جانی ہے کہ جیسی مانی ویسی بیٹی اور پھر نوای! یہ سلسلے تو نسل در نسل چلتے ہیں بھلا گھر سے بھاگ کر آنے والی لڑکی یا کوٹھے سے جانے والی لڑکی بھی ماں بن سکتی ہے؟“

”یہ..... تم کیسی باتیں کر رہی ہو عاشری!“ نادو نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

”آئینہ دکھا رہی ہوں آپ دونوں کو..... چار سالوں سے میں رات بھر جاگ کر تجزیہ کرتی رہی ہوں کہ میں طوائف کی بیٹی ہوں یا گھر کی دلیلیز پار کر کے آنے والی کی مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آتا۔ چپا! آپ کی بیٹی وقت نماز اور روزہ اور ماں کی یہ پردہ پوشی مجھے شریف اور باحیا لڑکی کا مقام نہیں دے سکتی۔ یہ محلہ والے اسکول کی لڑکیاں سب مجھے اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ سب مجھے ماں کے حوالے یعنی گھر سے بھاگ کر آنے والی لڑکی کی بیٹی کے نام سے پکارتے ہیں۔ جن کے ماں اور باپ شریف ہوتے ہیں تو ان کی اولاد باپ کے نام سے پہچانی جاتی ہے لیکن جب ماں بد کردار ہو تو تنہا کسی لڑکے کے ساتھ رات کے اندر میرے میں دلہن بن کر آئے تو پھر اس کی پہچان صرف ماں کا کردار رہ جاتا ہے۔ مجھے کوئی آٹم کی بیٹی نہیں کہتا۔ مجھے تو چار سالوں سے بھگڑی ماں کی بیٹی کے نام سے ہی پکارا جاتا ہے اور اب تو لوگ مجھ پر ہنسنے لگے ہیں۔ انہیں آپ کی نمازیں اور داڑھی نظر نہیں آتی، صرف آپ کا گھٹاؤ، اقدام اور ماں کی بد کرداری نظر آتی ہے۔ آپ دونوں کی خود غرضی نے آپ کے خاندان کو تباہ و برباد کیا ہی مگر آپ نے تو آئندہ نسل کو بھی زندہ در گور کر دیا ہے۔“

”تم..... تم..... یہ کیا کہہ رہی ہو۔ تمہیں یہ ساری باتیں کس نے بتائی ہیں؟“

”اس محلے کے لوگوں نے، دوستوں نے..... آپ کو کیا پتا کہ میں کیسے چار سالوں سے تنہائی کی آگ میں جل رہی ہوں۔ کوئی میری دوست نہیں ہے۔ سب کہتے ہیں جیسی ماں ویسی بیٹی ہوگی اور کہیں ان کی بیٹیاں میرے ساتھ رہ کر خراب نہ ہو جائیں تو

ان سب نے اپنی بیٹیوں کو مجھ سے ملنے سے منع کر دیا ہے۔ صرف ایک ڈیوڈ ہے جسے میں نے غیر مسلم سمجھ کر بھی بات نہ کی تھی۔ اس نے مجھے سہارا دیا اور..... اور اب میں نے سب کچھ پتا لگا لیا ہے۔ جب مجھ پر حقیقت آشکار ہوئی تو میں ڈیوڈ کے سامنے شرمندگی اور ندامت سے نظر نہیں اٹھا سکی۔ یہ جیسی محبت آپ کی جس نے آپ کے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا؟ آپ دونوں نے اپنے گھٹیا اقدام سے محبت کے جذبے کو کچل دیا۔ کاش! آپ محبت کا مفہوم سمجھ لیتے۔ محبت تو قربانی، ایثار و وفا کا نام ہے۔ محبت تو سکھ دیتی ہے۔ آپ دونوں کی محبت کیسی تھی جس نے نہ صرف اپنے ماں باپ کے لیے بلکہ آنے والی نسل کے لیے بھی کانٹے بوئے۔ چار سالوں سے یہ کانٹے میری روح کو بھولہان کر رہے ہیں مگر آپ دونوں جیسے خود غرض اور بے حس لوگ کیسے ان کانٹوں کی پہچان محسوس کر سکتے ہیں۔ آپ کی محبت، محبت نہیں تھی خود غرضی تھی۔ محبت تو بڑا پائیرہ جذبہ ہے۔ محبت کسی کو دکھ نہیں دیتی۔ یہ جذبہ تو بے غرض ہوتا ہے۔ چاہت کے پردے میں اگر لالچ اور ہوس پرستی ہو تو پھر یہ محبت نہیں ہوتی، صرف مادہ پرستی ہوتی ہے۔ بچ! کہوں تو آپ کو مادہ کی ضرورت تھی اور ماما کو کڑی اس طرح مادہ اور نرسل گئے اور جنگ کی زندگی اپنائی آپ نے..... انسان تو انسانوں میں رہتے ہیں۔ چپا! انہیں سب رشتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ رشتوں کے بغیر زندگی نہیں گزاری جاتی۔ ہاں جانوروں کو صرف نر اور مادہ کی ضرورت ہوتی ہے وہاں کوئی باپ اور ماں نہیں ہوتی، کوئی بہن بھائی اور اولاد نہیں ہوتی۔ دیکھا نہیں چڑیا اور چڑا۔ جیسے ہی اڑنا سیکھتے ہیں گھونسلہ خالی کر دیتے ہیں۔ جنگلی جانور غاروں کو چھوڑ کر اپنی راہ لیتے ہیں۔ چپا! ماما جب آپ نے جنگلی زندگی ہی

آپ دونوں کی مثال میرے لیے شرافت کی مثال نہیں ہے بلکہ آپ سے تعلق تو ذلت و رسوائی کے درجے کی کھولتا ہے میرے لیے..... وہ کہہ سکتی ہوئی نکل گئی۔
”نہیں..... نہیں! میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ عاشری! ماضی! اگر خدا کے لیے کرو۔“

”کیا ہو گیا ہے؟ کون سے عاشری جسے آپ خیند میں بھی پکار رہے ہیں۔ بتاؤ نا! مجھے! تمہیں میں ہی دل بھر گیا ہے مجھ سے جو بی محبوبہ ڈھونڈ لی ہے۔“ نازو چلا اٹھی۔
وہ بڑا کرشمہ بھلا۔ نادواستہ جھنجھوڑ رہی تھی۔

”سو جاؤ تم چپ کر کے.....“ وہ اب حواسوں میں لوٹ آیا تھا۔ اس نے نازو کو جھڑک دیا۔
”سہیلے مجھے بتاؤ عاشری کون ہے ورنہ میں چلا چلا کر محلہ اٹھا کر لوں گی۔ تمہاری خاطر میں سب کو چھوڑ کر آئی ہوں اور تم.....“

”بکواس مت کرو۔ تم نے ہی مجھے والدین سے بغاوت پر اکسایا تھا۔ دن رات فون کر کر کے میرا دماغ خراب کر دیا تھا۔ میں اس وقت تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ سو جاؤ ورنہ.....“ نازو بک جھک کر خاموش ہو گئی۔

وہ خود افسانہ کے عمل سے گزرنے لگا۔ منظر لمحہ لمحہ بدل کر اس کے سامنے آ رہے تھے۔ ہر منظر پوری جزئیات کے ساتھ ذہن کے در سے سچے سے جھانک رہا تھا۔
فہد بڑا تھا۔ جب وہ پیدا ہوا تو بہت خوشیاں منائی گئیں۔ اس کے دادا اور باپ نے جی بھر کے منگوائی بانٹی تھی۔ سفید پوشی کے باوجود خاندان والوں کی دعوت کی تھی فہد میاں تھیلے کا چھپا ہوا ہوا ہے۔

کبھی دادا ابھی راوی تو کبھی چھوٹیوں کے گلے کا ہار بنے۔ ہر روز دادا دکان سے واپسی پر ان دونوں کے لیے برقی لے کر آتے۔ راوی سودا لینے جاتی تو ان کے لیے چیز لے کر آتیں۔ پھوپھیاں اسکول جاتیں تو اپنے جیب خرچ سے ان کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آتیں۔ وقت کچھ اور آگے سرکا اور ان کے چپانے انہیں اسکول میں داخل کر دیا۔ سب نے کہا گورنمنٹ اسکول میں داخل کرو اور دگر چپانے کہا نہیں۔ انکس میڈیم میں پڑھیں گے، فیس ہی زیادہ ہے نا تو کوئی بات نہیں۔ کھانے کا خرچہ کم کر کے دے دیں گے اور پھر سفید پوشی کا بھرم نہ لٹھے ہوئے ان کی ہر خواہش پوری ہوئی۔ کبھی ٹرپ پر جانا ہے تو کبھی اسکول میں فنکشن کے لیے ناسوٹ چاہیے۔ ان کی پھوپھیاں نے اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ ٹیوٹن پڑھانا شروع کر دی اور ان کی چھوٹی چھوٹی خواہش بنا کہے پوری ہونے لگیں۔ اس کے بعد طالب طالب کے بعد آکاش نے آ کر کھکھولی اور پھر جب علی کے بعد احمد اس دنیا میں آیا تو گھر میں خوشی کی آبر دوڑ گئی۔ سب کہتے ایک والہ نے چھ کر دیا ہے ان کے دادا اور راوی تو بے انتہا خوش تھے۔

بڑھتی مہنگائی نے بھی ان کی ہڈ آسائش زندگی پر کوئی اثر نہ ڈالا۔ ان کی ہر سالگرہ بہت دھوم دھام سے منائی جاتی۔ دوستوں اور رشتہ داروں کو بلایا جاتا۔ پہلے قرآن پاک کا ختم ہوتا اور پھر رازسی عمر کی دعا مانگ کر کیک کاٹا جاتا۔ بہت خوشیاں منائی جاتیں۔ اس کے چاچا سترہ گریڈ کے آفیسر تھے مگر کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ مشترکہ خاندانی نظام تھا۔ اخراجات کی بھرمار تھی۔ جنہوں نے مکان لینے کی طرف بھی راغب ہی نہ ہونے دیا۔ سپا سے کم درجے کے لوگوں کے پاس رشوت کے سبب گاڑیاں اور مکان تھے۔ مگر اس کے دادا کا ایک ہی قول تھا۔

گزارنی تھی تو جنگل کی راہ لیتے۔ انسانوں کی بستی میں کیوں پناہ لی۔ بھول بھی معاف نہیں ہوتی اور آپ دونوں کی بوٹی فصل میں کاٹ رہی ہوں۔ پتا نہیں کون کون اس بھگتان کو بھگت رہا ہے۔“ وہ چار سالوں کا قطرہ قطرہ زہر آج بغیر کے اگل رہی تھی۔
”خدا کے لیے چپ کر جاؤ۔“ آتم کے ضبط کی انتہا ہو گئی تھی۔

”کیسے چپ کر جاؤں؟ سنا ہے میرے دادا بہت روئے تھے جب آپ کہیں اور جانے کا کہہ کر شادی کرنے چلے گئے تھے۔ اتنا بڑا دھوکا دیا آپ نے.....“

اتنا بڑا گناہ کرنا تھا تو ج بول کر کرتے..... آپ سے اچھا تو غیر مسلم ڈیوڈ ہے جس سے میں محبت کرتی ہوں۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے اس سے قطع نظر میں گھر سے بھاگ کر آنے والوں کی بیٹی ہوں۔ میں نے اسے شادی کے لیے کہا کہ تم مسلمان ہو جاؤ اور مجھے اپنا لو ورنہ میں خود کئی کر لوں گی۔ تو جانتے ہیں اس نے کیا جواب دیا؟

”عاشری! محبت بزدلی کی راہ نہیں دکھاتی۔ بغاوت کرنا نہیں سکھاتی۔ محبت بے اختیار جذبہ ہے جو مذہب کی تفریق کیے بنا ہمارے دلوں میں پیدا ہوا لیکن اسے اپنے اختیار میں کرنا ہمارے بس میں ہے۔ ہمارے درمیان مذہب کی اونچی دیوار حائل ہے اگر میں تمہارا دین اپنا بھی لوں تو والدین کی رضا مندی اور خوشنودی سے محروم ہوں گا۔ تمہارا مذہب ہو یا میرا ہمیں والدین کی اطاعت و فرماں برداری کا حکم دیا گیا ہے۔ باپ کی رضا اور خوشنودی اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہے۔ میں کیسے خدا کو ناراض کر سکتا ہوں۔ نہیں عاشری! میں اپنی دنیا اور آخرت محض تمہیں پانے کے لیے خراب نہیں کر سکتا۔ اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے اور خود کشی تو ہر مذہب نے حرام قرار دی

ہے۔ زندگی خدا کی نعمت ہے محض ایک شخص کو پانے کی خاطر ناکامی محبت میں مرجنا کہاں کی بہادری ہے۔ محبت انسانوں کو بہادر بناتی ہے۔ ایثار قربانی وفا اور انتظار کا نام محبت ہے۔ وصل محبت کے لیے ضروری شرط نہیں روحوں کے ملاپ کا نام محبت ہے۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا میرے دن رات تمہاری خوشی کے لیے دعا گو رہیں گے! یہی میری محبت ہے تم کوئی غلط قدم اٹھا کر اس پاکیزہ جذبے کو بدنام اور رسوا نہ کرنا۔ ایک اور عاشری کو مت جھنجھوڑنا۔“

”پاپا! ماما! یہ ہے محبت اور اسی محبت نے مجھے اتنا بہادر بنا دیا ہے کہ میں نے کسی کے سہارے کے بنا جینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس لیے اس گھر سے جاری ہوں۔ اپنے دادا اور تاپا چچا کے گھر نہیں جاؤں گی۔ مجھے دیکھ کر انہیں اپنے نافرمان بیٹے کی یاد آئے گی۔ جانے کیسے ان کے آسور کے ہوں اور مجھے دیکھ کر وہ جل تھل بہادریں۔ رستے ماسوروں کے منہ کھل جائیں۔ یہ دنیا بہت وسیع ہے کہیں نہ کہیں مجھے بھی ٹھکانا مل جائے گا۔ میرے جانے سے آپ دونوں کو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ جب آپ اپنے رشتوں کے بغیر رہ سکتے ہیں تو ایک بیٹی کی محبت کی کیا اہمیت.....؟ اس رشتے کی اہمیت کا اندازہ تو وہ ماں باپ کر سکتے ہیں جنہوں نے تمام رشتے نبھائے ہوں اللہ حافظ۔“

”رکو..... رکو..... عاشری! اسے روک لو۔ لوگ کیا کہیں گے۔ میں تو کسی کو مزہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔“

”ارے نہیں پاپا! آپ پر کوئی انگلی نہیں اٹھائے گا۔ سب یہی کہیں گے جیسی ماں بھی ویسی بیٹی نکلی اور بس..... انگلیاں تو میرے دادا پر اٹھی تھیں۔ جن کی شرافت کی گواہی سارا خاندان اور سارا محلہ دیتا تھا۔ سات پشتوں سے کسی نے ایسا قدم نہیں اٹھایا تھا۔

”حلال کھاؤ چاہے کم کھاؤ۔“

صرف تھوڑا عرصہ..... دادی کی وفات کے بعد صرف دو سال زندہ رہے اور پھر دادی سے یوں وفات بھائی کہ اس دنیا سے رخصت سفر باندھ لیا۔ باپ کی وفات نے ان کے پاپا کو بالکل تنہا کر دیا۔ ذمہ داریوں کا بوجھ جو بنا ہوا تھا اب مکمل طور پر ان کے باپ کے کندھوں پر آ گیا۔ گھر کی ذمہ داریاں نبھاتے کسی بھی لمحے ان کے باپ کے پائے استقلال میں لغزش نہ کی۔

وہ ایم ایس سی فائل میں تھا۔ فہد بھائی نے ایم ایس سی کر لی تھی۔ طالب نبی کام۔ آکاش ایف ایس سی۔ علی نے میٹرک کیا اور احمد نے پانچویں کلاس پاس کی تو احمد کو مدرسہ میں ڈال دیا حفظ کرنے کے لیے۔ انہی دنوں اس کی چھٹی چھوٹی شادی کی تیاری ہونے لگی۔ پانچویں اور چھٹی چھوٹے نے ٹیوشن کے ساتھ ساتھ اسکول بھی جوائن کر لیا تاکہ گھر کے حالات مزید سنور سکیں۔ اس کی چھوٹی شادی ہو گئی۔ وہ ہر چوتھے دن ان کے گھر جاتا کیونکہ چھوٹے نے ان کی خاطر بہت قربانیاں دی تھیں۔ تازہ ناشتا بنا کر دینا منہ سے نکلی ہر فرمائش پوری کرنا۔ چاہے آدھی رات کا وقت ہو۔

جب وہ اور فہد جاب کی تلاش میں تھے تو ان کی چھوٹی چھوٹی نے کراچی جانے کی تیاری کی اور ساتھ ہی ماموں کا بیٹا بھی تیار ہو گیا جو ان کے گھر میں ہی رہ رہا تھا تعلیم کی وجہ سے..... وہ سب پہلی دفعہ جہاز سے کراچی جا رہے تھے۔ اسی سفر میں ہی اس کی زندگی میں بگاڑ پیدا ہوا۔ پہلے وہ دادی کی بہن کے گھر گئے اور پھر پاپا کے ماموں کے گھر اور پھر اپنی خالہ کے گھر جہاں اس کی خالہ زاد بیٹی تھیں۔ اس کی خالہ زاد دادی ماموں کے بیٹے سے منسوب تھی مگر ماموں کا بیٹا کہتا تھا کہ دادی چھوٹے قادی اور مونی سے ہیں کسی اسرار اور لے قادی لڑکی سے شادی کروں گا۔ اسی بات نے

اس قول کو اس کے باپ نے ہمیشہ نبھایا۔ کبھی اولاد کو حرام کا فقر نہ کھلایا۔ جب فہد نے ایف ایس سی کر لیا اور اس نے میٹرک تو سب نے کہا کہ انہیں اپنے دفتر میں بھرتی کر دو مگر اس کے باپ نے کہا۔ میں انہیں اعلیٰ تعلیم دلاؤں گا۔ مکان کا کیا ہے بن ہی جائے گا۔ کم از کم میں اللہ کے سامنے تو سرخرو ہوں گا کہ انہیں دین اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم سے آراستہ کیا۔ اس کی تیسری چھوٹی شادی ہوئی تو گھر سونا سونا لگنے لگا۔ اب بچے بڑے ہو گئے تھے اخراجات بھی زیادہ۔ جو تھے سر دہائی چھوٹے اکیڈمی کھول لی یوں اس کی ٹیوشن سے کافی حد تک مدد مل گئی۔ ان کے دادا اور چھوٹیوں نے بھی ان کی کسی خواہش کو رد نہ کیا۔

پھر اس خوشیوں بھرے گھر میں موت کا سانحہ ہوا۔ موت جو بڑا آہٹ کے چلی آتی ہے اور سب کچھ مٹا دیتی ہے۔ اس گھر میں تو سدا محبت قربانی اور وفا کا درس ہی ملا تھا مگر موت نے ان سب کو سونوار کر دیا۔ اس کی دادی، محبتوں کی پیامبر جو انہیں انگلی پکڑ کر اسکول سے لایا کرتی تھیں اس جہان فانی سے کوٹھ کر گئیں۔ اس کے پاس اس کی چھوٹی بیکھر کر رہ گئیں اور انہیں تو یوں لگتا کہ جیسے ایک جھاؤں تھی ان کے سروں پر اور اب وہ کھلتا سماں کے نیچے ہیں کیونکہ ماں نے تو بس جنم دیا تھا مگر پالا دادی نے تھا۔ جو ذرا سی تکلیف پر راتوں کو اٹھ کر بیٹھ جاتیں۔

محبتوں اور قربانی کا ایک منظر درپے سے جھانکا تھا۔ جب اس کا ہاتھ چل گیا تھا تو ساری رات اس کی دونوں چھوٹیوں نے اس کے ہاتھ پر چھوئیں مار مار کر بتا دی تھی اور آدھے گھنٹے چلی تھی۔

پھوپھوں کی قربانیاں نہ ماں کے خواب جو اس کے شاندار مستقبل کے لیے وہ دیکھا کرتی تھی۔

ایک اور منظر نے درپے سے جھانکا۔ ”پاپا! ہمیں کل تین ہزار روپے چاہئیں۔ آج ہی نوٹس بورڈ پر لگا ہے میں جمع کروانے کی آخری تاریخ ہے۔“

”مگر بیٹا! بینک تو بند ہے۔ کہاں سے انتظام کروں؟ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

اور وہ پاپا کو کیسے بتاتا کہ پڑھائی کی جانب تو اس کی دلچسپی ہی نہیں رہی۔ وہ تو یہ وقت نادو کے خیالوں میں یا پھر اسے باتیں کر کے اپنے قیمتی وقت کو ضائع کر رہا ہے گویا اپنا مستقبل داؤ پر لگا رکھا ہے۔ فیس کا مسئلہ اس کی چھوٹی نے کسی دوست سے قرض لے کر حل کر دیا۔ یوں اس کا قیمتی سال بچ گیا۔

ایک دن رات ایک بچے نادو سے بات کرتے ہوئے اس کے پاپا نے اسے پکڑ لیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسے لعن طعن کریں گے مگر وہ اس کا موبائل فون لے کر خاموشی سے کمرے میں چلے گئے۔

”دیکھو تم! مجھے یہ حرکتیں پسند نہیں۔ تمہارے بڑے بھائی نے بھی ایسی حرکت نہیں کی کہ جس پر مجھے شرمندگی ہو تمہارے چھوٹے بھائی ہیں ان پر کیا اثر پڑے گا۔ ہمیں نادو پسند نہیں ہے وقت آنے پر میں رشتہ داروں میں ہی شادی کروں گا اور تم لوگوں کی پسند سے مگر نہ ابھی وقت مناسب ہے نہ حالات۔“

اس لیے آئندہ مجھے شکایت کا موقع نہ دینا۔“ نادو نے اس سے تعلق نہ توڑا لیکن اب گھر کے بجائے وہ آفس میں باتیں کرتا اور درس دینے کے بہانے گھنٹوں گھر سے باہر رہتا اور فون پر کہہ دیتا کہ آج مجھے فلاں جگہ درس دینا ہے۔ گھر والے سمجھتے تھے اسے کچھ بھائی ہی نہ دیتا۔ نہ باپ کی محبت نہ

نادو کو اس کی طرف راغب کیا اور پھر خالہ کی کھلی پھوٹ نے..... وہ فہد بھائی نادو اور الماس ساری رات تاش کھیلنے رہے مگر خالہ نے نگر ہو کر سوتی رہیں۔ کبھی لڑو کبھی تاش تو کبھی باتیں وہ ساری ساری رات جانتے رہے۔ نادو اور الماس کا باپ پولیس میں تھا اور غنڈوں سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گیا مگر اب ماں کو کوئی پروا نہ تھی کہ رات گئے جوان لڑکوں کے ساتھ جوان لڑکیوں کا کھیلنا یا باتیں کرنا کسی بھی بڑے فعل کو ختم دے سکتا ہے شاید وہ خود چاہ رہی تھیں کہ اسی طرح لڑکے ان کی بیٹیوں کی طرف مائل ہوں اور وہ ان کی شادی کے فریضے سے سبکدوش ہوں۔ وہ نادو سے نمبر لے کر واپس لا ہوا گیا پھر موبائل پر دونوں کی گھنٹوں بات ہوئی۔ نادو اسے ایسے ایسے اس ایم ایس کر رہی جس کی وجہ سے اس کا رجحان لڑکیوں کی طرف راغب ہو گیا حالانکہ اس سے پہلے وہ یونیورسٹی میں خوب صورت ترین لڑکیوں کے ساتھ پڑھتا رہا تھا مگر بھی کوئی غلط سوچ اس کے ذہن میں نہ آئی۔ اس نے شرعی دائرہ رکھی ہوئی تھی۔ پانچ وقت نماز پڑھتا مگر بھی کوئی غلط خیال نہ آیا۔

انہی دنوں اسے جانبیل گئی اور فہد بھائی کو بھی لیکن ان کی دونوں چھوٹیوں نے پاپا کی مدد کی خاطر جانب نہ چھوڑی اور نہ ہی ٹیوشن..... کیونکہ ان کے یونیورسٹی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے بینک سے پاپا نے جو قرض لیا تھا اس کی قسطیں دینا پانی تھیں۔

اک روز نادو کے نازیاں ایس ایم ایس فہد نے دیکھ لیے تو وہ بھڑک اٹھا اور پاپا کو بتانے کے لیے گیا۔ تب انہوں نے رات گئے چیلج پر بات کرنی شروع کر دی۔ جب سب سو جاتے تو وہ کئی کئی گھنٹے لائینی باتیں کرتے۔ چنانچہ نادو نے اس پر کیا جادو کر دیا تھا کہ اسے کچھ بھائی ہی نہ دیتا۔ نہ باپ کی محبت نہ

یوں وقت گزرتا گیا۔ اسے جب آفس سے گاڑی ملی اور خواہ پینتیس ہزار ہوگئی تو نادو نے شادی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ جب تک تمہاری تمام پھوپھوں کی شادی نہیں ہوگی تمہارے باپ نے تم لوگوں کی شادی نہیں کرنی۔ تم بوڑھے ہو جاؤ گے۔“

خالہ بھی کہتیں۔ ”شادی کی ایک عمر ہوتی ہے بس تم باپ سے بات کرو کہ وہ تمہاری شادی کر دے۔“

وہ بچی تھی تم اچھی خاصی تنخواہ لے رہے ہو۔ گاڑی بھی مل گئی ہے اور کیا چاہیے۔ پچیس سال آئیڈیل عمر ہے۔ اب شادی کر لو تمہارے دادا نے تمہارے باپ کی شادی بیس سال کی عمر میں کر دی تھی۔ اس لیے اب تم جوان ہو اور تمہارا باپ بھی جوان ہے۔ کم عمری کی وجہ سے اللہ نے بیٹہ بھی جلدی دے دیئے۔ اس لیے باپ کے ساتھ چلتے ہوئے تم لوگ اس کے بھائی لگتے ہو۔ اگر تمہاری ایک دو پھوپھوں کی شادی نہیں ہو رہی تو اس میں تمہارا کیا قصور؟ غی لنگر کرو۔“

پھر نادو رو رو کر کہتی۔ ”آٹھ ملین ایسی بات مان لو۔ خالو سے بات کرو۔ اگر وہ مانتے ہیں تو ٹھیک ورنہ ہم خود کر لیں گے۔ عمر گزر گئی تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

پھر اس نے سب کے کہنے پر اپنی ماما سے بات کی تو ماں نے بیٹے کو سمجھانے کے بجائے کہا کہ میں تمہارے باپ سے بات کروں گی اور جب ماں نے باپ سے بات کی کہ ختم کی نادو سے شادی کر دیں تو انہوں نے کہا کہ ”میں بچے کو سمجھاؤ ابھی وقت نہیں آیا اور نہ حالات ایسے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے گھر کے اخراجات چل رہے ہیں۔ کیا خالی ہاتھ بھولے کر آتی ہے۔ طالب الیم کام کر رہا ہے نہ وہ جواب پر لگتا ہے تو پھر

پہلے فہد اور پھر آثم کی شادی کروں گے۔ میرے پاس چیک میں جو پیسے ہیں ان سے کوئی چھوٹا موٹا گھر لے لیں گے مگر ابھی میں شادی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ بیٹے کو سمجھا دو اور اپنی بہن کو بھی کہو۔“

مگر اس کی ماں بھی، بہن اور بھانجی کی حامی بن گئیں اور گھر میں لڑائی جھگڑا شروع ہو گیا کہ میری بھانجی ہے اس لیے آپ منع کر رہے ہو۔ میں تو اپنی بھانجی سے آثم کی شادی کر کے رہوں گی جس کو تکلیف ہوتی ہے، نوتی رہے۔ اس پر دونوں چھوپیوں کی ماں سے جھڑپ ہوئی اور ماں بغیر اجازت اپنی بہن کے گھر چلی گئی۔ تین چار دن، بھانجی کے گھر رہی مگر آج کل کے زمانے میں کون کسی کو عمر بھر رکھتا ہے یوں خود ہی گئی تھیں اور پھر خود ہی واپس آ گئیں۔

مگر نونہ نے فون کر کے کہنا شروع کر دیا، ”تم کچھ کمزور نہ میں خود کشی کر لوں گی۔ چلو کورٹ میرج کر لیں۔“ وہ بھی خود غرض اور بے حس بن گیا۔ جیسے جیسے نونہ ڈور ہلائی وہ کھٹکتی بن کر رہ گیا۔ سچ ہی کہتے ہیں کہتے ہیں کہ کامیاب مرد کے پیچھے بھی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور نا کام مرد کی ڈوری بھی عورت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ چند ہزار روپے باپ کو دیتا تھا مگر پھر اس نے وہ چند ہزار روپے بھی دینا بند کر دیے مگر اس کے باپ نے ایک دفعہ بھی نہ مانگے۔ نہ اس کا رونی پانی بند کیا اس نے چار پانچ سینٹیوں میں گھر لیا اور نونہ اور خالہ کے کہنے پر گھر کی تمام چیزیں خریدیں اور گھر سیٹ کر لیا۔ اس کا باپ ذرا سی دیر ہو جانے پر تڑپ اٹھتا تھا اور فون پر فون کرتا۔ اس لیے اس نے ہمیشہ درس کے نام پر سنے گھر میں جا کر گھر گھر سیٹ کرنا شروع کر دیا اور گھر والے الجھتے کہ وہ لوگوں کو تین کی تربیت دے رہا ہے۔ باپ فون کرتا تو یہی تسلی دیتا کہ پیاربا ہوں یوں اس نے باپ کی آنکھوں میں دھول جھونک

کرا ایک لڑکی کے بہکاوے میں آ کر تمام رشتوں کو
وہس پست ڈال دیا۔ ایک دن جب وہ الماری سے اپنی
کٹائیں نکال کر گاڑی میں رکھ رہا تھا تو اس کی چھو پو
نے پو پھایا کٹائیں کہاں لے جا رہے ہو۔ تو اس نے
جواب میں جھوٹ بول دیا تو اس نے کہا۔
”سننا؟! اڑنی اڑنی خبر سنی ہے کہ تم شادی
کر رہے ہو۔ باپ کے بغیر نکاح کے وقت... کسے
ولی بناؤ گے اور پھر کیا تم ایک لڑکی کے لیے سب کچھ
چھوڑ دو گے؟“ چھو پو کو جانے کہاں سے خبر ملی تھی۔
انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر اس نے
نہیں مائل دیا۔ مگر اب بات یہاں تک پہنچ چکی تھی۔
انہوں نے خالہ کو فون کیا۔
”دیکھو! نادو کو منع کر دو۔ دودو گھنٹے فون کرتی ہے
آتم کو آج اگر ظہور زندہ ہوتا تو وہ یوں حلی چھوٹ
تانا؟ رشتے میں سے اپنوں میں ہی کرنے ہیں مگر
وقت آنے پر.....“ مگر خالہ ڈاٹر مارتہ ہوئی۔
”بچے ضد کر رہے ہیں تو شادی کر دیتے
ہیں۔ ان کی ضد پوری کر دیتے ہیں۔“
”اگر بچے آگم کپڑیں تو کیا ہم پڑنے دیں
گے؟ تم اپنی بیٹی کو سمجھاؤ کہ اس کا پیچھا چھوڑ دے۔
میں نے ہمیشہ تم لوگوں کو سپورٹ کیا۔ کیا اس کا یہ
دل سے کہ آج تم لوگ میرے بیٹے کو ہی میرے
ملاقات کر رہے ہو۔ میں تو بچوں کی ضد پوری کرنے
کے حق میں ہوں۔ نادو کی اور آتم کی خواہش ہے۔ تم
بی بی بیٹی کو سنبھال کے رکھو۔“ اس کے پاپائے کہہ کر
ان بند کر دیا۔
نادو نے آتم کو یہ ساری رپورٹ دی اور باپ کے
صاف اکسایا۔ ”آتم! تمہارے باپ نے میری ماں
بے عزتی کی ہے۔ بس تمہیں مجھے سے شادی کرنی
ہوگی۔ باپ کی رضامندی کے بغیر ورنہ میں خودکشی

کریں گی۔“

اور نادو خود کٹی کر لے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نادو کا جادو ہی تو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ جس نے اسے سوچنے بھننے کی صلاحیت سے محروم کر دیا۔

اس نے ایک روز آفیس سے آ کر تین روز واپس آج کا بہانہ کر کے وہ کراچی چلا گیا اور اپنا ٹیل آف کر دیا تا کہ کوئی کال نہ کر سکے اور شادی کر کے نادو کو رات کی فلائٹ سے لے آیا۔ اس گھر میں جہاں استقبال کرنے والے چند دوست تھے۔ جب سیل آن کیا تو صرف ایک ایس ایم ایس تھا۔

”تم نے اسلام کے نام پر دھوکا دیا۔ ایک لڑکی کی خاطر سب رشتوں کو چھوڑ دیا؟ نکاح کے وقت جب مولوی نے پوچھا تھا ہولی کے بارے میں تو باپ کی زندگی میں کس کو باپ پر فوقیت دی..... ان لوگوں کے آلہ کار سبے بوجہن پر ہمیشہ تمہارے باپ نے احسان کیا۔ وہ تو احسان فراموش نکلے مگر تم بھی۔ جس کو زندگی کا ساتھی بنا کر لائے ہو وہ وہاں کہہ کر آئی ہے کہ میں نے انتقام لے لیا“ مجھے فون کرنے سے منع کیا تھا۔ میں نے بیٹا کی جھین لیا۔ تم اتنے بے حس اور خود غرض نکلے گئے کیا تم بھی نہ تھا۔“

اس کا رابطہ سب سے کٹ گیا۔ وہ کبھی کبھی miss u کے ایس ایم کرتا اور جواب میں سب اسے درود کر ایس ایم ایس کرتے کہ لوٹ آؤ۔

تمہارا باپ جو ایک لمحے کی دیر برداشت نہیں کرتا تھا سب رات کو اسے نیند نہیں آتی لیکن اسے کسی کا اثر نہ ہوا کبھی گزری تھیں تنگ کرتیں مگر وہ جسے کی چادر ڈھک لیتا۔ ایک دفعہ باپ سے معافی مانگنے یا تو تمہیں نے اتنے بچو کے لگائے کہ اس نے درود کر معافی مانگی مگر مہیا نے کہا ہاں تم آ سکتے ہو میں سب کچھ بھلا دوں گا مگر وہ لڑکی نہیں جس نے انتقام کے لیے تم سے

کردی ہے۔ ”نہد کی آواز درپیکوں سے پکاری۔
”ارے مولوی! تو ناچے گا۔“ نہد نے احمد کو چھیڑا۔
”ہاں بھائی! میں اور علی بارات پر بھنگڑا ڈالیں
گے۔ ویسے نہد بھائی قمر نہ کریں پہلے آپ کی شادی
ہوگی پھر آثم بھائی کی۔ آپ کی بیوی بھی دیو کی شادی
پر ڈانس کرے گی۔“
”میں تو مسجد میں نکاح کروں گا۔“
”آثم بھائی نکاح مسجد میں ہی کریں گے۔ یہ
خوشیاں تو ہم گھر میں منائیں گے۔“
”میں تو تمہاری شادی پر ساڑھی باندھوں گی۔“
اس کی بیوہ پھوپھو جو ان کے پاس ہی رہتی تھی خوشی
سے پکاری۔
”تختے ارمان تھے سب کے جو میری اس بھول
سے ملیا میٹ ہو گئے ہیں۔ کتنی بدخلوس چاہتیں تھیں
جن سے میں نے منہ موڑا۔“
”آثم! تم نے بہاری کباب لے کر جانے ہیں۔
میں صبح بنادوں گی۔ چلدی اٹھو گے تا پہلے تمہارے
لیے تازہ ہنڈیا بنادوں گی پھر اسکول کی تیاری کروں
گی۔“ راجی پھوپھو نے کہا۔
”مجھے دس پراٹھے چاہئیں بہاری کباب کے
ساتھ۔“
”میں بنادوں گی۔ ان دونوں کا ناشتا بنانے کے
بعد تمہارے لیے بنادوں گی تازہ مزیدار پراٹھے۔“
راجی پھوپھو کی آواز گونجی۔
”آثم! آج میں نے مشین لگائی ہے اپنے
دھونے والے کپڑے اتار دو پھر باتیں سناتے ہو یہ
نہیں دھونے تھے۔“ ماما کی آواز گونج رہی تھی۔
اور وہ دن جب اس کی پھوپھیاں آئی ہوئی تھیں
”پاپا کی خواہش ہے کہ بارات کبھی میں لے کر
جائیں گے۔ تیری خاطر میں نے بچت کرنی شروع
کر لی ہے۔“

وسلم نے تین دفعہ یہ الفاظ دہرائے اور جب صحابہ کرام
رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کس کی ناک..... تو حضور
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی ناک جس نے
والدین کو بڑھاپے میں پایا اور ان کی خدمت نہ کی۔“
والدین کا بڑا مقام ہے اس لیے بچو! والدین کی بھی
نافرمانی نہ کرنا کیونکہ والد کی رضا اور خوشنودی رب کی
رضا اور خوشنودی ہے۔ جس نے والدین کو ناراض کیا
اس نے اپنی دنیا و آخرت خراب کر لی۔“
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ نظروں کے
سامنے گھوم گیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی
قربانی..... وہ بھی تو بیٹے تھے جنہوں نے جان کی پروا
نہ کی اور اللہ کی راہ میں قربان ہونے کے لیے چل
پڑے اور جب باپ نے کہا۔ ”اسمعیل علیہ السلام
سے کہنا کہ چوٹ بدل لے تو انہوں نے لبیک کہتے
ہوئے اسی وقت بیوی کو طلاق دے دی بخش باپ
کے کہنے پر..... انتظار رہا ہے باپ کا۔ میں انتظار نہ
کر سکا۔ دو چار سالوں کا..... وہ بچ ہی کہتی ہے کہ ہم
دونوں کو ایک دوسرے سے محبت نہیں تھی۔ ہمیں خراور
مادہ کی تلاش تھی۔ کیونکہ ہوس پرستی ہی بغاوت کے
راستے پر چلائی ہے۔ محبت تو وفا کرنا سکھاتی ہے
قربان ہونا سکھاتی ہے ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میں
اب مزید اسے سمجھ دے بغیر نہیں ہونے دوں گا۔
اب نادو سے راستہ بدلانا ہوگا۔ ماضی سے تعلق جوڑنے
اور مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے..... منظر بدل
کر اس کی نظروں کے سامنے رہے تھے۔
”آثم بھائی! آپ کی شادی پر ہم دونوں تو خوب
ڈانس کریں گے۔“ طالب اور آ کا شچسکی آنکھوں
کے ساتھ کہہ رہے تھے۔
”پاپا کی خواہش ہے کہ بارات کبھی میں لے کر
جائیں گے۔ تیری خاطر میں نے بچت کرنی شروع
کر لی ہے۔“

خطرناک بیماری نہیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے کہ
کسی بھی بھائی کو یہ بیماری نہ لگے۔“
”مجھے تین ہزار روپے دیں آئی! تنخواہ ملنے پر دے
دوں گا۔“
”یہ لو! تمہارے اور میرے پیسے الگ ہیں کیا۔
اب مجھے واپس نہیں کرنے.....“
”یہ تم سب کے سوٹ ہیں۔ میری تنخواہ بڑھی
ہے۔“
”پھوپھو! آپ کا سوٹ؟“
”تم لوگوں نے لیے یا میں نے ایک ہی بات
ہے۔ اگلے مہینے لے لوں گی۔“
”تم نے مجھ غریب کا پیٹل لے لیا؟ آثم! میں
کیا کروں گی؟“
”چھوٹی پھوپھو چلائی۔“ ارے تو کیا ہوا! بہت پیسے
ہیں آپ کے پاس.....“ وہ اکثر شری راجی پھوپھو سے
بیننس تیز کرتا۔
ایک اور منظر اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھگو گیا۔
جب اس کا آپریشن ہوا تو کیسے طالب آ کا ش
اور فہد اس کے پاس رہے باقی بھی وہیں تھا۔
وہ سب اس کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھے اور کبھی
نس، کبھی ڈاکٹر سے لڑ پڑتے اور جب وہ گھر آیا تو پتا ہر
نماز کے بعد درود شریف پڑھ کر اس پر دم کرتے۔
راتوں کو کئی دفعہ جب اس کی آنکھ کھلتی تو وہ دیکھتا اس
کے پاپا اس کے پاس کھڑے ہیں۔ اسے دیکھ رہے
ہیں۔ اس پر پڑھ کر چھوٹ کر رہے ہیں۔
”اُف! یہ میں نے کیا کیا۔ ایک لڑکی کی خاطر ان
تمام محبتوں سے منہ موڑ لیا؟ کیا رشتہ رہ گیا ہے میرے
پاس ایک بیوی اور اس کی ماں..... بس!“
ایک نیچر کی آواز گونج رہی تھی۔
”اس کی ناک خاک آلود ہو۔“ حضور صلی اللہ علیہ

شادی کی جہنمیں بغاوت پر اکسایا وہ میرے لیے
قابل قبول نہیں اور پھر وہ سب سے تعلق ہو گیا۔
مگر آج شادی کے چار مہینے گزرنے کے بعد
اسے احساس ہوا کہ یہ اس نے کیا کیا؟ ایک خواب
نے اسے سرتاپا لرزادیا۔ کیا میری آنے والی سل بھی
یوں ہی کرے گی۔ کیا ہماری ذات اس کے لیے
ذلت و رسوائی کا سبب بنے گی؟ ہاں ایسی شادیاں
جس میں ماں باپ شامل نہ ہوں ان کی وعائیں
شامل نہ ہوں ریت کے گھر وندے ثابت ہوتی ہیں۔
آہ! میں نے کیا کیا..... اتنی ساری محبتوں کو صرف
ایک محبت پر ترجیح دی۔ نہیں! یہ محبت نہیں تھی خود غرضی
تھی۔ محبت ایسا زقرانی دفا اور انتظار کا نام ہے اگر نادو
کو مجھ سے محبت ہوتی تو وہ کہتی کہ میں تمہارا انتظار
کروں گی، ابھی تم گھر کے مسائل سلجھا لو ان کے لیے
خوشیاں تلاش کرو جنہوں نے تمہارے لیے اپنی
زندگیاں وقف کیں۔
ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تھا اور
دامن بھگو گیا۔
ایک قطرہ خون نکلا تھا ناک سے..... ڈینگی
وائرس؟ اور اس کے پپا کا جسم کا پٹنہ لگا۔ کیسے اسے
طالب اور آ کا ش اٹھا کر لے گئے گاڑی میں اور کیسے اس
کے پاس درود شریف پڑھ کر سارے راستے
پھولیں ماریں اور رات بارہ بجے تک سارے ٹیٹ کروا
کے اور پورس لے کر گھر لوٹے تھے کہ ڈینگی وائرس
نہیں۔ بخار ہے اور کمزوری کی وجہ سے اور بار بار تے
کرنے کی وجہ سے خون کا قطرہ نکلا ہے۔ یہی احمد
بھاگ کر آیا تھا میں نے اور پھوپھو راجی نے روزہ مان لیا
ہے آپ ٹھیک ہو جائیں گے تو ہم روزہ رکھیں گے۔
”اکی گرمی میں روزہ رکھو گے؟“
”تو کیا ہوا آپ ٹھیک ہو گئے ہیں اور اتنی

جاؤں گا۔ جہاں سب میری قبیح حرکت کے باوجود میرے منتظر ہیں۔“
نادو اپنی پھیلیوں کو دیکھ رہی تھی جس پر ہندی کا رنگ ماند پڑ چکا تھا اور اب طلاق کا دھبہ نمایاں ہو رہا تھا۔ یہ اس کے اپنے فعل کی سزا تھی جو جرم کرتا ہے اسے سزا ضرور ملتی ہے۔ اس دنیا میں ملے چاہے روز آخرت میں..... دلوں کو تو ذکر مند رہنا ہے جاسکتے ہیں جھوٹے خداؤں کے گھر..... مگر مسجد نہیں کہ دل میں تو رب بستا ہے۔ کاش! ہماری نوجوان نسل کو اس کی سمجھا دے۔

لوا کورٹ میری صرف تباہی کا راستہ ہے۔ اپنی خاندانی شرافت کو رسوا کرنے کا اور پھر آنے والی نسل کو ذلت و رسوائی دینے کا اور پھر یہ تباہی کا سلسلہ سل در نسل چتا رہتا ہے یا پھر مقتدر کی سیاسی طلاق کی صورت میں داغ لگادیتی ہے۔ وہی شادی کامیاب اور دیر پا ہے جو والدین کرتے ہیں۔ رب کی رضا اور خوشنودی سے بہت سے لوگوں کی موجودگی میں یہی وہ طریقہ ہے جسے معاشرہ قبول کرتا ہے۔ بصورت دیگر شادی شادی نہیں اک جرم بن جاتی ہے۔

نادو آج بھی زندہ ہے مگر کسی زندہ لاش کی طرح۔ اس کی ماں کو بھی دنیا چھوڑے دو سال گزر چکے ہیں۔ مجھے اس کی داستان اس کے پڑوس میں رہنے والی ایک خاتون نے سنائی جس نے اس کڑے وقت میں نادو کو سہارا دیا ہوا ہے۔ بقول اس خاتون کے وہ کئی بار کوشش کر چکی ہے کہ نادو عقد ثانی کر لے لیکن وہ تیار نہیں ہوتی۔ بس یہ کہہ کر خاموش ہو جاتی ہے۔ ”میں نے جنگل کے قانون پر عمل کیا تھا اب اس کی سزا مجھے بھگتنا ہے۔“

○

ہے جو ہر رشتے سے وفا کرتا ہے۔ جب کہ میں کسی رشتے سے وفائیں کر سکا جنہوں نے مجھے جہنم دیا۔ جنہوں نے مجھے پاا تو دو چار دنوں کی آشنائی رکھنے والے مجھ سے کیسے وفا کی امید رکھ سکتے ہیں تم نے بھی صرف اپنی ضد اور انتقامی کارروائی پوری کی ہے۔ اگر تم اپنی خال اور خالو سے مخلص ہو تیں تو مجھے انتظار کرنے کے لیے کہتیں کیا تم میں تمہارا انتظار کروں گی؟ جب تک تمہارے گھر کے مسائل حل نہیں ہو جاتے اور فہد بھائی کی شادی نہیں ہو جاتی۔ یوں اکیلے لڑکے کے ساتھ اتنی دور نہ چل پڑ تیں۔ محبت ایثار و وفا کا نام ہے جس سے ہم دونوں ہی ناواقف رہے اور پھر جو گھر ریت پر بنائے جاتے ہیں وہ ٹوٹ جاتے ہیں۔ جن گھروں کی بنیاد جھوٹ فریب خود غرضی اور انتقامی سوچ پر رکھی جائے انہیں تو ہوا کا معمولی جھونکا بارش کا قطرہ بھی مٹا دیتا ہے۔ شادی وہی کامیاب ہوتی ہے جو لڑکی لڑکا نہیں بلکہ دو خاندان مل کر طے کرتے ہیں۔ جن میں والدین بھائیوں بہنوں اور دیگر رشتہ داروں کی پر خلوص دعائیں شامل ہوتی ہیں اور جن کی بنیاد وفا خلوص اور نیک نیتی پر رکھی جاتی ہے ورنہ تو جنگل میں بھی تر اور مادہ رہتے ہیں۔ جنہیں کسی رشتے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جاؤ نادو! تم بھی لوٹ جاؤ۔ تم نے بھی ماں کے ساتھ مل کر اپنے مرے باپ کی قبر کو رسوا کیا۔ تمہارے اس فعل پر تمہارے باپ کی روح تڑپ رہی ہوگی۔ جب لوگ اور محلے والے کہتے ہوں گے کہ نادو نے بھاگ کے شادی کی ہے اور اس عرصے نے مجھے بھی احساس دلادیا ہے کہ میں نے غلط قدم اٹھایا تھا میں نے چار مہینے اپنوں سے دور رہ کر سزا کاٹ لی ہے۔ اب اس گناہ کی تلافی کا وقت ہے۔ میں..... میں سب سے معافی مانگ لوں گا۔ اس گھر میں موت

کر دیتیں۔ مجھے یقین آ گیا کہ تم نے انتقام لیا ہے میرے پیارے لیکن تم بھول گئیں کہ ایسا قدم اٹھانے والی کی اپنی عزت و حرمت بھی داغ دار ہو جاتی ہے۔ چار دیواری سے نکل کر محلے والوں سے پوچھنا ان چار مہینوں میں کوئی ہمسایہ ہمارے گھر نہیں آیا۔ جانتی ہو کیوں؟ سب تمہیں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی سمجھتے ہیں اور کل جب ہماری اولاد ہوگی تو اسے ہماری مثال دی جائے گی کہ تمہاری ماں رات کے اندھیرے میں بغیر بارات کے تمہارے باپ کے ساتھ آئی تھیں! ہم کیا جواب دیں گے آنے والی نسل کو؟ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم راستہ بدل لیں۔ یہی فیصلہ ہمارے لیے اور ہمارے آنے والے نسل کے لیے بہتر ہے۔ اس لیے میں تمہیں طلاق دیتا ہوں..... طلاق..... طلاق!“

”یہ..... کیا کہہ رہے ہیں؟ میں نے آپ کی خاطر سب کی مخالفت مول لی امی نے میری وجہ سے خاندان بھری باتیں سنیں اور آپ یہ صلہ دے رہے ہیں؟“

”سنو نادو! نہ تمہیں مجھ سے محبت تھی اور نہ مجھے تم سے..... بس تمہاری ضد اور میری خود غرضی کے سبب ہم نے یہ قدم اٹھایا۔ اگر ہم مخلص اور محبت کرنے والے ہوتے تو بھی یہ قدم نہ اٹھاتے۔ میں بے غرض چاہتوں سے منہ نہ موڑتا۔ جب میں نے اپنے والدین سے اپنے بھائی سے بے وفائی کی اس گھر سے جہاں میں نے آنکھ کھولی اور عمر کی بچپن بہاریں دیکھیں جہاں مجھے ہمیشہ چھوپے سے بچایا گیا میرے باپ نے خود دھوپ کی تمازت سہی اور ہمیں چھپاؤں دی جب میں اس سے وفائیں کر سکا تو تم سے کیسے وفا کر سکتا ہوں؟ جس سے میں نے دو چار سال ہی بات چیت کی اور اب صرف چار مہینے..... وفادہ نہاتا

”میں! تم بھائی کے ساتھ آگے گاڑی میں بیٹھوں گا۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تم دونوں منے منے سے تو ہو بیٹھ جاؤ۔ جب ان کی بیویاں آجائیں گی پھر یہ کہاں ہاتھ آئیں گے۔“ دونوں پھوپھوں نے کہا تھا۔

”جی نہیں پھوپو! آپ ہمیں ایسا سمجھتی ہیں؟“

”بیٹا جی! انسان کو بدلے دیر کیا لگتی ہے؟“ بڑی پھوپو نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

”یار ہماری بڑی آنٹی تو فلاسفر ہو گئی ہیں۔“ فہد نے شرارت سے کہا۔

”زندگی کے کتنے خوب صورت رنگ تھے اس کی آنکھیں متواتر برس رہی تھیں۔ ان خوب صورت رنگوں کو یاد کر کے.....“

”آپ..... آپ..... رورہے ہیں۔ کیا ہوا ہے؟“ اور..... اور..... یہ عاتق کون ہے؟ جسے آپ رات بیکار رہے تھے۔“

”عاشی! میری آنے والی نسل..... میں کئی دنوں سے عجیب سے خواب دیکھ رہا ہوں جن کی تعبیر بہت بھیا تک ہے۔ پتا نہیں میرا احساس جرم ہے یا تمہیر کی آواز جو روپ بدل بدل کر مجھے تینہ دکھائی ہے۔ میں خود غرض اور بے حس ہو گیا تھا مگر اتنا نہیں اس لیے تو ہر خواب مجھے ہاضی کی یادوں میں دھکیل دیتا ہے۔ پچھتاوا اور پشیمانی کا احساس اتنا بڑھ جاتا ہے کہ میرے لیے دن کاٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نادو! ہم نے بہت غلط قدم اٹھایا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے مخلص ہی نہیں تھے۔ اگر مخلص ہوتے تو ایسا قدم نہ اٹھاتے جو ہمارے خاندان کو ذلت و رسوائی کے گڑھے میں گرا چکا ہے۔ اس میں تمہاری ماں زیادہ قصور وار ہے۔ اسے ہمیں روکنا چاہیے تھا۔ میں اکیلا گیا تھا نا! وہ شادی نہ کرتیں میرے پیارے کوفون

جند

روبین احمد

پریل شاہ..... بکیرا شریف
پیاراں سے کیجیے صدیوں کی عرس مانگ کر
بار بار ایسا زمانے میں جس آتا نہیں
مقبول شاہ مدد بخش..... ننڈوالہ یار
پھر نہ کیجیے میری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھیے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو
ایقہ صدف..... حیدر آباد
پھیلے گی تیرے ہاتھ کی خوشبو بھی اس کے ساتھ
پاگل ہوا کے دوش پہ لکھا نہ کر مجھے
محمد یاسین اندوری..... حیدر آباد
پتھر سے توڑ نہ دے اسے کوئی بے شعور
پانی سے اپنا گلس اٹھا کر ہی لے چلیں
فقیر محمد شاہ..... ننڈوالہ یار
پہاڑ کو تراش دوں یا پھر دوں زمیں کا دل
خبر نہ گئی کہ آرزو تیری میرے ہنر میں ہے
سید پھل شاہ حسینی..... حیدر آباد
پہاڑوں کو اٹھا لینا بہت آسان ہے لیکن
بہت دشوار ہے ہونٹوں پر حرف دغا رکھنا
مرزا عیاد بیگ..... حیدر آباد
بہن کر رہی کپڑے ادا کاری نہیں کرتا
میں اپنی مغلیں کے ساتھ غداری نہیں کرتا
ناجوسبا..... لیاقت آباد، کراچی
پہلے ہم ایک دوسرے کے سائے میں چھپتے پھرے
اور اس کے بعد پھر جو کچھ ہوا، اچھا لگا
ایم شیرازی..... ملتان
پھر کیوں ہے غریبوں کے گھروں میں اندھیرا

یہ چاند اگر سارے زمانے کے لیے ہے
شاہین بیگم..... بلیر ہاٹ، کراچی
پھر ہاتھ نہ لی امید وفا آپ سے عاصی
پھر ایک آشیانہ ہوا میں بکھر گیا
عمر جاوید..... ننڈوالہ یار
پھیلے ہوئے ہاتھوں کو حشرات سے نہ دیکھو
ہر شخص کی چوکت پہ سواری نہیں آتا
آصف کریم..... حیدر آباد
پرند ہزار اڑیں بادلوں کے سائے میں
میرے خیال کی رفتار کو چھو نہیں سکتے
مونا صدیقی..... حیدر آباد
پلکوں پہ سجائے ہوئے اشکوں کے تھمے
اک روز تیرے شہر میں آجائیں گے ہم بھی
رضوانہ صدیقی..... حیدر آباد
پیار کی جوت سے گھر گھر ہے چراغاں ورنہ
ایک بھی شمع نہ روشن ہو، ہوا کے ڈر سے
رضوانہ شیخ..... فیصل آباد
پگ پگ ہمارے خون کے چھیننے اڑے تو کیا
یہ تو ہوا کہ شہر کو زیبائی مل گئی
ناجوسرت..... لیاقت آباد، کراچی
پوچھا جب بھی حال کسی نے، لب پہ نام لگی آئے
اپنے آپ سے جب بھی پوچھا اس دم یاد لگی آئے
محمد حیات خان نیازی..... کوہ مری
پتیل کے کٹورے بھی نہیں اپنے گھروں میں
خیرات میں چاندی کا تقاضا نہ کیا کر
فرخ ندیم..... اسلام آباد
پر جھائیوں کی زندگی سے ہم نکل گئے
چیلی جو تیز دھوپ سائے بھی جل گئے
اشفاق احمد رانا..... بھکر
پرانی بیڑیاں اب اس لیے توڑو کہ زندان میں

اسیروں کو نئی زنجیر پہنانے کا موسم ہے
کوکب درخشاں..... ایف بی ایریا، کراچی
پتھر چلا ہے جسم بھی آنکھوں کے ساتھ ساتھ
وہ ضرب انتظار کی اب کے لگی مجھے
سید ذوالفقار احمد..... ایف بی ایریا، کراچی
چوں کے شک ڈھیر پر جب چاندنی کھلی
اپنے آنکھوں کے ساتھ تیری بات بھی چلی
منظور احمد..... ساہیوال
پلکوں سے گر نہ جائیں یہ موتی سنبھال لو
دنیا کے پاس دیکھنے والی نظر نہیں
اکبر علی شاہد..... ملتان
پھول کو شاخ پر دیکھا تو بہت یاد آیا
حق پرستوں کا صلیبوں پر ترازو ہونا
پروین ماجد شیخی..... بلیر ہاٹ، کراچی
پوچھو نہ ماہر اے ٹم، اُجڑے ہیں اس طرح سے ہم
گھر کا چراغ کیا بجھا، گھر ہی اُجڑ کے رہ گیا
شیخ احمد مقصود..... فیصل آباد
پرائے شہر کے لوگوں سے کیا گلہ راشد
میں اپنے شہر کے لوگوں میں بھی مہاجر تھا
ناصر اوریس..... جڑانوالہ
پہلے دیکھو تو سہمی اپنے کرم کی وسعت
پھر بڑے شوق سے تم میرے خدا ہو جانا
خدا بخش ساگی..... حیدر آباد
چیز پر اب کوئی پھل بھی باقی نہیں رہا
تو کیا کرے گھر راہ کے پتھر سمیٹ کر
بیگم نور العاصح سعید..... لاندھی، کراچی
پھر اس کے بعد پھر جاؤں میں ریت کی صورت
بس اک بار مجھے ٹوٹ کر چاہے کوئی
انیس احمد..... حیدر آباد
پھیلی ہوئی ہے شہر میں غریبانیت کی آگ

تہذیب کے بدن کی قبا کون لے گیا
وحید احمد غوری..... حیدر آباد
پچھلے برس تو کھیت مرے جل جلا گئے
اب کے برس میں فصل وفا بوئیں سکا
رفیع امین قریشی..... اعلین (ابوظہبی)
پھل پڑوسی کے درختوں پہ نہ کہتے تو وہیم
میرے آنگن یہ پتھر بھی نہ آئے ہوتے
اسد عامر..... لاندھی، کراچی
پرورش خوف کے ماحول میں ہوگی جس کی
اپنی پرچھائیں بھی دیکھے گا تو ڈر جائے گا
نانکھ..... شاہنواز بھٹو کالونی، کراچی
پھل نہیں دے گا نہ دے، سایا تو دے گا مجھ کو
پیڑ بوڑھا ہی سہی، گھر میں لگا رہنے دو
عالیہ حسین..... لاندھی، کراچی
پست ہیں فکر و نظر ذہن و خرد دل و دماغ
چاند پر جا کے بھی انسان کو بلندی نہ ملی
مقبول احمد..... میانوالی
پھول بننے کی خوشی میں مسکرائی تھی کلی
کیا خبر تھی یہ تغیر موت کا پیغام ہے
اصغر علی..... حیدر آباد
پھاڑ دیا اپنا دامن تاکہ اسے پھیلا نہ سکوں
بس اتنی سی بات تھی جس سے میں پاگل مشہور ہوا
غلام محمد..... حیدر آباد
پردہ چہرے سے اٹھا، دید کا ساماں کر دے
اپنے جلووں سے تو کافر کو مسلاں کر دے
رضا مصطفیٰ..... حیدر آباد
بڑھ سکو تو پڑھو تحریر مرے چہرے کی
نقش کچھ میری جبین پر بھی ابھر آئے ہیں
خالد محمود خان میرانی..... لیہ
پہلے بھی یاد ہیں اسے پاؤں چھلے ہوئے

شعریں

محمد احمد شہزاد

غزل

ترے آنے کی سرخوشی کے لیے
اک سراپا کی بے خودی کے لیے
اک دوپے کی تسکینی کے لیے
روز و شب فاصلے گھٹاتا ہے
اپنی قامت کو بھی بھلاتا ہے
راہ آسان کیے جاتا ہے
شام ہی سے دے جلاتا ہے
جگنوؤں سا وہ جگمگاتا ہے
ظریف احسن کے گیت گاتا ہے
روز و شب آئینے سجاتا ہے
خوب رنگیں سنوار رکھتا ہے
پورے سولہ سنگھار کرتا ہے
خلوت جاں سنہال رکھتا ہے
ترے آہنگ کے کسلسل میں
مضطرب و رہاب بجاتا ہے
نت نئے گیت گشتاتا ہے
ظریف احسن کو روبرو پا کر
خود کو اکثر وہ بھول جاتا ہے
خوب خلوت مزاج رکھتا ہے

ظریف احسن..... گلستان جوہر

غزل

غم زدہ اس دل کی دعائیں ساتھ لیے جا
اداس چاندنی کی شعائیں ساتھ لیے جا
کریں گی سحر زدہ یہ پھر کسی کے من کو
یہ اپنی ظلمانی ادائیں ساتھ لیے جا
اترے تری آنکھوں میں اداسی کبھی شاید

کبھری ہوئی نر ناک ہوائیں ساتھ لیے جا
اک سوال لیے گھورتی ہیں مجھے سرمئی شامیں
یہ دلکش رنگیں فضا میں ساتھ لیے جا
تری آواز کا آسیب کرے مرا تعاقب
فریب زدہ ساری صدائیں ساتھ لیے جا
پھر کسی من کے خواب نہیں کی ترے پہلو میں
اے جاں ستارا خیال روا میں ساتھ لیے جا
بے چین کرے ندی کنارہ ترے بغیر
ٹھنڈی سر سبز پناہیں ساتھ لیے جا
عصمت اقبال عین..... منگاکینٹ

غزل

چپ چاپ تیرے شہر سے ایسے گزر گئے
دریا کو جیسے دیکھ کے پیاسے گزر گئے
اک بار میں نے راہ پہ کافی تمام رات
پھر یوں ہوا کہ جسم سے رستے گزر گئے
اے نیندائے عشق کی خاموش رہ گزر گئے
کیا لوگ تھے جو ہم سے بھی پہلے گزر گئے
دنیا تیری حیرتیں اپنی جگہ مگر
ہم لوگ تیری سوچ سے آگے گزر گئے
ہم کاروان عشق کے میتم مزاج لوگ
ایسے چلے تھے یاد کہ جاں سے گزر گئے
میش علی آغا

تختہ

بعد امت تمہارے
تحفوں کو دیکھا
تو آنکھ بھڑکی
اور اس دل سے
یہ صدا آئی
کیا ہی اچھا تھا
ان تحفوں کی جگہ ہر مگر

تم اپنے نام پر ہمیں رسوا تو ہونے دو
سید عاشق حسین اداس..... بکیر اشرف
پھر انہی انگڑائیوں میں حشر کے سامان ہوں گے
بزم جاناں میں کوئی آشفقہ سربھی چاہیے
صاحب محمد شاہ..... خندوالہ یار
پاس جب تک وہ رہیں درد تھا رہتا ہے
پھیلتا جاتا ہے پھر آنکھ کے کاجل کی طرح
محمد علی جواد رضا..... لاہور
پاؤں تھک گئے ہیں تو آبلوں کے بن چلنے
جادو محبت میں یہ شکستہ پانی کیا
علی مرتضیٰ..... نواب شاہ
پھیلا ہے اتنا حسن کہ اس کائنات میں
انساں کو بار بار جنم لین چاہیے
محمد فیصل خان..... میانوالی
پلٹ گیا ہے وہ بچے کو خالی ہاتھ لیے
خفی دکا نوں پہ چیزوں کو جب بھی دیکھا ہے
طاہر دہلی بی آسیہ..... میانوالی
برائی محنتیں آؤ کہ بانٹ لیں دونوں
کچھ اس طرح کہ شجر تیرے اور شرمیرے
حبیب حسین فاطمہ خان اجالا..... ساہیوال
گپڑی بھی اس کے سر پہ نہ پرچم تھا ہاتھ میں
وہ دیکھنے میں پھر بھی قد آور لگا مجھے
سید جاوید حیدر شاہ..... راولپنڈی
پکارتے ہو بھلا کس کو رہبری کے لیے
بر ایک گام پہ رہزن دکھائی دیتا ہے
سونیا حیدر..... راولپنڈی
پتھر نہ جائے زندگی، تہذیب رو نہ دے
اتنی بھی ذہیل اے خدا انسان کو نہ دے



اب کی نہ فرش گل پہ بھی ٹپلے گی زندگی
وسیم کیانی..... دینہ جہلم
پیٹ کی مجھوڑیاں فنکار تک بھی آئیں
ورنہ دلبر کی بنا کر بیچتا تصویر کون
رضیہ اسلام..... کراچی
پوچھا کسی نے چاند نکلتا ہے کس طرح
زلفوں کو رخ پہ ڈال کے جھک دیا کہ یوں
مہتاب خان نازی..... حیدر آباد
پہلے چہرے دیکھنے کے حوصلے تقسیم کر
پھر شہر کے لوگوں میں تو آئینے تقسیم کر
نعمان قدیر کھوکھر..... حیدر آباد
پھر سر اٹھا رہے ہیں نئے دور کے بڑے
دنیا کو آج پھر ہے ضرورت حسین کی
پیر محمد..... کوٹری
پھولوں سے دھم کھائے تو کانٹوں سے سی لیے
یہ بھی رفو گری کی انوکھی مثال ہے
طارق تلہور چاچہ..... میانوالی شیخان
پڑا جو زلف کا سایہ جھجک کے ساقی نے
زمیں پہ رکھ دیا ساغر کہ شراب میں ہے سانپ
سعید انصاری..... حیدر آباد
پھر باندھ لی کسی سے اُمید وفا قتل
پھر ایک محل ہواؤں میں تعمیر ہو گیا
منظور نواز..... حیدر آباد
پوچھو نہ آنسو رخساروں سے رنگیں حسن کو بڑھنے دو
سننے ہیں کہ شہنشاہ کے پھولوں کو نکھارا کرتے ہیں
محمد علی خان بارکزی..... حب بلوچستان
پتھر اگر اک دوسرے کا خون ہی پیٹے رہے
کیا اس صورت میں جنگل ہزارہ جاے گا
مسرت بانو..... ملتان ٹی
پھر اپنے سنگ در کی بھی توقیر دیکھنا

ساتھ تمہارا رہتا
زیست کرنے کا تو یار رہتا
مقصود بلوچ..... حیدر آباد

غزل
بے کیف ملاقات پہ انگلی تو اٹھے گی
ان سرد سے جذبات پہ انگلی تو اٹھے گی
ہر بات ہی جب جھوٹ کے سانچوں میں ڈھلی ہو
لازم ہے کہ ہر بات پہ انگلی تو اٹھے گی
تم شب کے فسانے بھی لے پھرتے ہو ہمراہ
پھر یار گئی رات پہ انگلی تو اٹھے گی
آنکھیں مکانوں کی چھتیں اہل مکاں پر
بے وقت کی برسات پہ انگلی تو اٹھے گی
کوئی شخص میری سوچ پہ انگلی نہ اٹھائے
اب ایسے خیالات پہ انگلی تو اٹھے گی
ہر شخص چلا آیا سیاہ کپڑے پہن کر
اس طرز کی بات پہ انگلی تو اٹھے گی
تو ہیک بھی دیتا ہے تو ہاں جھڑکیاں دے کر
واٹا! تیری خیرات پہ انگلی تو اٹھے گی
اس دور کی مصروفیت سے تو حق مانگ رہا ہے
تیرے ان کمالات پہ انگلی تو اٹھے گی
وہ نظریں جھکا لے تو اجالا نہیں رہتا
سورج! تیری اوقات پہ انگلی تو اٹھے گی
گم رہتا ہے تو اپنی اناؤں کے جہاں میں
آکاش! تیری ذات پہ انگلی تو اٹھے گی
سیدا کاش بخاری..... ملتان

غزل
تیرا جب دیدار ہوا ہے
صحرایں بھی گلزار ہوا ہے
اک مدت سے چاہا اس کو
اک مدت سے پیار ہوا ہے

کیوں اپنوں کی محفل میں اب
میرا دل بے زار ہوا ہے
ہونے لگے ہیں گھم کے حصے
والد جب بیمار ہوا ہے
خجھر میرے سر پہ آئے
بزدل جب سردار ہوا ہے
بات کوئی نہ کہہ پاؤں گا
لجہ اب تکوار ہوا ہے
خواب کبھی نہ ٹوٹے اب کے
دلی بے دار ہوا ہے

شاہ روم خان دلی
بستی
دکھ دے کے جدا نہ ہونا
یوں مجھ سے خفا نہ ہونا
آنکھوں میں امید کے جگنو
سارے خواب جلا نہ دینا
اک بار مگر کہہ دینا
کوئی ایس ایس ایس نہ کرنا
کوئی کال کبھی نہ کرنا
ملنے کی نہ کوشش کرنا
ہاں خط بھی کبھی نہ لکھنا
تو خود پر جبر کربلوں کا
ہاں جاں صبر کربلوں کا
مانا کہ بہت ہے مشکل
اک چھوٹی سی ہے بستی
ہاں میرے دل کی بستی
اچانک نہ اجاڑ دینا
تم بغیر سب بتائے
میری جان چلے نہ جانا
میری جان چلی جائے گی

تیری یاد بہت آئے گی
دیکھ اس طرح الوداع نہ ہونا
کبھی بھی یوں جدا نہ ہونا
عبدالملک کیف..... ڈھرکی
غزل

تیرا حسن آنکھیں تیرا جمال آنکھیں
کبھی خوش آنکھیں کبھی لال آنکھیں
کسی صحران کی طرح پھیلی ہوئی
وہ غزل چمکیں وہ غزال آنکھیں
ترسیں دیدار یار کو اے دوست!
اک صدی نظریں سو سال آنکھیں
انتظار ہو تیرا اے زندگی مری!
سو جائیں کیا مجال آنکھیں
فقط اس کے سوا میرا اثاثہ
بے جان دل پاہل آنکھیں
اے بہارا اب کھلنے دے پھول
تمنا کرتی رہیں سارا سال آنکھیں
دریچہ نظر میں آتا ہے کب اسے
پوچھتی ہیں کیف یہ سوال آنکھیں
احمد علی کیف..... منجھن آباد

غزل
رات کو جب بھی مہتاب دیکھا تھا
میں نے تیرا ہی پھر خواب دیکھا تھا
تجھے دیکھا تو یہ محسوس ہوا مجھ کو
جیسے پھر ایک آفتاب دیکھا تھا
اپنی اوقات مجھ کو یاد دلا دی
جب بھی کوئی حباب دیکھا تھا
مجھ سے نہ پوچھ پھر غم زندگی ہے کیا
جیسے عمر بھر کوئی عذاب دیکھا تھا
یوں ہی تو یہ شب نہیں ملی جاوید

غم بھی تو زمانے میں بے حساب دیکھا تھا
محمد اسلم جاوید..... فیصل آباد
غزل

میری یادوں میں رہتے ہو تم
دل کے آئین میں بیٹے ہو تم
اپنی سوچیں مثبت رکھو
کیوں دوسروں سے چلتے ہو تم
اچھے کام پہ رشک کرو تم
جذبہ صادق مگر رکھتے ہو تم
بے خبری ہے چیز زالی
بے خبری سے بچتے ہو تم
سفر حیات ہے گر چہ مشکل
کیوں اس بات سے ڈرتے ہو تم
چینا مشکل ہوگا عاطر
جھمیلوں میں کیوں پڑتے ہو تم
محمد عبداللہ عاطر..... منجھن آباد

تعلق بے نام ہے تو
ہمارے تعلق بے نام ہے تو
کیوں ہریں میرا دل دھڑکنے سے
کیوں میری آنکھوں کے گوشے
تمہیں نہ دیکھیں تو جھجک جاتے ہیں
کیوں میری ساتھیوں تیرے لہجے کی کھنک
کے لیے
بے تاب رہتی ہیں
کیوں میں تمہیں ہر چہرے میں
تلاش ہوں
کیوں میری روح میں بے یقینی نہیں اترتی
اگر تمہارے میرے تعلق بے نام ہے
تو
کیوں مجھے تمہاری آس ہے

اصل تو مالک کائنات کی رحمت ہوئی ان تینوں پر۔ حج ہے جسے اللہ رکھے اسے کون چمکے!

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی ... راولپنڈی معلومات

☆ اولمپک کھیلوں کے چھنڈے پر پانچ دائرے ہوتے ہیں۔

☆ دنیا کا سب سے چھوٹا مسلمان ملک مالدیپ ہے۔

☆ زمبابوے کا پرانا نام جنوبی رھوڈیشیا ہے۔

☆ مرزا واجد حسین مشہور شاعر ریگانہ جٹیزی کی اصل نام ہے۔

☆ بریڈ فورڈ برطانیہ کے ایک شہر کا نام ہے

☆ حنا جمیل صوبہ بلوچستان کے صدر مقام کوئٹہ میں واقع ہے۔

☆ پروفیسر ڈاکٹر واجد گنگوئی ... کراچی اسراف

☆ حضرت قیس انصاری فرماتے ہیں کہ میرے بھائیوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے میری شکایت کی کہ ہمارا بھائی بہت اسراف کرتا ہے اور اپنے مال کو بے جا خرچ کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اپنے بارگ میں سے اپنا حصہ لیتا ہوں اور اس حصے کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہوں اور جو مجھ سے ملنے جتنے آتا ہے ان کو بھی کھلاتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر تین بار ارشاد فرمایا کہ ”خرچ کیا کر! اللہ جل شانہ تجھ پر خرچ فرمائے گا۔“ اس کے کچھ عرصہ بعد میں ایک سفر پر گیا تو میرے پاس سواری بھی اپنی تھی اور اپنے سب گھر والوں سے زیادہ ثروت مجھے حاصل تھی یعنی جو لوگ احتیالا کے ساتھ خرچ کرتے تھے ان کے پاس اتنا نہ تھا جتنا مجھ بے دریغ خرچ کرنے والے کے

قصہ احمد

عنان احمد

اللہ کی شان

ایک گھر میں رات کے وقت چور داخل ہوئے۔ اس میں ایک چھوٹا سا خاندان رہتا تھا۔ میاں بیوی اور ایک شیرخوار بچہ۔ تینوں اس وقت سو رہے تھے۔ چور اس کمرے میں آئے تو انہوں نے سوچا کہ کہیں بچہ جاگ نہ اٹھے اور اس کی آواز سے ماں باپ بھی بے دار ہو جائیں۔ لہذا انہوں نے بچے کو چھوڑ دیا۔ سمیت اٹھا اور باہر لا کر گلی میں ایک طرف رکھ دیا۔ اب انہوں نے گھر سے سامان نکالنا شروع کیا۔ جسے وہ گلی میں ایک جگہ اکٹھا کرتے رہے۔ زیادہ دیر بھی نہ لگی کہ سامان کون سا اتنا زیادہ تھا۔ جب سارا سامان باہر لے گئے تو آخری مرتبہ یہ دیکھنے کے لیے مکان کے اندر گئے کہ کوئی بچی چیز تو نہیں رہ گئی۔ اس وقت سوئی ہوئی ماں کی آنکھ کھل گئی۔ ماں نے جب بچے کو نہ پایا تو فوراً اپنے شوہر کو دنگایا۔ دونوں کھبرا کر اٹھے۔ مکان کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ اس لیے وہ دوسرے کمرے میں نہیں گئے بلکہ باہر کی طرف دوڑے۔ چور دوسرے کمرے میں تھے۔ باہر گلی میں آ کر ماں اور باپ نے دیکھا کہ ان کا جگر گوشہ اطمینان سے اپنے پگھلے ہوئے میں سو رہا ہے۔ عین اس وقت قدرت خدا کی کہ پورا مکان دھڑام سے چوروں کے لوہا پڑا۔ گھر کے تینوں رہنے والے باہر گلی میں تھے اور ان کا سامان بھی باہر رکھا تھا اور چور ہلاک ہو چکے تھے۔ اس سب کچھ دیکھتے ہوئے حیران ہو رہے تھے کہ ان کے بچے اور اس سارے سامان کو لا کر باہر کس نے رکھا ہے۔ صبح جب ملے اٹھایا گیا تو چوروں کی لاشیں ملیں تب معلوم ہوا کہ ان تینوں کی جان اور مال بچانے کا یہ سارا بندہ بستی کس نے کیا تھا۔

رفتہ رفتہ ہوا خاموشی کا اثر شام تنہائی میں شام تنہائی میں اس کو شدت سے میں سوچتا ہوں ادھر مجھ کو شدت سے وہ سوچتا ہے ادھر شام تنہائی میں وحشت جسم و جاں سوچے تو ذرا کسی ہوگی یہاں جب جوانی کے دن ہو رہے ہیں بس شام تنہائی میں دن کی رونق لیے محفل دوستانہ چٹنی انجام کو دید صاحب اب اٹھو چلو اپنے گھر شام تنہائی میں انتخاب: صابرہ کلثوم صابرہ لگاؤ ... خانہ نوال

میں سمندر میں گرا اک کا سہ ہوں مگر بوند بوند کا پیاسہ ہوں میری آنکھیں ستارے چومکتی ہیں میرا چہرہ چاند جھلکتا ہے میں تن کا ایک گنداسہ ہوں مگر بوند بوند کا پیاسہ ہوں میں اپنے آپ میں رہتا ہوں میں کب کسی کی سہتا ہوں میں اندر سے بھی باہر جیسا ہوں مگر بوند بوند کا پیاسہ ہوں والدین کی امیدیں مجھ سے ہیں پیادوں کی خوشیاں مجھ سے ہیں میں کہیں پہ ہوں سیر تو کہیں ماسہ ہوں مگر میں بوند بوند کا پیاسہ ہوں میں خوابوں کا شہزادہ ہوں میں عاشق معشوق کا وعدہ ہوں میں محبت کا دلا سہ ہوں مگر بوند بوند کا پیاسہ ہوں (اللہ دست عابد ... محمد پور سنساراں)



کیوں اپنی وفائیں یقین ہے

ریحانہ سعیدہ ... لاہور

غزل

ہے بکھرنے کو یہ محفل رنگ و بو تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے ہر طرف ہو رہی ہے یہی گفتگو تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے ہر مترق نفس نذر آہنگ کی ہم کو یادیں ہوں تھی بہت رنگ کی گل زمیں سے اٹھنے کو ہے اب ابو تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے کوئی حاصل نہ تھا آرزو کا مگر سانچہ یہ ہے اب آرزو بھی نہیں وقت کی اس مسافت میں ہے آرزو تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے کس قدر دور سے لوٹ کر آئے ہیں یوں کہو عمر برباد کر آئے ہیں تھا سراپ اپنا سرمایہ جتنو تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے اک جنوں تھا کہ آباد ہو شہر جاں اور آباد جب شہر جاں ہو گیا ہیں یہ سرگوشیاں در بہ در گو بہ گو تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے

چوہدری صوفی نورالہی ... لاہور

غزل

پھول مرجھا گئے جب ہوئے بام و در شام تنہائی میں ماند پڑنے لگے غلیوں کے بھی پر شام تنہائی میں خال و خد میں تیرے ایسے کھوئے ہیں ہم اتنا روئے ہیں ہم اپنے انوال سے ہو گئے بے خبر شام تنہائی میں گاہے گاہے تری دھیمی سرگوشیاں مجھ کو آنے لگیں



ایک قصہ

فاطمہ حسام

ایک فطن وکیل کا قصہ وہ قانونی جنگ کا ماہر تھا لیکن حالات نے اسے اس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا کہ قانون دان ہونے کے باوجود غیر قانونی حربے استعمال کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔
پسری جذبات سے مغلوب ایک سرمایہ دار کا احوال وہ اپنی بیٹی کو ایک اداکار کی محبت کے جال سے نکالنا چاہتا تھا۔

نئے اقدار کے ہاؤس کارمین کے لیے ایک دلچسپ ہاؤس

چھٹی جس نے بڑے واضح انداز میں مجھے باور کرا دیا تھا کہ کوئی شخص میرے تعاقب میں ہے۔ میں نے فوری طور پر چھٹا انداز میں اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا لیکن سردست کسی متعاقب کو پوائنٹ آؤٹ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

میں اس وقت ایک شاپنگ مال سے باہر نکلا تھا۔ مذکورہ شاپنگ مال میرے گھر کے راستے میں پڑتا تھا۔ مجھے اپنے ذاتی استعمال کے لیے ایک سوٹ کیس خریدنا تھا۔ لہذا دفتر سے گھر جاتے ہوئے میں شاپنگ مال میں گھس گیا تھا۔ براؤن سوٹ کیس کی خریداری کے بعد میں جیسے ہی مڑا اسی لمحے مجھے اپنے تعاقب کا احساس ہوا۔ مال میں میرے علاوہ بھی درجنوں افراد موجود تھے۔ جو مختلف اشیاء کی خریداری کے لیے وہاں آئے ہوئے تھے۔ اس بھیڑ میں مبینہ تعاقب شخص کو ڈھونڈنا ناہمت مشکل کام تھا۔ لہذا میں چھٹی جس کی پکار کو نظر انداز کر کے مال سے باہر آ گیا اور سب قدموں سے اپنی گاڑی کی سمت بڑھنے لگا جو مال کے باہر سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔

جب میں اس شاپنگ مال میں داخل ہوا تھا تو میرے ہاتھ میں سیاہ بریف کیس تھا جواب براؤن سوٹ کیس کے پیٹ میں جا چکا تھا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ جب میں نے براؤن سوٹ کیس منتخب کر لیا تو میلز

میں نے ایک لٹل سیلز مین کی بات پر غور کیا اور اس کی تجویز میرے دل کو گئی۔ اس طرح میں با آسانی ایک ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھا سکتا تھا اور میرا سیاہ بریف کیس بھی اس سوٹ کیس کے ساتھ گھر پہنچ جاتا۔
”کہہ دو تھیک ہی رہے ہو۔۔۔۔۔!“ میں نے تعریفی نظر سے سیلز مین کی جانب دیکھا۔ ”تھیک ہے تم اپنی تجویز کو عملی جامہ پہناؤ۔“
سیلز مین نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی تھی۔
میں وہ سوٹ کیس لم بریف کیس اٹھائے اپنی گاڑی کے قریب پہنچا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے قبل میں نے چونکا نظر سے قرب جوار کا جائزہ لیا اور ڈرائیونگ سیٹ سنہیال لی۔ اگلے ہی لمحے پیش آنے والی صورت حال نے مجھے چونکا کر رکھ دیا۔

میرے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے ہی پہنچ کر سیٹ والا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور ایک چاقو بند شخص کسی چھلاوے کی مانند لپک کر گاڑی کے اندر پہنچ

گیا۔ ان واحد میں اس شخص نے اپنی سائیکل کا دروازہ
روڑے بند کر دیا۔
”کون ہو تم؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔
اس شخص کی آمد سے میرے ذہن میں پہلا خیال
یہی پیدا ہوا تھا کہ شاید اس کا تعلق گاڑیاں چھیننے
والے کسی گروہ سے ہے لیکن اسے تہہ ذرا دیکھ کر میں نے
اپنے خیال کی خود ہی تردید کر دی کیوں کہ اس قسم کے
جرائم پیشہ لوگ اپنے پاس اسلحہ ضرور رکھتے ہیں اور
ایسی خطرناک کارروائی کے دوران وہ اتنی اسلحہ کی
نمائش کرنے بھی نہیں بھولتے تاکہ سامنے والے پران
کی دھاک بیٹھ جائے۔
میرے سوال کے جواب میں اس شخص نے
بڑے اطمینان سے بتایا۔ ”میرا نام راجو ہے۔“
اس نے ابھی تک کسی قسم کی کوئی ہنگامی کارروائی نہیں
کی تھی۔ لہذا میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے بے خوف
لہجے میں پوچھا۔
”میری گاڑی میں کیوں آ کر بیٹھے ہو؟“
اس نے میرے استفسار کو نظر انداز کرتے ہوئے
تصدیقی انداز میں پوچھا۔ ”آپ کریم ہیں نا؟“
”نہیں۔“ میں نے قطعیت سے نفی میں
گردن ہلائی۔ ”شاید تمہیں میرے بارے میں کوئی
غلط فہمی ہوئی ہے۔ میری گاڑی سے نیچے اترو اور اپنی
راہ پکڑو۔“
”آپ مذاق نہ کریں جی!“ وہ منہ لٹکائی نظریں
سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے
بولی۔ ”آپ کا نام کریم ہی ہے آپ ایک معروف فی
وی آرٹسٹ ہیں۔ آغا صاحب نے مجھے یہی نام بتایا
تھا۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“
راجو نے آخری جملہ اتنے اعتماد کے ساتھ ادا کیا
تھا کہ مجھے اس کا یہ انداز سخت ناگوار گزرا۔ تاہم اپنی

جان کو کوئی فوری خطرہ نہ پا کر میرے جذبہ تجسس کو
تقویت پہنچی اور میں نے اس کے معاملے میں دل
چسپی محسوس کی۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ مجھے اپنے
ساتھ کہاں لے جانے کا ارادہ رکھتا ہے؟ میں اس
سے پوچھنے بنانہ نہ سکا۔
”نیا آغا صاحب کون ہیں؟“
”آغا صاحب میرے پاس ہیں۔“ راجو نے
متحمل لہجے میں جواب دیا۔
”تم مجھے اپنے ساتھ کہاں لے جانا چاہتے ہو؟“
”آغا صاحب کے پاس۔“ اس نے دونوں
الفاظ میں بتایا۔
اسی لمحے مجھے شاپنگ مال والی اپنی چھٹی حس کی
کارروائی یاد آگئی میں نے اپنے خیال کی تصدیق
کے لیے راجو سے پوچھ لیا۔
”کیا اس مال میں تم ہی کسی سایے کی طرح
میرے پیچھے لگے ہوئے تھے؟“
بات ختم کرتے ہی میں نے اپنے پہلو میں واقع
شاپنگ مال کی سمت اشارہ کیا۔
”جی ہاں۔“ اس نے اثبات میں گردن
ہلائی۔ ”آپ کا اندازہ درست ہے۔“
میں نے شاپنگ مال کی طرف جاتے ہوئے اپنی
گاڑی کے تمام دروازے اچھی طرح لاک کر دیے
تھے لیکن چند لمحے پہلے راجو جتنی آسانی سے پنجرہ
سیٹ کا دروازہ کھول کر گاڑی کے اندر پہنچا تھا اس سے
تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ مذکورہ دروازہ لاک نہیں تھا۔
”تم نے پنجرہ سیٹ والا دروازہ کیسے کھولا؟“ میں
نے راجو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
”میں نے تو اپنی گاڑی کے تمام دروازے لاک کر
رکھے تھے؟“
وہ بڑے دہمکات انداز میں مسکرایا پھر فخریہ لہجے

میں بولا۔ ”یہ چھوٹے موٹے کام میرے لیے کوئی
اہمیت نہیں رکھتے۔“
اس کے جواب پر مجھے غصہ تو بہت آیا مگر میں ضبط
کر گیا اور معتدل انداز میں ایک نہایت ہی اہم سوال
کیا۔ ”تمہارے آغا صاحب کو مجھ سے ایسا کون سا
ضروری کام پڑ گیا جو اس سنگینی خیر انداز میں مجھے اغوا
کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“
”آپ تو کسی ویل کی طرح جرح کر رہے
ہیں۔“ وہ مزاح ہوتے ہوئے بولا۔
میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے
کہا۔ ”میں وکیل ہوں اس لیے جرح بھی کروں گا۔“
”آپ غلط کہہ رہے ہیں۔“ وہ بے یقینی سے مجھے
دیکھتے ہوئے بولا۔
”تم نہیں جانتے مگر یہ حقیقت ہے کہ میں ایک
وکیل ہوں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے
ہوئے کہا۔ ”دکالت میرا پیشہ بھی ہے اور شوق بھی۔“
راجو اغوا کی کوشش میں میری گاڑی میں گھسا تھا
لیکن وہ ادب و آداب سے گفتگو کر رہا تھا اس سے
مجھے کسی قسم کا ذرہ خوف محسوس نہیں ہوا بلکہ اس سے ملکی
پھلکی چھیڑ چھاڑ میں مجھے تفریح حاصل ہو رہی تھی۔
”آغا صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔“ وہ گہری نظر
سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔
”آپ کمال کے اداکار ہیں۔ آپ ایک وکیل کی
کتنی اچھی اداکاری کر رہے ہیں۔“
”تمہارا اور تمہارے آغا صاحب کا دماغ خراب
ہو گیا ہے۔“ میں نے جھٹکنا بہت بھرے لہجے میں کہا۔
”اترو ہماری گاڑی سے ان فضول ذراموں کے لیے
میرے پاس فائو وقت نہیں ہے۔“
میں نے اس کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے
مصنوعی درشتی کا مظاہرہ کیا تو وہ اسے میرا اصلی جارحانہ

عمل سمجھا۔ وہ بری طرح چونکا اور اگلے ہی لمحے اس
نے میری انداز میں ہاتھ گھما کر اپنے لباس میں سے
ایک پستل برآمد کر لیا اور اس پستل کی نال کو میری
پستلی کی جانب سیدھا کرتے ہوئے غراہٹ آمیز
لہجے میں بولا۔
”آپ وکیل ہو یا ٹی وی آرٹسٹ یہ سب آغا
صاحب کو جا کر بتانا۔“ وہ پلک جھپکتے میں انتہائی بے
مروت ہو گیا تھا۔ وند اسکرین کے باہر اشارہ کرتے
ہوئے اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔
”وہ جو سامنے نیلی گاڑی کھڑی ہے نا اس کے
پیچھے پیچھے چلنا ہے۔ اب وقت ضائع کیے بغیر گاڑی
اشارت کرو۔ دیکھو نیلی گاڑی حرکت میں آ چکی ہے۔“
اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ مذکورہ نیلی گاڑی واقعی
حرکت میں آ گئی تھی۔ میں نے راجو سے دریافت
کیا۔ ”اگر میں تمہارے ساتھ جانے سے انکار
کر دوں تو؟“
”تو پھر مجھے اس منے سے کام لینا ہوگا۔“ وہ ہاتھ
میں پکڑے ہوئے پستل کو خطرناک انداز میں حرکت
دیتے ہوئے بولا۔
میں نے سینکڑوں کے دس دس حصے میں فیصلہ کر لیا
کہ تقاضائے عقل مندی کو نبھاتے ہوئے مجھے فی
الحال راجو کی بات پر عمل کرنا چاہیے۔ باقی باتیں بعد
میں سوچی جائیں گی۔ چنانچہ میں نے اپنی گاڑی
اشارت کر کے نیلی گاڑی کے پیچھے ڈال دی۔
راجو اپنی وضع قطع اور طبع سے ایک چھٹا ہوا غذا
نظر آتا تھا۔ اس کے انداز اور آواز میں بھی ایک خاص
نوعیت کی گھٹن تھی۔ ایسے لوگ اپنے مقصد کے
حصول کی خاطر کوئی بھی خطرناک قدم اٹھانے میں
دیر نہیں کرتے۔ ہرے درمیان ویسے بھی فاصلہ
بہت کم تھا۔ اگر میری کسی مہم جوئی کے نتیجے میں وہ فائر

باتیں شو بہ ہی کی کر رہے ہو۔ نہیں کریم۔“ وہ بڑے یقینی لہجے میں بولا۔ ”تم مجھے کسی بھی قیمت پر چکر نہیں دے سکتے۔ میں نے آغا صاحب کے مطلوبہ بندے پر ہی ہاتھ ڈالا ہے۔“ ”واللہ کے بندے! تمہیں پتا ہی نہیں کہ وکالت کا پیشہ اداکاری سے بھی دس ہاتھ آگے کی چیز ہے۔“ میں نے بڑبڑی سے کہا۔ ”عدالت کے کمرے میں جو جو داؤ بیچ اور خیل مٹا شے دکھانے پڑتے ہیں تم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ میری اس جارحانہ وضاحت کے جواب میں اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ بڑے معنی خیز انداز میں وہ اپنے سر کو ٹی میں جنٹن دیتا چلا گیا۔ جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ آپ کچھ بھی کہہ لو لیکن تم ٹی وی آرٹسٹ کریم ہی ہو!

ہم نیلی کار کا پیچھا پکڑے مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے ایک پوٹ علاقے میں داخل ہو گئے۔ وہاں کے تمام بنگلے پیش قیمت اور ایک سے بڑھ کر ایک عالی شان تھے۔ ایسے ہی ایک پر شکوہ بنگلے نے نیلی گاڑی کو نگل لیا تو راجو نے ہدایت جاری کرنے والے انداز میں مجھ سے کہا۔

”کریم! کسی گڑ بڑ کا خیال بھی دل میں نہ لانا ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ میں تمہیں زندہ اور ہاتھ پاؤں سے سلامت آغا صاحب کے پاس پہنچانا چاہتا ہوں۔ اس لیے۔۔۔!“ لہجائی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”اس لیے تم بھی شرافت کے ساتھ اپنی گاڑی کو اسی بنگلے کے اندر لے جاؤ۔ جہاں نیلی گاڑی داخل ہوئی ہے۔“

”ان ہنگامی احکامات کی ضرورت نہیں راجو۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

بڑے عطا اور تیار انداز میں تھام رکھی تھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ادھر میں نے کوئی ”کارکردگی“ دکھانے کی کوشش کی۔ ادھر اس نے ”ٹھامیں“ سے فائر کر دیا۔ وہ اس حوالے سے بڑا چونکا بیٹھا تھا۔ راجو کے اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ لڑائی بھڑائی کا ماہر ایک پیشہ ور غنڈا ہے۔ ویسے کسی قسم کی ایلیٹسٹی دکھانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

چند لمحات کی خاموشی کے بعد میں نے ایک مرتبہ پھر اسے مخاطب کیا اور یہ دستور دوستانہ انداز میں پوچھا۔ ”راجو ابھی تک تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟“

میں کسی بھی حوالے سے راجو کو غصہ یا طیش نہیں دلانا چاہتا تھا جی میرا رویہ بڑا نرم تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مستنصر ہوا۔

”کون سا سوال؟“

”یہی کہ خرتہمارے پاس کو مجھ سے کام کیا ہے؟“

”کام تو تمہیں پاس ہی بتائیں گے۔“ وہ ہنسیکے لہجے میں بولا۔ ”ویسے میں اتنا جانتا ہوں کہ پاس تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ تم نے ان کا دن کا سون اور رات کی نیند خراب کر دی ہے۔“

”وڈر فل راجو۔۔۔۔۔۔ وڈر فل۔۔۔۔۔۔!“ میں نے ڈرامائی رنگ پر تو جو مرکوز رکھتے ہوئے بڑے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ ”سیا زبردست اسٹوری ہے یا راجو ایک ایسا حیرت انگیز پلاٹ جس کا مرکزی کردار اپنے کردار سے واقف نہیں۔ اس آرٹسٹ کو زبردستی چھوٹن میں فٹ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“

”دیکھا۔۔۔۔۔۔! آخر تم کھل ہی گئے تے!“ وہ تنبیہی نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تھوڑی دیر پہلے تم کہہ رہے تھے کہ ٹی وی یا اداکاری سے تمہارا دور دور کا تعلق واسطہ نہیں اور اب سادگی

میں نے نرم لہجے میں استفسار کیا۔ ”یار! یہ تو بتا دو کہ تمہارے پاس کو مجھ سے کام کیا ہے۔ ایک منٹ کے لیے میں فرض کر لیتا ہوں کہ میں وہی ٹی وی آرٹسٹ ہوں جس کی تمہارے پاس کو طلب ہے؟“

”اس میں فرض کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔“ وہ دو ٹوک انداز میں بولا۔

”میں نے خود تمہیں ٹی وی ڈراموں میں کام کرتے ہوئے دیکھا۔ میری آنکھیں ہلکا نہیں کھا سکتیں اور یہ دیکھو تمہاری تصویر۔ یہ آغا صاحب نے تمہارے تعاقب کے لیے مجھے دی تھی۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک پوسٹ کارڈ ساز کی تصویر نکال کر مجھے دکھائی۔ یہ درحقیقت ٹی وی آرٹسٹ کریم کی تصویر تھی جو مجھ سے گہری مشابہت رکھتا تھا۔ اگر مجھے اس راز کا پتا نہ ہوتا تو میں یہی سمجھتا کہ وہ کسی موقع پر پھینچی گئی میری ہی تصویر ہے۔

”میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں اور تمہارے پاس کو ایک زبردست دھوکا ہوا ہے۔“ میں نے اعتماد میں ڈوبے ہوئے لہجے کہا۔ ”میں ٹی وی آرٹسٹ کریم نہیں بلکہ شریک ایڈوکیٹ ہوں بہر حال۔۔۔۔۔۔!“ میں نے لہجائی توقف کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم مجھے اپنے پاس کے پاس پہنچاؤ۔ میں خود اس سے بات کر کے صورت حال واضح کروں گا۔“

وہ مجھے ایسی نظر سے دیکھنے لگا جیسے اداکار کریم سنجیدہ اداکاری کر کے اسے ایوانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے ذہن کی الجھن آنکھوں اور چہرے سے عیاں تھی۔ میرے دیکھنا تعارف نے اسے گڑ بڑادیا تھا تاہم اس گڑ بڑاہٹ کے اثرات پہل والے ہاتھ تک نہیں پہنچے پائے تھے۔ گن ابھی تک اس نے

کر دیتا تو مجھے شدید قسم کا نقصان پہنچنے کے روشن امکانات تھے اور میں اس قسم کا کوئی رنگ لینے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ رات کا وقت تھا میں اپنے آفس سے اٹھ کر گھر جا رہا تھا کہ اس چوہن میں پھنس گیا تھا۔ اگلے روز چٹھی کا دن تھا اور مجھے عدالت یا دفتر کسی کام کے لیے نہیں جانا تھا لہذا دماغ کو الجھانے یا پریشان ہونے کے بجائے میں اپنی رضا سے اس ایڈوکیٹ میں شریک ہو گیا تھا۔ میری بیکریٹری فوزیہ نے ایک دو بار مجھ سے کہا تھا کہ میری شکل ایک ٹی وی آرٹسٹ سے بہت متبی ہے لیکن میں نے فوزیہ کے اس انکشاف کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کا بنیادی سبب یہی تھا کہ مجھے ٹی وی وغیرہ دیکھنے کا زیادہ شوق نہیں رہا تھا۔ میرا پیشہ جتنے زیادہ کام کا تقاضا کرتا ہے اس کے بعد اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ تک کر ٹی وی کے سامنے بیٹھا جائے۔

زیادہ سے زیادہ وہ ہوا تو صبح رات خبر نامہ دیکھ لیا۔ اس رات مجھے گھر جانے کی جلدی بھی اور نہ ہی اور کوئی مسئلہ تھا چنانچہ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ دیکھتے ہیں راجو کے پاس آغا صاحب کو مجھ سے میرا مطلب ہے مجھ سے مشابہت رکھنے والے اس ٹی وی آرٹسٹ سے کیا کام تھا۔ جس کے مقالے میں مجھے اغوا کیا جا رہا تھا۔ ویسے ایک بات کا مجھے یقین تھا کہ اس دل چسپ اغوا کے پیچھے کوئی نہایت ہی سنسنی خیز اسٹوری ہوگی۔

گاڑی کی اندرونی فضا کو قدرے خوش گوار بنانے کے لیے میں نے دوستانہ انداز میں راجو سے پوچھا۔

”تمہارا پاس آغا جتا کہاں ہے؟“

”وہ نیلی گاڑی ہمیں جہاں پہنچائے گی پاس دیں رہتے ہیں۔“ وہ وڈر اسکرین کے باہر اشارہ کرتے ہوئے رکھائی سے بولا۔

کوئی تقاضا ہوتا ہے۔“
”کیا آپ آغا صاحب ہیں؟“ میں نے انگلی سے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔
”آغا جمال!“ وہ بڑی رعوت سے بولا۔
”آغا صاحب!“ میں نے طنز یہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”اخلاقیات کی باتیں آپ کی زبان پر زیب نہیں دیتیں۔ آپ کے بھیجے ہوئے لفظ کے جس طرح کن پوائنٹ پر رکھ کر مجھے یہاں پہنچایا ہے وہ اخلاق اور شرافت کے محیط سے بہت باہر ہے اور پھر.....!“ میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
”آپ اس کمرے میں داخل ہوئے اور بغیر کسی سلام دعا کے مجھ پر چڑھائی کر دی۔ یہ رو بہ بھلا کون سی اخلاقیات کے زمرے میں آتا ہے۔ لگے ہاتھوں یہ بھی بتاتے چلیں کہ آپ میری کون سی شہرت اور مقبولیت کا حوالہ دے رہے ہیں۔ جس نے آپ کی دانست میں میرا دماغ کر دیا ہے؟“
”شوہر کی شہرت اور کون سی شہرت؟“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔
”میرا خیال ہے کہ دماغ آپ کا خراب ہوا ہے آغا صاحب!“ تلخ لہجہ اختیار کرنے کے باوجود بھی میں نے اپنی بات چیت میں آغا جمال کے لیے ایک لحاظ قائم رکھا تھا جس بھی شخص آغا پکارنے کے بجائے اسے آغا صاحب کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میری بات پر وہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔
”مطلب بہت سیدھا اور آسان ہے آغا صاحب!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
”آپ اور آپ کا بھیجا ہوا غنڈا راجو مجھے ایک لی وی آرٹسٹ کریم بھجتا ہے جب کہ میرا رنگ و نور کی اس

میں دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ ایک سے زیادہ افراد تھے کم از کم دو.....!“
اگلے ہی لمحے میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ کھلے ہوئے دروازے میں راجو ایک پستہ قامت شخص کے ساتھ نمودار ہوا۔ راجو کے آداب اور انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ فربہ اور پستہ قامت شخص اس کا پاس آتا ہے۔
اس پستہ قامت گورے چنے شخص کی عمر ساٹھ کے آس پاس نظر آتی تھی۔ اس نے متناسب سی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور سر کا سامنے والا حصہ بالوں سے عاری دکھائی دیتا تھا۔ اس نے نفیس فریم کا حامل نظریہ کا چشمہ بھی لگا رکھا تھا۔ اس کا مجموعی تاثر ایک سخت گیر شخص کا تھا۔
متوقع آغا کمرے کے اندر داخل ہوا اور اسی کے اشارے پر راجو دروازے کے باہر ہی رک گیا۔ میں نے آغا کے استقبال کے لیے اپنی جگہ سے اٹھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ جن سنسنی خیز حالات میں مجھے گھیر کر اس بنگلے میں پہنچایا گیا تھا۔ اس کے رد عمل کے طور پر میں اپنے دل میں آغا یا اس کے نمک خواروں کے لیے نیک جذبات نہیں رکھتا تھا۔ بظاہر میں نے اس دل چسپ کھیل کا حصہ بننا تو قبول کر لیا تھا لیکن اس رویے کے نتیجے میں ملنے والی کوفت اور براہی اپنی جگہ موجود تھی۔
وہ فربہ گور اپنا اور پستہ قد شخص مستعد قدموں سے چلتے ہوئے میرے قریب پہنچا اور پھر سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ناپسندیدہ لہجے میں بولا۔
”لگتا ہے شہرت اور مقبولیت نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ تمہیں اتنی بھی توفیق بلکہ تیز نہیں کہ جب کوئی بڑا کمرے میں داخل ہوتا ہے تو اس کے سامنے پھیل کر بیٹھنے نہیں دیتے۔ اخلاقیات کا بھی

”اگر میرا گڑ بڑ کا ارادہ ہوتا تو میں یوں آسانی سے تمہارے ساتھ نہ چلا آتا۔“
اس نے یقینی اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مجھے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میں نے گاڑی کو بنگلے کے اندر داخل کرتے ہوئے کہا۔
”گن کو واپس رکھ لو میں تمہیں اس کے استعمال کی زحمت نہیں دوں گا۔“
چند لمحات کے تذبذب کے بعد اس نے داخل ہٹا لیا۔
میں گاڑی سے نیچے اتر اور براؤن سوٹ کیس کو ہچکلی سیٹ سے اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس سوٹ کیس کے اندر میرا سیاہ بریف کیس تھا جس میں میرے نہایت ہی قیمتی اور ضروری کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا آگے کیا حالات پیش آنے والے تھے۔ لہذا میں بریف / سوٹ کیس کو گاڑی میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔
میں راجو کی راہ نمائی میں چلتے ہوئے بنگلے کے اندر دنی جے میں پہنچا پھر اس نے مجھے گن پوائنٹ پر آگے رکھتے ہوئے بنگلے کے ہیسمٹ میں داخل ہونے کی ہدایت کی۔ میں چپ چاپ زینے کی ریبلنگ تھام کر بنگلے کے تہ خانے میں اترنے لگا۔ براؤن سوٹ کیس ہنوز میرے ہاتھ میں تھا۔
راجو نے مجھے اس بنگلے کے تہ خانے کے ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا جو بے یک وقت بیڈروم اور ڈرائنگ روم کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ وہ ایک صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولا۔
”آپ ادھر بیٹھو میں آغا صاحب کو تمہارے بارے میں بتاتا ہوں۔“
میں نے نہایت ہی پرسکون انداز میں راجو کے حکم کی تعمیل کی۔ اپنے سوٹ کیس کو ایک سائیڈ ٹیبل پر

رکھنے کے بعد میں صوفے پر براجمان ہو گیا۔ راجو مجھے بٹھانے کے بعد کمرے سے نکل گیا۔ اس نے تہ خانے والے کمرے کا دروازہ بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کے انداز سے جھلکتا اعتماد بتاتا تھا کہ اگر میں چاہوں بھی تو اس بنگلے سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کر سکتا۔ یقیناً اس بنگلے میں راجو اس کے پاس آغا صاحب کے علاوہ بھی کچھ لوگ موجود ہوں گے جن میں غالب اکثریت سکیورٹی گارڈز وغیرہ ہی کی متوقع تھی۔
میں جس نیلی گاڑی کی دم پکڑ کر اس بنگلے تک پہنچا اس میں بھی یقیناً ایک سے زیادہ افراد سوار ہوں گے لیکن میں ان کی تعداد کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ وہ اندھے شیوشوں والی گاڑی تھی۔ ٹنڈ گاڑی کا انتہائی اسی لیے کیا گیا تھا کہ اندر موجود افراد کو کوئی باہر سے دیکھ نہ پائے۔
جب انسان کی چیز کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا ذہن مختلف قسم کی تشویشات اور خطرات میں گھرا ہوتا ہے۔ اسے خدشہ ہوتا ہے کہ اگر اس کا معاملہ لوگوں کی نظر میں آ گیا تو اس کے لیے مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ گویا وہ مشکلات سے بچنے یا پہلے سے موجود مشکلات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے یہ راہ اختیار کرتا ہے اور دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ عموماً ایسا اس وقت کیا جاتا ہے جب پوشیدہ رکھنے والا معاملہ کسی جرم کے زمرے میں آتا ہو۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ نیلی گاڑی اور اس کے اندر موجود افراد کی نہ کسی حوالے سے جرم میں ملوث تھے۔
میں یہ تمام تر سوچتے ہوئے تنقیدی نظر سے اس کمرے کا جائزہ بھی لے رہا تھا جہاں اس وقت میں بیٹھا ہوا تھا۔ چند لمحات کے بعد کھلے ہوئے دروازے کے باہر قدموں کی تحسوس چاپ اُبھری۔ مجھے یہ سمجھنے

نظر سے مجھے گھورتا بھی جا رہا تھا۔ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ مجھے کریم سمجھ رہا تھا۔ کسی ٹی وی آرٹسٹ سے میری مشابہت نے بہت دل چسپ اور سنسنی خیز کھیل شروع کر دیا تھا۔ میں نے کھکار کر گٹھا صاف کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے آپ کا اور آپ کی بیٹی فریال کا معاملہ تو میں بعد میں دیکھوں گا پہلے آپ پر یہ واضح کر دوں کہ میں ٹی وی آرٹسٹ کریم نہیں بلکہ ایک معروف وکیل شریک ہوں۔ سنی کورٹ میرے لیے ایک میدان جنگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ سنی کورٹ کے قریب ایک کثیر المنزلی عمارت میں میرا ویلڈ ٹیکو بیڈ آگس ہے۔ میں یہ ساری باتیں زبانی کھائی نہیں کر رہا بلکہ انہیں ثابت بھی کر سکتا ہوں اور.....!“ میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور میں ساری وضاحت اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ میں سمجھ رہا ہوں آپ ایک مغالطے ایک غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ کریم کی صورت بڑی حد تک مجھ سے ملتی جلتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کریم نہیں ہو سکتا اور کریم شریک نہیں بن سکتا۔ اگر اب بھی میری بات آپ کی سمجھ میں نہ آئی تو مجھ پر مجبوراً مجھے آپ پر اغوا کا مقدمہ کرنا پڑے گا۔ شریک ایڈوکیٹ کا غوا۔“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تاہم مضبوط لہجے میں بولا۔ ”مجھے تمہارے سلسلے میں کوئی غلطی یا دھوکا نہیں ہوا ہے لیکن پھر بھی میں تمہارے بیان کو چیک ضرور کروں گا۔ ذرا پناہ بخشی کارڈ دکھاؤ مجھے۔“

”ایک شناختی کارڈ کیا؟ میں ابھی اور اسی وقت نصف درجن سے زیادہ ایسے کاغذات اور دستاویزات آپ کو دکھا سکتا ہوں۔ جو میرے شریک ہونے کا

مصنوعی دنیا سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ میں ایک حقیقت پسند آدمی ہوں اور دن رات حقیقت کے کھیں کھیلتا رہتا ہوں۔ شریک ایڈوکیٹ۔“

وہ تو لٹے اور ناپے والی گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”راجو نے مجھے بتایا ہے کہ تم خود کو وکیل کہہ رہے ہو لیکن مجھے دھوکا دینا آسان کام نہیں۔ میری آنکھیں غلطی نہیں کر سکتیں۔ تم وہی ٹی وی آرٹسٹ کریم ہو جس نے میرا جینا عذاب کر رکھا ہے۔“

”جب یہ بات مجھے راجو نے بتائی کہ آپ ٹی وی آرٹسٹ کریم کی وجہ سے بہت پریشان ہیں تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میری سمجھ میں نہ آیا کہ ایک ٹی وی آرٹسٹ راجو جیسے غنڈوں کے ہاس آغا صاحب کا سکون کس طرح بر باد کر سکتا ہے۔ میں نے راجو سے اس بارے میں پوچھا بھی لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ جس کے نتیجے میں میرے اندر ایک جھس اٹھا لہذا میں نے راجو کے شمن میں کوئی رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہیں کی اور کسی مزاحمت کے بغیر چپ چاپ شرافت سے یہاں آ گیا ہوں.....!“ میں نے کھائی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ آغا صاحب! آپ ہی مجھے بتائیں کہ یہ کیا چکر ہے۔ اس ٹی وی آرٹسٹ نے آپ کے لیے کون کون سی پریشانیاں کھڑی کر رکھی ہیں؟“

”کوئی ہزاروں نہیں بلکہ صرف ایک فریال کی پریشانی ہے۔“ وہ بے ساختہ بولا۔ پھر جلدی سے شہجائے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم کسی وکیل شریک کا نام اختیار کر کے خود کو نہیں بچا سکتے۔ میں جانتا ہوں میرے مطلوبہ شخص تم ہی ہو۔ اداکار کریم جو میری بیٹی فریال وگراہ کرنے میں مصروف ہے یعنی تم!“

آغا جمال یہ فتویٰ جاری کرتے ہوئے بڑی گہری

پاس پہنچا دیا جائے۔“
”ٹھیک ہے“ آپ کی بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔
”اب اگر آپ کوئی حرج محسوس نہ کریں تو لگے ہاتھوں یہ بھی بتادیں کہ آپ اس ٹی وی آرٹسٹ کریم کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں بڑے ہوئے ہیں۔ آپ نے تھوڑی دیر پہلے کچھ اس قسم کی بات کی تھی کہ وہ بندہ آپ کی بیٹی فریال کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے؟“
اس نے ایک افسردہ سی سانس خارج کی پھر صوفے کے اندر ایزی ہو تے ہوئے بولا۔
”میرا خیال ہے یہ معاملہ آپ سے ڈسکس کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ ایک وکیل ہیں۔ قدرت نے جیسے بھی سہی آپ کو سمجھ تک پہنچا دیا ہے۔ مجھے آپ سے ضرور مشورہ کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے آپ کے بھائے ہوئے کسی آئیڈیا سے میرا مسئلہ حل ہو جائے لیکن اس سے پہلے ایک اور کام زیادہ ضروری ہے۔“ وہ لمعے بھر کے لیے خاموش ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔
”بیک صاحب! جس جارحانہ رویے کے نتیجے میں آپ کو یہاں تک لایا گیا ہے میں اس کے لیے نہ صرف شرمندہ ہوں بلکہ آپ سے بے حد معذرت بھی چاہتا ہوں آپ ابھی اور اسی لمحے میرے مہمان ہیں۔ میں آپ کی خاطر تواضع کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔ پھر بات ہوگی۔“
اس کا مطلب ہے آپ نے مجھے شرم بیک الیڈو کیٹ مان لیا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔
اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ ”آپ کو ایک وکیل تسلیم کیا ہے جسے تو اپنے مسئلے کے سلسلے میں آپ سے مشورہ کرنے جارہا ہوں۔“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”آغا صاحب! میں بہت کاروباری آدمی ہوں۔ آپ کو میری خدمات حاصل کرنے کے لیے ہا قاعدہ فیس ادا کرنا ہوگی اور یہ چونکہ اور نام ہو رہا ہے۔ اس لیے میں آپ سے دینی فیس وصول کروں گا۔“
”ؤن!“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ”میں آپ کو آپ کی مطلوبہ مشورہ فیس ایڈوائس دینے کو تیار ہوں اور اگر اس ٹی وی آرٹسٹ پر کیس وغیرہ چلانے کی ضرورت پیش آئی تو بھی میں وکیل کے سلسلے میں آپ ہی کی خدمات حاصل کروں گا۔ آپ کی فیس کے علاوہ عدالتی اخراجات بھی میرے ہی ذمے ہوں گے۔ آپ اس کے لیے بے فکر ہو جائیں۔“
”میں اتنی آسانی سے کیسے بے فکر ہو جاؤں آغا صاحب!“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”ابھی تو ایک نہایت اہم معاملہ باقی ہے۔“
”کون سا معاملہ وکیل صاحب!“ اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔
میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔
”یہاں تک پہنچانے کے لیے میرے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے۔ میں ان لحاظ میں جس ذہنی اذیت سے گزر رہا ہوں اس کا حساب کون دے گا؟“
”اوہ!“ آغا جمال نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے وکیل کے روپ میں اس کے سامنے کوئی خطرناک بلیک میلر بیٹھا ہو۔ چند لمحات تک وہ جانچنے والی نگاہ سے میرا جائزہ لیتا رہا پھر حتمی لہجے میں بولا۔
”میں سروسٹ آپ سے کوئی لمبا چوڑا وعدہ تو نہیں کر سکتا لیکن اگر آپ کے مشورے کے تسلی بخش نتائج برآمد ہوئے تو میں اس ضمن میں بھی آپ کی بھر پور خدمت کروں گا۔“

میں نے سوٹ کیس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مثلاً شناختی کارڈ، وزیٹنگ کارڈ، وکالت کا لائسنس اور مختلف قسم کے ٹیل وغیرہ جو میرے ہی نام سے ہیں۔ ان میں علاوہ آپ میرے گھر اور دیگر دوست و احباب کو فون کر کے بھی اس امر کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ میں شریک ہوں نہ کہ کوئی ٹی وی آرٹسٹ کریم۔“ میں نے پہلے سوٹ کیس کھولا پھر اس کے اندر موجود بریف کیس اور کہا۔ ”اور اگر پھر بھی آپ کو اس حقیقت کا یقین نہیں آتا تو پھر مجھے مجبوراً وہی راہ اختیار کرنا ہوگی۔ جس کا تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔ یعنی۔۔۔۔۔!“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بریف کیس میں سے چند کاغذات نکال کر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
”مجھے مجبوراً آپ کو عدالت میں گھسیٹنا پڑے گا کیونکہ آپ کے حکم پر ایک غنڈے نے گمن پوائنٹ پر اغوا کر کے مجھے یہاں پہنچایا ہے اور یہ کوئی معمولی جرم نہیں ہے۔ آغا جمال صاحب۔۔۔۔۔!“
چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے میرے ہاتھ سے وہ کاغذات لے لیے جو میرے ایک وکیل شریک ہونے کو ثابت کرتے تھے۔ وہ ان کاغذات کا تنقیدی جائزہ لینے کے دوران وقفے وقفے سے مجھے بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ لحاظی تحقیق کے بعد اس نے وہ تمام ثبوت میری جانب بڑھا دیے اور گہری تشویش سے بولا۔
”لگتا ہے آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔ غلطی مجھ سے ہوئی ہے۔“
”آغا صاحب!“ میں نے بڑے دوستانہ انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی اس حقیقت کیس کی اس حقیقت میں غلطی ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اور جہاں تک آرٹسٹ کریم کی تصویر کا تعلق ہے۔۔۔۔۔ تو وہ میں نے ہی راجو کو دے رکھی تھی کہ یہ شخص جہاں بھی نظر آئے اسے میرے

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آغا صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر اور وکیل میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا جیسا کہ میں نے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر اور وکیل سے بھی غلط بیانی نہیں کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر سے مرض کو اور وکیل سے جرم کو چھپایا نہیں جاسکتا۔“

”میں نے ابھی تک آپ سے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی آئندہ ایسا کوئی ارادہ ہے۔“ وہ ابھین زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”پھر آپ نے اس نوعیت کی بات کیوں کی۔ ذرا اس کی وضاحت تو کر دیں۔“

”یہ بات دراصل میں نے کسی اور تناظر میں کی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

اس کی ابھین میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ”کسی اور تناظر میں کیا مطلب؟“

میں نے اب وضاحت کرنا ضروری سمجھا اور کہا۔

”جب کسی مرض کے علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں تو اس سے یہ نہیں کہا جاتا کہ اگر اس کی تجویز کی ہوئی ادویات سے مریض کو فائدہ ہوا تو ڈاکٹر کی فیس ادا کی جائے گی۔ ڈاکٹر پہلی فرصت میں اپنی فیس وصول کرتا ہے۔ اب یہ مریض کی قسمت اور ادویات کی اثر پذیری پر منحصر ہے کہ کب اور کتنے دنوں میں وہ مرض جاتا ہے۔“ میں نے تھوڑا توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اور آغا صاحب! آپ تو مجھے وعدہ فرما پر ٹرخانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر میرے مشورے نے کوئی کمال کر دیا تو آپ میری خدمت کے بارے میں کچھ سوچیں گے۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی؟“

”وہ بات میں نے صرف انہی افراد وغیرہ کے حوالے سے ہر جانے کے بارے میں کہی تھی۔“ وہ گہری سنجیدگی

سے بولا۔ ”آپ تو بڑے کیلکولیٹو وکیل ہیں!“

”کیلکولیٹو نہیں پر میکینیکل نہیں آغا صاحب!“ میں نے سچ کرنے والے انداز میں کہا۔

”میں یہ کام تفریحاً نہیں کرتا بلکہ یہ میرا پیشہ ہے میرے روزگار کا ذریعہ ہے اور اگر آپ کو میری بات سے اتفاق نہیں تو ٹھیک ہے میں آپ کے ساتھ کوئی زبردستی تھوڑی کر رہا ہوں۔“ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”آپ جائیں اور وہ ٹی وی آرٹسٹ کریم جانے مجھے آپ کے معاملے سے کوئی واسطہ نہیں میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔“

اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ قدرے نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ”آپ تو خواہ مخواہ تھا رہے ہیں تشریف رکھیں ہم یہ بات خوش گوار ماحول میں بھی کر سکتے ہیں۔“

میں نے اس کے رویے سے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ وہ مجھے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جس کا مطلب تھا وہ مجھ پر اور میری پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر بھروسہ کرنے لگا تھا اور اسے یقین ہو چلا تھا کہ میں اس کی بیٹی فریال کو ٹی وی آرٹسٹ کے چکر سے نکال سکتا ہوں۔ اسے نرم پڑتے دیکھ کر میں نے کہا۔

”آغا صاحب! ایک بات اپنے دھیان میں رکھیں کہ میں کوئی چلتا پھرتا اور فارغ گوئی نہیں ہوں جو کیس کی تلاش میں درود کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ اللہ کے کرم سے میرے پاس کمزور کی ایک قطار لگی رہتی ہے۔ اس کام میں مجھے سرکھانے کی فرصت نہیں۔ ابھی آپ میرے آفس آ کر دیکھیں کانسٹنٹ کارڈ دیکھ کر آپ کی آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔“ میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”ایک اتفاق نا خوش گوار اتفاق مجھے آپ کے

پاس لے آیا ہے اور آپ ہی نے درخواست کی ہے کہ میں آپ کی بیٹی کے سلسلے میں کوئی مفید مشورہ دوں۔ اگر آپ مجھ سے کوئی مفید مشورہ نہیں لینا چاہتے تو آپ کی مرضی ہے۔“

اس دوران میں دوبارہ صوفے پر بیٹھ چکا تھا اور اس بیٹھک کا سبب یہ تھا کہ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ آغا جمال مجھے یوں ناراض ہو کر جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ وہ جن دنوں دل چاہے نظروں سے منسلک میرا جائزہ لے رہا تھا اس سے طے ہو رہا تھا کہ وہ میری خدمات حاصل کر کے ہی رہے گا اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بھی فریال اور کریم کے معاملے میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ اندرونی تجسس مجھے افسوس ہوا تھا کہ میں وہ واقعات و حالات جاننے کی کوشش کروں جنہوں نے آغا جمال کی بھوک پیاس اور رات کا سکون چھین لیا تھا۔ آخر وہ ٹی وی آرٹسٹ کریم آغا کی بیٹی فریال کو کس طرح گمراہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے تو یہ کوئی انتہائی سنگین معاملہ لگتا تھا۔ جیسا آغا نے مجھے یعنی اپنی دانست میں آرٹسٹ کریم کو اغوا کرانے کی کوشش کی تھی۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے۔ اس دوران میں میں بدستور گہری نظر سے آغا کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ میری بات کے اختتام پر اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بیگ صاحب! شاید آپ سے ڈھنگ سے بات نہیں کر سکے۔ اس لیے میرا انداز آپ کو ناگوار گزرا ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ فریال کے معاملے نے مجھے ذہنی طور پر کتنا اپ سیٹ کر رکھا ہے۔“ وہ لمبے بھر کے لیے متوقف ہوا۔ پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”آپ نہایت توجہ سے پہلے میرا مسئلہ سن لیں۔ اگر آپ اس سلسلے میں میری کوئی مدد کر سکتے ہوں تو پھر میں آپ کی فیس آپ کا ہر مطالبہ ماننے کو تیار ہوں۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے آغا صاحب! یہ آپ نے اصولی بات کی ہے۔“ میں نے سناٹکی الفاظ میں کہا۔ ”میں نے بھی اپنا ایک اصول بنا رکھا ہے۔ جب تک میں کسی کیس کو لینے کا فیصلہ نہ کروں فیس وصول نہیں کرتا۔ آپ نے چونکہ ایک میچور بات کی ہے اس لیے میرے پاس آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے۔“

”خوش خبری! کیسی خوش خبری بیگ صاحب!“ وہ تاملانہ لہجے میں متفسر ہوا۔

میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”میں نے آپ سے وہ نہ جاننا۔ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جو تھوڑی دیر پہلے کلیم کیا تھا۔ یعنی میرے جبری اغوا کے سلسلے میں دیا جانے والا ہرجاتا۔“

اس کے سننے پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ کا بہت بہت شکر یہ بیگ صاحب!“

”اب شکر یہ وغیرہ ادا کرنے میں وقت ضائع نہ کریں آغا صاحب!“ میں نے گلیسر انداز میں کہا۔ ”وہ مسئلہ بتائیں جس نے آپ کو بے حد پریشان کر رکھا ہے؟“

”ٹھیک ہے بیگ صاحب! جیسی آپ کی مرضی۔“ وہ معتدل لہجے میں بولا۔ ”میں آپ کے لیے چائے کا کھدیتا ہوں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

اس رات میں جوتا نے فکر ہو کر ایڈوکیٹ میں کود پڑا تھا اس کی گلی ایک وجوہات تھیں۔ یہ تو میں آپ کو بتا

چونکہ کر رکھ دیا۔ اس نے اطلاع فراہم کرنے والے بندے کو ختم دیا۔
”فریال کو احساس نہیں ہوتا چاہیے کہ تم نے اس کی رپورٹ مجھے دے دی ہے۔“
”جواب کا حکم سہرا“ وہ فرماں برداری سے بولا۔

آغا جمال نے بدستور حکمانداز میں کہا۔ ”وحید! اس کے ساتھ ہی تمہیں ایک اور ضروری کام بھی کرنا ہے۔“ لکھائی توقف کے بعد پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اس ٹی وی آرٹسٹ کے بارے میں مکمل معلومات چاہئیں تم میری بات سمجھ رہے ہو؟“

”جی آغا صاحب“ وہ اطاعت بھرے انداز میں بولا۔ ”بالکل سمجھ گیا ہوں آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں دو تین دن میں کریم کے حوالے سے آپ کو پوری معلومات فراہم کر دوں گا۔“ وحید کو رخصت کرنے کے بعد فریال کے بارے میں سوچنے لگا آغا جمال بنیادی طور پر ایک ایکسپورٹ تھا۔ اس کا بزنس لیڈر گڈز کے گرو گھومتا تھا۔ ”جینکس“ شوز اور ہینڈ بیگز وغیرہ اس کا دیوار کے خصوصی اسٹور تھے۔ وہ اپنے بزنس میں اس قدر مگن رہتا تھا کہ ٹی وی یا شو بڑی طرف دھیان دینے کا بھی اسے زیادہ موقع نہیں ملا تھا۔ لہذا وہ اداکاروں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا تھا۔ جیسی اس نے وحید کو اس کام کے احکامات صادر کیے تھے۔

فریال چونکہ اس کی اکلوتی اولاد تھی اس لیے بھی اسے فریال کی بڑی فکر تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلانی تھی۔ ازیں علاوہ زندگی میں فریال کو بھی کسی کی یا محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ تعلیم سے تقریباً فارغ ہو چکی تھی اور عمر کا بھی وہ دور شروع ہو چکا تھا جس میں اس کی شادی ہو جانا چاہیے تھی۔ دوسرے والدین کی طرح آغا جمال کو بھی اپنی بیٹی کی شادی کی فکر تھی۔ وہ فریال کے لیے کسی موزوں اور مناسب رشتے کی تلاش میں تھا اور ہر غیر شادی شدہ معقول لڑکے کو وہ نظروں ہی نظروں میں جانچنے اور تولنے کی کوشش میں رہتا تھا۔ لیکن ابھی تک اسے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تھی تاہم اس کی یہ مہم جاری تھی۔

راجو نے مجھے بتایا تھا کہ آغا جمال اس کا پاس ہے۔ مجھے گن پوائنٹ پر جس سنسنی خیز انداز میں اغوا کر کے آغا کے پاس پہنچایا گیا تھا اس سے ذہن میں فوری طور پر یہی تاثر ابھرتا تھا کہ وہ کسی خطرناک تنظیم کا سرغنہ ہوگا یا پھر جرائم پیشہ افراد کا سردار لیکن درحقیقت ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ آغا جمال ایک روایتی بزنس مین تھا۔ میرے ساتھ اختیار کیا جانے والا رویہ ایک خاص رد عمل کا عکس تھا۔ جونی وی آرٹسٹ کریم کے کسی عمل کے نتیجے میں آغا نے ظاہر کیا تھا۔ آگے اس کی تفصیل بیان کی جائے گی۔ جب آغا جمال کو یہ خبر ملی کہ اس کی بیٹی فریال کسی ٹی وی آرٹسٹ کے ساتھ مراسم بڑھا رہی ہے تو فوراً طور پر اس کے ذہن میں یہی آیتا تھا کہ اسے مذکورہ ٹی وی اشارے کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا چاہئیں تاکہ وہ کوئی رائے قائم کر سکے کہ اس کی بیٹی جس شخص کے ساتھ دیکھی جا رہی ہے اس کا اسٹینڈس اور پروفائل وغیرہ کیا ہے۔ وہ فریال کو بے حد چاہتا تھا اور اس کی ضدیں پوری کرنے کی بھی آغا کو عادت تھی لیکن زندگی کے اس اہم معاملے کے حوالے سے وہ محض اپنی تسلی چاہتا تھا اور ابھی تک وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ یہ کوئی سنجیدہ معاملہ تھا بھی یا نہیں۔ وحید کی مفصل رپورٹ کے بعد ہی آغا جمال کوئی حتمی رائے قائم کر سکتا تھا۔

حسب وعدہ تین روز کے بعد وحید ایک مرتبہ پھر آغا جمال کے سامنے موجود تھا۔ آغا نے گہری سنجیدگی

اسے اتنا ہی اہم کر دیا سوچ دیا جاتا ہے۔ جب کہ انٹری بورڈ پر کو اپنے خرچے پر کھانا پکا کر خود ہی کھا ہوتا وہ کھانا اس کی دانست میں دنیا کا لذیذ ترین کھا ہی ہوگا۔ دنیا اس کے کھانے کے بارے میں کب رائے رکھتی ہے۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کیوں کہ اس نے کسی سے اس کھانے کا بل نہیں لینا ہوتا۔ وہ خود پکاتا ہے خود کھاتا ہے اور خود ہی داوا کے نعرے لگاتا ہے۔ مگر کریم کی اداکارانہ صلاحیتوں میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کی اداکاری کا سہاں ہی تھا کہ فریال دل و جان سے اس کے چکر میں پھنسی ہوئی تھی۔

فریال کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ آغا جمال کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس لیے ظاہر ہے بڑی لاڈلی بھی تھی۔ لاڈلے اور اکلوتے بچے عموماً سرکش اور ضدی بن جاتے ہیں۔ یہ خصوصیات فریال میں بھی آئی تھیں پھر ان منفی خصوصیات کو مہمیز اس وقت مل جب فریال کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔

فریال کی عمر دس سال تھی کہ اس کی ماں مجتہدہ اہر دار فانی سے کوچ کر گئی۔ لہذا آنے والے دنوں میں آغا اس کے اور زیادہ قریب ہو گیا تاکہ اسے ماں کو کی زیادہ شدت سے محسوس نہ ہو۔ یہ لاڈ پیر اور دیکھ بھال کی ایک ترقی یافتہ شکل تھی جس نے فریال کو اپنے مرضی کا مالک بھی بنادیا۔ ضدی اور سرکش تو وہ پہلے ہی تھی۔ جب آغا جمال نے اس کی جائز و ناجائز فرمائش پوری کرنا شروع کر دی تو کنٹرول سے باہر ہو گئی اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ فریال کی ایک فرمائش نے آغا جمال کو ہلا کر رکھ دیا۔

ایک روز آغا جمال کے ایک آدمی نے اسے بتا کہ فریال بی بی آج کل ایک ٹی وی آرٹسٹ سے میل ملاقات بڑھا رہی ہے۔ اس خبر نے آغا

ہی چکا ہوں کہ اگلے روز چھٹی کا دن تھا۔ مجھے کسی عدالت میں یا اپنے دفتر نہیں جانا تھا۔ ازیں علاوہ میری بے فکری کا ایک اہم عنصر یہ بھی تھا کہ میرے گھر والے ایک شادی میں شرکت کرنے نواب شاہ گئے ہوئے تھے۔ لہذا مجھے گھر جانے کی بھی جلدی نہیں تھی۔ اس صورت حال میں اگر میں آغا کی خواہش پوری کرتے ہوئے اس کے بیٹنگ پر ڈنر کر لیتا تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ لیکن مجھے یہ مناسب نہیں لگا اسی لیے میں نے آغا جمال کی پیش کش کو بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا تھا۔

آئندہ آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت میں نے چائے پیتے ہوئے آغا سے بات چیت میں گزارا۔ وہ مجھے ٹی وی آرٹسٹ کریم کی چالاکی اور اپنی بیٹی فریال کی ناگہمی کے بارے تفصیل سے بتانے لگا۔ میں پوری توجہ سے اس کی بات سنتا رہا اور سچ میں جہاں ضرورت محسوس ہوتی میں اس سے سوال کرتا نہیں بھولتا تھا۔

آغا جمال کی بیان کردہ داستان سنسنی آمیز اور ہیجان خیز ہونے کے ساتھ افسوس ناک بھی تھی۔

آج کل کے ٹی وی ڈراموں میں دیکھنے میں آ رہا ہے کہ کہانی اور اداکاری تقریباً بنانا پید ہوئی جا رہی ہے۔ ان کی جگہ گلیمر، قیمتی ملبوسات، جیولری، غیر ممالک میں جا کر شوٹنگ کرنے کا رجحان زیادہ فروغ پاتا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں پروڈکشن کا بجٹ بہت بھاری ہو جاتا ہے اور اس بھاری بجٹ کا بوجھ اداکاری کو بہت ہلکا کر دیتا ہے کیوں کہ آرتسٹوں میں زیادہ تعداد ان لڑکوں اور لڑکیوں کی ہے جنہوں نے اس شعبے سے باقاعدہ کچھ سیکھ نہیں رکھا بلکہ ان کی حیثیت زیادہ تر چھوٹی چھوٹی فنائیں کہنیاں ایسی ہے جو مختلف زاویوں سے ڈرامے کے بجٹ میں اپنا سرمایہ شہر کر رہے ہوتے ہیں۔ جس کا شیئر جتنا زیادہ ہوتا ہے

سے سوال کیا۔ ”ہاں وحید... کیا رپورٹ ہے؟“
”جناب میں سب کام چھوڑ کر آئی مشن پر لگ گیا تھا۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔“
”پچھلے تین دنوں میں فریال بی بی دومرتبہ کریم سے ملی ہیں۔ یہ ملاقات دو مختلف ریسٹورنٹس میں ہوئی۔ انہوں نے ایک ساتھ تھوڑا وقت گزارا۔ پھر اپنی اپنی راہ پر ہو لیے میں نے...!“
”مجھے ان دونوں کی ملاقاتوں کی تفصیل نہیں چاہیے وحید! آغا جمال نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔“ میں جہلی فرصت میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ تم نے اس لی وی آرٹسٹ کے بارے میں کیا تحقیق کی ہے؟“
”آغا صاحب!“ وحید نے نہایت مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ”لی وی آرٹسٹ کریم کو شوہر میں آئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن اپنی صلاحیتوں کے شہرت پر اس نے جلدی اپنے من کا لوہا منوایا ہے۔ ابتدا میں وہ ایک گلوکار کی حیثیت سے متعارف ہوا چند کمرشلز میں بھی کام کیا اور بلٹا خروڑا سوں کا اداکار بن گیا۔ اب وہ اتنا مصروف ہو گیا ہے کہ اس کے پاس پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی بھی فرصت نہیں اور...!“
”ٹھیک ہے اس کی مقبولیت اور شہرت تو میری سمجھ میں آگئی۔“ آغا نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات کا متے ہوئے کہا۔ ”میں کریم کی نئی زندگی کے بارے میں جانتا چاہتا ہوں۔ اس کے گھر اور فیملی کے بارے میں تم نے کیا معلومات اکٹھا کی ہیں؟“
آغا جمال کریم کے معاملے میں اتنی دلچسپی اس لیے لے رہا تھا کہ وہ فریال سے کوئی میٹنگ کرنے سے پہلے اچھی طرح اپنی سلی کر لینا چاہتا تھا۔ وہ فریال کی پسند و غیرہ کے خلاف نہیں تھا تاہم وہ اسے کسی اندھے کنوئیں میں بھی گرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ ساری تحقیق و تفتیش اسی زمرے میں تھی

تاکہ مستقبل قریب میں اس کی لاڈلی بیٹی کی زندگی میں کسی قسم کا کوئی خطرہ سر اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔ تمام معقول اور متوازن سوچ رکھنے والوں کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد سدباغ و بہار رہے۔ وہ ان کے مستقبل کی راہ میں پڑے کانٹوں کو اپنی پلکوں سے بچنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں لیکن عموماً دیکھنے میں بھی آیا ہے کہ اولاد کو اپنے والدین کی اس بیش بہا فریالی کی کوئی قدر نہیں۔ ان کی اکثریت شخص یہ کہہ کر بات ختم کر دیتی ہے کہ ان کے ماں باپ نے جو کچھ بھی کیا یہ ان کا فرض تھا۔ معدودے چند ایسے والدین ہوں گے جو اولاد کی طرف سے فخر یہ خود کو خوش قسمت کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جدید ترقی یافتہ روپوں اور مغرب کی اندھی تقلید سے تسکین پانے والی مخصوص ذہنیت اس تمام تر سنجیدہ معاملے کو صرف ایک جملے میں نثا دیتی ہے۔ ”یہ کوئی بات نہیں شخص“ ”بزنس ٹین گیپ“ کا معاملہ ہے۔“
اس قسم کی سوچ کے حامل نوجوان طبقے کو قطعاً یہ احساس نہیں کہ وہ فیئشن ڈیزائن میں کتنی تاریخی غلطی کر رہے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ تاریخ کبھی کسی کو معاف نہیں کرتی۔ تاریخ کے ساتھ کھلواز کرنے کے بجائے اس سے سبق سیکھنا چاہیے ورنہ پھر یہ سبق سکھائی ہے کہ بندہ چھو چھو کر اور ٹول ٹول کر دیکھ رہا ہوتا ہے اور وہ دیکھ دیکھ کر ہر کسی امرے غیر سے تھو خیرے سے پوچھ رہا ہوتا ہے۔ بھائی یہ کیا ہو گیا؟“
آج کی نوجوان نسل کو اپنے والدین کے ایثار و قربانی کو کسی بھی صورت نظر انداز یا فرافوش نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ آنے والے وقتوں میں ان کی اولاد کے ہاتھوں خود ان کا جو حشر ہونے والا ہے اس کا وہ خواب و خیال میں بھی تصور نہیں کر سکتے۔ برے وقت سے ہمیشہ محتاط اور ڈرتے رہنا چاہیے کیونکہ یہ فون کر کے یا

دستک دے کر نہیں آیا کرتا۔
وحید نے آغا جمال کے استفسار کے جواب میں بتایا۔ ”کریم کی رہائش ایک لکڑی اپارٹمنٹ میں ہے جہاں وہ اپنی مختصر سی تنگلی کے ساتھ رہتا ہے۔ اس علاقے میں سب کھاتے پیتے لوگ ہی قیام پزیر ہیں۔“
”تمہارے اندازے کے مطابق کریم کی عمر کیا ہوگی؟“ آغا جمال نے پوچھا۔
وحید نے بتایا۔ ”میں وثوق سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا جناب...!“
”میں نے وثوق کی نہیں اندازے کی بات کی ہے وحید! آغا اس کی بات کاٹ کر بولا۔
وحید نے جلدی سے جواب دیا۔ ”وہ تیس اور پینتیس کے درمیان نظر آتا ہے۔“
”تم نے کافی دنوں سے کریم پر نظر رکھی ہوگی ہے۔“ آغا نے تفتیش کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”اس دوران میں تمہیں بارہا کریم کو اسٹوڈیوز اور ہر کے باہر دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ وہ فریال کے علاوہ بھی کسی اور لڑکی کے ساتھ تمہیں ریسٹوران اور دیگر مقامات پر دکھائی دیا ہے؟“
”جی ہاں ایسا کئی مرتبہ ہو چکا ہے۔“ وحید نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ”وہ خاصا سوئل آؤٹی ہے جناب! ہر وقت کسی نہ کسی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اس کے ہم راہیوں میں زیادہ تعداد عورتوں اور لڑکیوں کی ہے جن میں سے اکثر کا تعلق شوہر سے ہے۔ وہ اپنی فنی کے ساتھ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔“
”تمہاری! آغا جمال نے اس لفظ پر اچھا خاصا زور دے دیا۔ ”تم نے بات کو آگے بڑھایا۔“ تم نے پہلے بھی اس کی مختصر سی تنگلی کا ذکر کیا ہے۔ کیا تم جانتے ہو وہ

اپنے فلیٹ میں کتنے افراد کے ساتھ رہتا ہے؟“
”کریم کے علاوہ اس فلیٹ میں صرف دو افراد رہتے ہیں۔“ وحید نے بتایا۔ ”ایک اس کی بیوی دوسری اس کی بیٹی۔“
وحید کے جواب سے آغا کی سوچ کو ایک ٹھیس سی لگی۔ بے ساختہ اس کے منہ سے یہ سوال پھسل گیا۔
”کیا وہ شادی شدہ ہے؟“
”جی آغا صاحب!“ وحید نے بے صدا احترام بتایا۔ ”اس کی شادی وگہ جگہ پانچ سال ہوئے ہیں۔ اس کی بیوی مریم چار سال کی ہے جو اسکول میں پڑھتی ہے۔“
”ہوں...!“ آغا نے ایک گہری سانس خارج کی اور وحید کو فارغ کرتے ہوئے کہا۔
”ٹھیک ہے وحید! تم اب جاؤ لیکن تم نے اپنا کام جاری رکھنا ہے۔ مجھے اس بات کی رپورٹ مسلسل ملتی رہنا چاہیے کہ فریال کب اور کس وقت کریم سے ملی۔ انہوں نے کتنے وقت کہاں گزارا۔ وغیرہ وغیرہ۔“ وہ لمبے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔
”وحید! اس بات کا تمہیں خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے کہ ان دونوں کو کسی بھی قیمت پر تمہاری سرگرمیوں کی خبر نہیں ہونا چاہیے۔ اس تعاقب اور تحقیق میں بہت زیادہ احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟“
”جی آغا صاحب! میں معاملے کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ وحید نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ بالکل بے فکر ہو جائیں جناب! میں آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ میں یہ کام ان جذبات کے ساتھ کر رہا ہوں کہ میں ایک باپ ہوں اور فریال میری بیٹی ہے اور مجھے اپنی بیٹی کا ہر زاویے سے خیال رکھنا ہے۔“

”شاباش وحید!“ آغا جمال نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم نے میرا دل خوش کر دیا ہے۔“
”یہ تو میرا فرض ہے آغا صاحب!“ وہ بدستور گہری تنہید کی سے بولا۔ ”اب مجھے اجازت دیں۔“
آغا جمال نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔
وحید رخصت ہونے لگا تو آغا نے پوچھا۔ ”ہاں یا نا یا وحید وہ تمہارے بچے کے ایڈمیشن کا کیا ہوا؟“
”ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا آغا صاحب!“ اس نے مایوسی بھرے لہجے میں جواب دیا۔
”کامران کی قابلیت میں کوئی دورائے نہیں ہیں۔ وہ نرسری کے دونوں سالوں کے ہر امتحان میں فرسٹ آتا رہا ہے۔ کلاس ون کا ایڈمیشن ٹیسٹ بھی اس نے اسے دن دیا ہے لیکن کامیاب ہونے والے بچوں کی فہرست میں اس کا نام نہیں۔“
”اس سلسلے میں کسی سفارش وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ آغا نے اپنا تئیت بھرے لہجے میں پوچھا۔“
”میں کوئی سوری دورس ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔“
”جناب! اس اسکول میں اور اس جیسے دیگر اسکولوں میں سوری سے زیادہ ایک دوسری شے چلتی ہے جسے مہذب الفاظ میں ”ڈونیشن“ کا نام دیا جاتا ہے اور اس کام کے لیے عواما دین ڈرائیور اور کنینین کا اسٹاف بہ طور ایجنٹ کام کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ اسکول والوں کی ملی بھگت سے ہوتا ہے۔“ وہ تھوڑی دیر کے لیے تھما، ایک گہری سانس لی پھر دل شکستگی کے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔
”اسکول اور اس کی انتظامیہ کی یہ خرابی اپنی جگہ لیکن اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس اسکول کی پڑھائی کا جواب نہیں ہے۔ وہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اس اسکول سے پڑھے ہوئے لوگ آج

”پاپا! خیریت تو ہے نا! آج آپ خاص طور پر میری مصروفیات کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟“
آغا جمال نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”بیٹو جی! انسان کی تعمیر بھی مکمل نہیں ہوتی۔ وہ اس دنیا میں اپنی پہلی سانس سے آخری سانس تک کچھ نہ کچھ سیکھتا ہی رہتا ہے۔“ اس نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر بیٹی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گھیر لہجے میں بولا۔
”یہ تو میرے علم میں ہے کہ آج کل تم پابندی کے ساتھ گھر سے باہر نکل رہی ہو۔ یقیناً اس دوران میں گھومنا پھرنا ہی ہوتا ہوگا۔ کیا آپ یونیورسٹی کی دوستوں ہی کے ساتھ وقت گزار رہی ہو؟“
آغا کا یہ گفتیشی انداز فریال کو چونکا دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ آج تک اس کے پاپا نے اتنی تنہید کی سے سوال جواب نہیں کیا تھا۔ اس نے قدرے تشویش بھری نظر سے آغا جمال کو دیکھا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔
”ظاہر ہے پاپا اور کس کے ساتھ وقت گزاروں گی۔ یونیورسٹی ہی کی چند دوست ہیں جن کی طرف چلی جاتی ہوں۔“
”بڑی اچھی بات ہے بیٹو جی!“ آغا نے محبت بھرے انداز میں کہا تاہم کرایہ کا عمل بھی جاری رکھا۔
”کیا آپ کی یونیورسٹی کی یہ دوست ہمارے گھر بھی آتی رہتی ہیں؟“
”آں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔!“ وہ لڑ بڑا ہٹ آمیز لہجے میں بولی پھر جلدی ہی سنہلے ہوئے کہا۔
”مجھے کبھار زیادہ تر میں ہی ان کی طرف جاتی ہوں۔“ اس کے دل میں چون کہ چور چھپا ہوا تھا لہذا وہ باپ سے پوچھے بناندرہ نکلی۔
”پاپا! آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں۔“

خیریت تو ہے نا؟“
”بالکل خیریت ہے بیٹو جی!“ وہ تسلی بھرے لہجے میں بولا۔ ”مجھے آپ کی دوستوں کو گھر میں دیکھا نہیں نا۔ اس لیے ذہن میں بس ایک خیال آ گیا تھا۔“
”اسے ایک اتفاق سمجھ لیں پاپا!“ وہ بات بناتے ہوئے بولی۔ ”ویسے بھی آپ رات کو میری سے گھر آتے ہیں۔ میری دوستوں سے آپ کی ملاقات کیسے ہوگی۔“
”ہاں! یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔“ آغا جمال سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا پھر پوچھا۔ یہ سوال بڑا اچانک اور غیر متوقع سا تھا۔ ”یونیورسٹی میں لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ کیا تمہارے دوستوں میں لڑکے وغیرہ بھی شامل ہیں؟“
اس سوال نے فریال کے وجود میں گہری تشویش دوڑا دی۔ اس نے متذبذب نظر سے اپنے پاپا جانی کو دیکھا اور ٹھوس لہجے میں بولی۔
”جب تک باقاعدہ یونیورسٹی جانا ہوتا تھا تو لڑکوں وغیرہ سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی لیکن جب سے فرصت ملی ہے یہ سلسلہ موقوف ہو کر رہ گیا ہے۔ اب تو صرف دو تین گہری دوستوں ہی سے میل جول ہے۔“
”مجھے وہ مجھ سے ملنے یہاں آ جاتی ہیں اور کبھی میں ان کی طرف چلی جاتی ہوں۔“
آغا جمال کو یہ اندازہ لگانے میں کوئی وقت محسوس نہ ہوئی کہ اس کی لاڈلی بیٹی اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس سے ہر بات بے دھڑک کہہ دینے والی بیٹی کے تیور آج قدرے مختلف دکھائی دیتے تھے۔ فریال کے لہجے سے صاف جھلکتا تھا کہ وہ دروغ گوئی سے کام لے رہی ہے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کے لیے اس نے ایک اور حربہ آزمایا۔

سوچ رہے ہو یا کریم کے بارے میں؟“
”دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں
پاپا۔“ وہ بھی صاف کوئی کا مظاہر کرتے ہوئے بولی۔
”شوہر میرا شوق ہے اور کریم میرا نینیل کریم اس
شعبے میں میری بھرپور مدد کرے گا۔“
”کمال ہے بیٹی جی!“ وہ شام کی نظر سے فریال کی
طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ میری نظر کے
سامنے پل بڑھ کر جوان ہوئے۔ آپ کا کوئی معاملہ
کوئی پسندنا پسند مجھ سے چھپی ہوئی نہیں۔ آپ اپنی
زندگی کا ہر چھوٹا بڑا مسئلہ مجھ سے شیئر کرتے ہو
لیکن!“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف
ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”لیکن حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ مجھے
بھی یہ چاہ چل۔“ کا کا آپ کا شوق اور نینیل کیا
ہے اور میری ہے بے خبری اس لیے ہے کہ آپ نے
مجھے بتانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی میں ٹھیک
کہہ رہا ہوں نا؟“

”پاپا آئی ایم رینلی ویری سوری۔“ وہ معذرت
خواہانہ انداز میں بولی۔ ”مجھے اس بارے میں آپ کو
بتانا چاہیے تھا۔ آپ تو میرے بہت اچھے دوست
ہیں۔ بلکہ سب سے اچھے دوست ہیں۔“

”اس میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں
بیٹی جی!“ آغا جمال نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
”اس دوستی کے بل بوتے پر میں امید کرتا ہوں کہ اب
میں اپنے بیٹی جی سے جو کچھ پوچھوں گا آپ اس کا
صاف اور کھرا جواب دیں گے؟“

فریال نے متاملانہ نظر سے باپ کو دیکھا پھر گہری
سنجیدگی سے بولی۔ ”کیوں نہیں پاپا۔ آپ کے ذہن
میں جو بھی سوال ہے آپ ضرور پوچھیں۔ میں اس کا
سچا اور کھرا جواب دوں گی۔“

فریال نے دانستہ اس معاملے کو اپنے باپ سے چھپایا
تھا اور آغا اس بات کو بڑی گہرائی تک سمجھ رہا تھا۔ سچی
اسے دکھ بھی ہوا تھا۔ تاہم اس نے اپنے چہرے سے
اس دکھ کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔ فریال نے اس
کے مجموعی سوالات کے جواب میں بتایا۔
”پاپا! جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے کریم سے
تین چار ماہ پہلے ملاقات ہوئی تھی اور یہ ملاقات
اتفاقاً ہی سمجھ میں لیکن یہ ہے کہ میں کریم کے ڈرامے
نہایت پابندی کے ساتھ دیکھا کرتی تھی۔ نہ صرف یہ
کہ اس کی اداکاری مجھے پسند تھی بلکہ وہ میرا نینیل
آرٹسٹ بھی تھا۔ بلکہ نینیل ہے۔“

وہ اتنا بتانے کے بعد متوقف ہوئی۔ ایک گہری
سانس خارج کی پھر سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے
ہوئے بولی۔ ”کریم سے پہلی ملاقات میرے لیے
بہت بڑی خوش نصیبی تھی۔ اس نے بھی میری بہت
تعریف کی بلکہ مجھے مشورہ دیا کہ شوہر جوان کرلوں۔
میں اس شعبے میں بہت ترقی کروں گی اور اگر اس
سلسلے میں کوئی مشکل پیش آئے تو وہ میری بھرپور مدد
کرے گا۔ میں آج کل بڑی سنجیدگی سے اس بارے
میں سوچ رہی ہوں۔“

آغا جمال شوہر کی دنیا کو معیوب تو نہیں سمجھتا تھا
لیکن فریال کا یہ فیصلہ اسے قطعاً پسند نہیں آیا تھا کہ وہ
اس دنیا کو جوان کرنے کے بارے میں سوچ رہی
تھی۔ آغا کے نزدیک یہ سارا چکر کریم کا چلایا ہوا تھا۔
اس کے خیال میں کریم فریال کو شوہر کے نہیں بلکہ
اپنے قریب کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس
”قریب“ کے جتنے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے تھے
اس کا آغا جمال کو بخوبی اندازہ تھا۔ لہذا اس نے دو
ٹوک انداز میں فریال سے پوچھ لیا۔
”بیٹی جی آپ شوہر کے بارے میں سنجیدگی سے

لہجے میں بتایا۔
”بیٹی کی باتوں سے خطرناکی جھلکتی دیکھ کر آغا جمال
کی تشویش سوا ہو گئی۔ اس نے سوچا جب فریال سے
اس حساس موضوع پر گفتگو شروع ہوئی تھی ہے تو پھر
اس سیشن کو تھوڑا حویل کر کے نتیجہ خیز بنانا چاہیے۔
اچھا برا جو کچھ بھی ہونا ہے آج ہوتی جائے۔ حتمی فیصلے
پر پہنچنے کے بعد اس نے بیٹی سے استفسار کیا۔
”اس دوستی کو کتنا عرصہ ہوا ہے بیٹی جی!“
”تین چار ماہ ہوئے ہیں۔“

”تین چار ماہ آپ لوگوں کی دوستی کو ہو گئے اور
مجھے کوئی خبر ہی نہیں۔“ وہ شکایت بھرے لہجے میں
بولا۔ ”ٹھیک ہے میں فی دی نہیں دیکھتا ہوں لیکن بیٹی
جی آپ سے تو روزانہ ہی ملاقات ہوتی ہے۔ آپ
نے بھی اس دوستی کا کوئی ذکر نہیں کیا۔“
وہ آغا جمال کی دلی کیفیت کے پیش نظر معذرت
خواہانہ انداز میں بولی۔ ”سوری پاپا جانی میں آپ کو
بتانا بھول گئی۔“

”کوئی بات نہیں بیٹی جی!“ وہ فراخ دلی کا مظاہرہ
کرتے ہوئے بولا۔ ”اب جب کہ یہ معاملہ سامنے آ
ہی گیا ہے تو مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ کریم سے آپ کی
ملاقات کب اور کیسے ہوئی؟ کون سی بات دونوں کی
دوستی کا سبب بنی؟ تم لوگوں کی دوستی کی نوعیت کیا ہے؟
اور مستقبل کے کیا ارادے ہیں؟“

آغا جمال نے فریال کو باپ اور ماں دونوں کا پیار
دیا تھا۔ فریال کی ماں کے انتقال کے بعد وہ بیٹی کے
بہت زیادہ قریب ہو گیا تھا۔ جیسی سے دونوں کے بیچ
ایک بے تکلفی اور دوستانہ سی فضا قائم ہو گئی تھی۔ وہ
بے دھرمک ایک دوسرے سے ہر قسم کی بات کر لیا
کرتے تھے۔ یہی وجہ اور اپنائیت تھی کہ آغا جمال کو
فریال کا تازہ ترین کارنامہ خاصا گراں گزرا تھا۔

”میرا بیٹی مجھ سے غلط بیانی نہیں کرتا۔“ اس نے
بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”لگتا ہے میری ہی نظر کو
دھوکا ہوا ہے۔“
”پاپا آخر ہوا کیا ہے؟“ فریال کی تشویش میں
بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ ”آپ کی نظر کو کس قسم کا دھوکا ہوا
ہے آپ کھل کر بات کیوں نہیں کر رہے؟“
”بات یہ ہے بیٹی جی کہ۔۔۔۔۔۔“ آغا جمال نے
گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”پچھلے دنوں ایک دو بار میں
نے آپ کو ایک مرد کے ساتھ دیکھا ہے۔ ریسٹوران
اور۔۔۔۔۔۔“

”اچھا وہ۔۔۔۔۔۔“ باپ کے معنی خیز ادھورے جملے
کے جواب میں وہ جلدی سے بولی۔ ”پاپا! اس شخص کا
نام کریم ہے۔“
بیٹی کے اس بے باک جواب نے آغا جمال کو
اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ تاہم اس نے اپنی دلی
کیفیت کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور انجان
سامنے ہوئے پوچھا۔
”کریم کون؟“

”ایک تو پاپا آپ فی دی بالکل نہیں دیکھتے نا۔“ وہ
بڑے پراعتماد لہجے میں بولی۔ ”کریم ایک معروف فی
دی آرٹسٹ ہے۔ ڈراموں میں کام کرتا ہے۔“
بیٹی کے اعتماد سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کریم
نامی اس فی دی آرٹسٹ کے ساتھ خاصی بے تکلف
ہو چکی تھی۔ فریال کا رویہ وحید کی فراہم کی ہوئی ایک
ایک رپورٹ کی تصدیق کر رہا تھا اور اس بات نے آغا
کو بڑی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس نے حیرت
بھرے لہجے میں پوچھا۔
”بیٹی جی! ایک فی دی آرٹسٹ کے ساتھ آپ کا
کیا تعلق ہے؟“
”کریم میرا دوست ہے پاپا؟“ فریال نے خیریت

آغا جمال نے بیٹی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گھیر لہجے میں پوچھا۔ ”بیٹی! شو بڑا ایک منٹ کے لیے کوئی ڈال دیں۔ آپ مجھے صرف کریم کے بارے میں بتائیں۔ آپ کریم کو ادا کارانہ صلاحیتوں کی بنا پر اپنا آئینڈیل سمجھتے ہیں یا آپ کے ذہن اور دل میں کریم کے حوالے سے اس سے بھی آگے کچھ ہے۔“ لہائی توقف کر کے اس نے پھر پورنگہ فریال پر ڈالی پھر قدرے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”بیٹی! میں آپ کا اور آپ کی خواہشات کا دشمن نہیں ہوں۔ مجھے امید ہے آپ مجھ سے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ آپ نے کریم کے بارے میں اور کریم نے آپ کے حوالے سے کوئی اہم فیصلہ کر رکھا ہے تو مجھے ضرور بتائیں۔“

”پاپا! مجھے آپ پر فخر ہے۔ وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ ”آپ میرے بڑے سچے دوست ہیں اس لیے مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ کریم والا معاملہ میں نے آپ سے شیئر کیں نہیں کیا مجھے بہت پہلے سب کچھ آپ کو بتادینا چاہیے تھا۔“

”بچھڑانے یا اظہار افسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں میری جان! آغا جمال مشفقانہ انداز میں بولے۔ ”پہلے نہیں تو اب سہی۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ میں جانتا ہوں آپ مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو گے۔“

”سچ تو یہ ہے پاپا! وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”میں کریم کو دل سے پسند کرنے لگی ہوں۔“

”ظاہر ہے وہ آپ کا آئینڈیل ہے بیٹی! آغا نے اپنی آواز پر کنٹرول قائم رکھتے ہوئے کہا حالانکہ اس کے اندر ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ”کسی پسندیدہ چیز کو تو آئینڈیل بنایا جاتا ہے نا۔“ اس نے

لہائی توقف کے بعد ٹٹولنے والے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔

”کہیں یہ پسندیدگی زندگی کے کسی اہم فیصلے سے متعلق تو نہیں ہے؟“

”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے پاپا! اس نے بلا خوف و خطر کہہ ڈالا۔ ”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمیشہ کے لیے کریم کی زندگی میں شام ہو جاؤں گی۔“

”کیا یہ فیصلہ دوطرفہ ہے؟“ آغا کے لہجے میں ہلکا سا باؤ شامل ہو گیا۔

”جی پاپا! فریال نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”کریم بھی مجھے اتنی ہی شدت سے چاہنے لگا ہے جتنا کہ میں۔ ہم دونوں نے مل کر فیصلہ کیا ہے کہ.....!“

”کیا تم جانتی ہو کہ کریم پہلے سے شادی شدہ ہے۔“ آغا نے غمی بھرے لہجے میں قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کی ایک چار سال کی بیٹی بھی ہے۔“

”جی پاپا! وہ تصدیقی انداز میں بولی۔ ”کریم نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا رکھا ہے۔“

”اور آپ پھر بھی.....!“ آغا نے بڑبی آمیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”پاپا! کریم ایک بہت اچھا انسان ہے۔“ فریال نے اپنے آئینڈیل کی وکالت کرنا چاہی۔ ”میں بہت جلد آپ کو اس سے ملواؤں گی۔ آپ کو کریم سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔“

”وہ یقیناً بہت عظیم انسان ہوگا۔“ آغا جمال نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”وہ کامیاب اور ہر لحیزہ پر بھی ہوگا۔ تمہارا آئینڈیل بھی ہوگا لیکن میں تمہیں ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ تم یوں کھلے عام کسی شادی شدہ مرد کے ساتھ گھومو پھرو اور اس کے ساتھ مستقبل

کے سنہرے خواب بنو۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کیسا آدمی ہے بڑی بچی والا ہے اور تمہیں سمجھانے کے بجائے اس کھیل کا حصہ بنا ہوا ہے؟“

”پاپا! آپ ایک بار کریم سے مل لوں.....!“

”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ فریال کی بات کاٹ کر قطعی لہجے میں بولا۔ ”مجھے ہرگز یہ نہیں دیکھنا کہ وہ کتنا اچھا اور شاندار ہے۔ میری نظر میں وہ کوئی معقول اور سمجھ دار انسان نہیں جو تمہیں اس راہ پر گھمیدٹ رہا ہے۔“ اس نے لہائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے دو ٹوک انداز میں بولا۔

”فریال! اگر تمہیں میرا ذرا سا بھی خیال یا لحاظ ہے تو تم آئندہ کریم سے نہیں ملو گی۔ اسے تم ایک باپ کا حکم سمجھو یا ایک دوست کا مشورہ.....!“

آغا جمال نے اتنے جتنی انداز میں بات کی تھی کہ اس موضوع پر مزید بات کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ فریال کی نڈلی پر ”آپ“ سے ”تم“ پڑ گیا تھا۔ فریال نے بھی باپ کے لہجے کی سختی کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا تاہم کسی نئی بحث کا دروازہ کھولنے کے بجائے اس نے فی الحال خاموشی اختیار کرنے کو ترجیح دی تھی۔

آئندہ چند روز میں کچھ اور واقعات رونما ہوئے۔ آغا جمال کے حکم پر وحید نے نگرانی اور جاسوسی کا کام جاری رکھا۔ آغا خود بھی بیٹی پر گہری نظر رکھنے لگا تھا۔ اس معاملے نے اس کے دماغ کی چولیس ہلا کر رکھ دی تھیں۔ فریال جو کچھ بھی کر رہی تھی وہ ٹھیک نہیں تھا اور اس تمام تر غلط کا زے دار صرف اور صرف بی بی آرشٹ کریم تھا۔ جب وحید نے یہ رپورٹ دی کہ فریال اب بھی گاہے بگاہے کریم سے مل رہی ہے تو آغا جمال نے براہ راست کریم ہی

سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ فریال کی عادت مزاج اور فطرت سے بخوبی آگاہ تھا۔ اسے یہ نکتہ سمجھانا آسان نہیں تھا لہذا کریم ہی سے بات کرنا مناسب تھا۔ اگر کریم راہ راست پر آجائے تو فریال خود ہی اس کے تعاقب سے باز آجائی۔

وحید کے توسط سے ایک روز آغا جمال کریم کے پاس پہنچ گیا۔ اس طرح کہ وحید سامنے آئے اور نہ ہی کریم کو یہ احساس ہو کہ اس کی خفیہ نگرانی کی جاتی ہے۔ ریکی علیک سلیک اور ابتدائی تعارف کے بعد آغا نے اپنا مدعا اور تکلیف کریم کے سامنے رکھی۔ کریم نے پوری توجہ سے آغا کی بات سنی اور جو جواب دیا وہ آغا جمال کی توقع کے خلاف تھا۔ اس نے مختصر یہ کہہ کر خود کو بری الذمہ قرار دے دیا۔

”آغا صاحب! میں آپ کی پرابلم کو سمجھ رہا ہوں۔ یہی بات میں نے فریال کو بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے لیکن جو کچھ آپ نے بیان کیا ہے تاہم فریال ہی کی ضد اور خواہش ہے میں تو واضح طور پر اسے پتہ چکا ہوں کہ ہمارا تعلق میل ملاقات اور دوستی کی حد تک سچ ہے۔ وہ اس سے آگے اور کچھ نہ سوچے مگر وہ کچھ سمجھنے کو تیار رہی نہیں.....!“

اپنا دامن بجاتے ہوئے کریم کی آنکھیں اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ خود کو سچا اور کھرا ثابت کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لے رہا تھا۔ آغا اپنی بیٹی کو کبھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اگر کریم کی جانب سے بھرپور حوصلہ افزائی نہ ہوتی تو وہ اس راہ پر چند قدم بھی نہیں چل سکتی تھی۔ آغا کریم کی مکاری کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ گیا تھا۔ تاہم وہ کسی نوعیت کا جھگڑا نہیں چاہتا تھا۔ لہذا نہایت ہی تحمل انداز میں اس نے کریم سے کہا۔

آپ کے مطابق زیادہ قریب نہیں رہے۔ آپ کو اپنی بیٹی کی پرورش کے سلسلے میں مشکلات تو بہت اٹھانا پڑی ہوں گی۔

”کچھ نہ پوچھیں بیگ صاحب!“ وہ افسردہ آواز میں سنجیدگی سے بولا۔ ”بس یوں سمجھیں کہ میں نے فریال کو ماں اور باپ دونوں کی حیثیت سے پالا ہے۔“

”جن بچوں کی پرورش ایسے ماحول میں ہوتی ہے وہ خاصے تنہائی پسند اور قویٰ سے ہو جاتے ہیں۔“

”میں نے اپنی طرف سے تو حتی المقدور کوشش کی ہے کہ فریال کو کسی کی یا محرومی کا احساس نہ ہونے دوں۔“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”اور میں اس کوشش میں خاصی حد تک کامیاب بھی رہا ہوں۔“

”آپ کی کوشش اپنی جگہ درست ہوگی آغا صاحب!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن اس کوشش کے طفیل آپ فریال کو اس کی ماں تو نہیں دے سکے اور نہ ہی ایسا کرنا آپ کے اختیار میں تھا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ وہ ایک مرتبہ پھر میری بات کی تکمیل سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”میں آپ سے اختلاف نہیں کروں گا۔“

میں اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ”بچوں کے لیے ماں سے محرومی خصوصاً لڑکیوں کے لیے ان کی نفسیات پر بڑے مختلف انداز میں اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ ماورائی دنیا کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ اشہور میں دفن اپنی محرومی کے احساس سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ کوئی ایسی قوت حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی ہیں جو انہیں دوسروں سے ممتاز اور نمایاں بنا دے اور جب کوشش کے باوجود بھی وہ اپنے مقصد میں سرخرو نہیں ہو پاتیں تو وہ

”آپ فکر نہ کریں بیگ صاحب! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ وہ تکی بھرے لہجے میں بولا۔ ”کیونکہ اسے نہیں معلوم کہ اس کا کوئی ہم شکل بھی اس شہر میں موجود ہے۔“ وہ لمحے بھر کے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے تمام حالات آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں گے کہ کرنا کیا ہے۔ میں نے اس مسئلے کے سلسلے میں آپ کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کریم فریال کا چھپچھا چھوڑ دے یا دوسرے الفاظ میں فریال کریم کے خیالوں کو اپنے دل و دماغ سے نکال دے۔“

”ہوں.....!“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

میں نے ہم شکل جزواں وغیرہ کے بارے میں سن رکھا تھا۔ ان موضوعات پر فلمیں اور ڈرامے بھی بنے ہیں لیکن چونکہ میں اپنے پیشے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بہت مصروف رہتا ہوں لہذا فلمیں اور ڈراموں پر زیادہ توجہ دینے کا موقع نہیں ملتا اگر مجھے فی وی ڈراموں سے خصوصی دلچسپی ہوئی تو یہ تعینا کریم بھی میری نظر سے ضرور گزرا ہوتا اچانک میرے ذہن میں ایک اچھوتا سا خیال آیا۔

میں نے چونک کر آغا جمال کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”آپ نے یہی بتایا ہے نا کہ فریال کی والدہ کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب وہ صرف دس سال کی تھی؟“

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ ”عجبت کے انتقال کے وقت فریال دس ساڑھے دس سال کی تھی۔“

”ہوں.....!“ میں نے معنی خیز انداز میں ہنکارا بھرا اور کہا۔ ”فریال چونکہ کیلی بھی یعنی اس کا اور کوئی بھائی یا بہن نہیں تھی۔ خاندان کے دوسرے لوگ بھی

داستان سننے کے دوران میں نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ چائے اور لوازمات پر ہاتھ صاف کر دیا تھا۔ میں نے آغا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کی بیان کردہ کہانی اور میرے انخوا کو اگر پہلو بہ پہلو رکھ دیا جائے تو یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ کوئی وی آرٹ کریم نے آپ سے کیا ہوا وعدہ نبھایا نہیں اور آپ کی بیٹی فریال ابھی تک اس کے فرانس میں ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔“

”نہیں.....!“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔“

”جیسا آپ نے اس مسئلے کے آخری حل کے طور پر مجھے (کریم) کو انخوا کر کے اپنے ہنگامے کے منت میں پہنچا دیا تا کہ اسے ہاتھ پاؤں کی زبان میں سمجھا سکیں ہے نا۔“

”اس کے سوا اور کوئی حل بھی باقی نہیں بچا تھا۔“ وہ ہونٹ ہنچتے ہوئے بولا۔

”جو لوگ شرافت کی زبان نہ سمجھتے ہوں ان کے ساتھ یہی سلوک کرنا پڑتا ہے۔“

”آغا صاحب!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری خفگی سے پوچھا۔

”آپ تو کریم سے ملاقات بھی کر چکے ہیں۔ کیا ہم دونوں میں اتنی مشابہت ہے کہ انخوا والے مشن میں آپ بھوکا کھا گئے؟“

”آپ مشابہت کی بات کر رہے ہیں بیگ صاحب!“ وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ”سیم آؤں آپ اور کریم ایک دوسرے کی کافی ہیں۔“

”اوہ۔“ میں ایک گہری سانس لے کر رو گیا اور تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ”کریم تو بہت خطرناک بندہ ہے۔ کبھی وہ شرم بیگ بن کر میرے گھر میں یا میرے دفتر میں یا کورٹ میں پہنچ گیا تو کیا ہوگا؟“

”کریم صاحب! آپ سے یہ میری درخواست ہے کہ آپ اپنے رویے سے مسلسل فریال کی حوصلہ شکنی کرتے رہیں۔ باقی کی باتیں میں خود اسے سمجھا دوں گا۔“

”ہاں ٹھیک ہے بالکل۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ فکر نہ کریں میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔“

”ایک بات اور.....!“ آغا جمال نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ یہ بھی کوشش کریں گے کہ فریال کے ساتھ لمبی چوڑی میٹنگز نہ رکھیں بلکہ زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ آپ بڑی صفائی کے ساتھ آہستہ آہستہ فریال سے تعلق قائم کریں۔“

”اوکے میں اسے زبانی کلامی باتوں میں ہی نال دیا کروں گا۔“ کریم نے بڑی فرماں برداری سے کہا۔

”اور رفتہ رفتہ اس سے الگ ہو جاؤں گا۔“

”کریم صاحب! اگر آپ نے اپنا کہا نبھایا بھی دکھایا تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔“

آغا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”جناب میں نے کہا نا! آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

”اگر شاء اللہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

”آپ ایک عظیم آرٹسٹ ہیں۔ فی وی کی دنیا کا سرمایہ ہیں کریم صاحب!“ آغا نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے امید ہے آئندہ فریال کے سلسلے میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا پڑے گی۔“

”شیور..... تعینا.....!“

☆ ☆ ☆

آغا جمال نے اپنی بات کو تکمیل تک پہنچایا اور خاموش مگر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی

خود کو ایسی شخصیات سے منسوب اور منسلک کرنے کی دھن میں لگ جاتی ہیں جو پہلے سے معاشرے میں کسی مقام پر فائز ہوتے ہیں۔“ میں نے لمحائی توقف کے بعد ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”فریال کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیگ صاحب! وہ مضطرب انداز میں بولا۔“ آپ نے تو فریال کی ذات کا ایک سرے کر دیا۔ کچھ عرصہ پہلے اسے ماورائی علوم سمجھنے کا شوق اٹھ تھا۔ مجھے اس کے پاس نیلی پتھری اور پٹانزم وغیرہ کے موضوعات پر کئی کتابیں بھی نظر آئی تھیں۔ انہی میں ایک کتاب شاید ہم زاد کے موضوع پر بھی تھی لیکن.....“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر متذہب انداز میں مجھ سے کہنے لگا۔

”لیکن کیا آغا صاحب!“ میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

”لیکن!“ وہ اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”یہ کہ پھر ماورائی علوم میں اس کی دلچسپی معدوم ہوتی چلی گئی۔ میں نے اسے تبدیل پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ آپ کا تجزیہ بالکل درست ہے۔ وہ کتابوں سے مایوس ہو کر کریم کی طرف متوجہ ہو گئی اور اب تو یہ معاملہ بالکل اوپن ہو چکا ہے مگر.....!“ وہ توقف کر کے سوالیہ نظر سے مجھ سے دیکھنے لگا۔

”مگر کیا؟“ میں نے فوراً پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ”آپ اس پتھر میں فریال کی زندگی کے اس پہلو پر اتنی تفصیل سے کیوں گفتگو کر رہے ہیں؟“

”تاکہ کریم والے مسئلے کو حل کر کے آپ کی پریشانی کو دور کیا جاسکے۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں بیگ صاحب!“ وہ میرے سپاٹ انداز پر تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ”آپ کوئی نفسیاتی معالج نہیں یا کیل؟“

”کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں اضافہ ہو گیا اور وہ عجب خیر نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بیگ صاحب! آپ ایک ایڈووکیٹ ہیں میں چاہوں گا کہ آپ کسی قانونی طریقے سے میرے مسئلے کو حل کر دیں۔!“

”میں بھی یہی کر رہا ہوں آغا صاحب!“ میں نے پراسرار انداز میں کہا۔ ”آپ کی بیٹی کا مسئلہ آپ کی پریشانی قانونی طریقے سے نہیں بلکہ نفسیاتی طریقے سے حل کی جاسکتی ہے۔ اگر آپ نے زبردستی کرنے کی کوشش کی یا کوئی ایسا ویسا راستہ اختیار کیا تو بیٹی آپ کے ہاتھوں سے نکل جائے گی۔ وہ پوری طرح کریم کے ٹرانس میں پھنسی ہوئی ہے۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ کریم آپ کے ہاتھ نہیں چڑھا.....!“ میں نے ڈرامائی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا اور ایک گہری سانس چھوڑنے کے بعد سلسلہ کلام کا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”آغا صاحب! اگر آج آپ راجو اور راجو جیسے اپنے دوسرے ہندوں سے کریم کی دھلائی کروا دیتے تو وہ اپنی اس بزمیت کو کسی بھی قیمت پر بھولنے کو تیار نہ ہوتا۔ یہ قصداً کی زبانی فریال تک پہنچتا۔ اس واقعے کے بعد فریال آپ سے نفرت کرنے لگی اور میں ممکن ہے کہ وہ آپ کو چھوڑ کر.....!“

”ایک منٹ!“ وہ ہاتھ اٹھا کر قطع کلامی کے انداز میں بولا۔ ”میں نے جو پلاننگ کی تھی اس کی روشنی میں کریم کبھی یہ نہ جان سکتا تھا کہ میں نے اسے اغوا کرانے کے بعد زد و کوب کر دیا ہے۔ لہذا وہ فریال کو اپنی ٹھکانی بچھائی کے بارے میں تو بتا سکتا تھا لیکن وہ

اس کا ردوائی کو مجھ سے منسوب نہیں کر سکتا تھا۔“

”کیا یہ بگلا آپ کا نہیں ہے؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میرا ہے۔“

”اگر بد قسمتی سے کریم اغوا ہو کر یہاں پہنچتا تو وہ اس روت اور جنگ کے محل وقوع کو ضرور ذہن نشین کر لیتا جیسا کہ میں نے کیا ہے اور ہا آسانی دوبارہ بھی یہاں آ سکتا ہوں۔“ میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”جب اصلی کریم بچے کھنے کے بعد یہاں سے جاتا تو اور اپنی اسی شونگ کا احوال فریال کو سناتا تو وہ فوراً سے پیش تر سمجھ جاتی کہ کریم کے ساتھ ہونے والی کارروائی میں کس کا ہاتھ ہے۔“

”اس جنگ میں میری رہائش نہیں ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں کہیں اور رہتا ہوں۔ ایک ماہ بعد یہاں شفٹ ہونے کا ارادہ ہے۔ لیکن بہر حال.....!“ وہ لمحائی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”آپ کی بات میں وزن ہے۔ اگر کریم فریال کو اس جنگ کی لوکیشن سے گاہ کرنا تو وہ سمجھ جاتی کہ کریم کو میرے ہی ایما پر اغوا کر کے مار پیٹ کی گئی ہے۔“

”اور اس خطرناک آگاہی کے بعد وہ ویسے ہی رد عمل کا مظاہرہ کرتی جس کا تھوڑی دیر پہلے میں نے ذکر کیا ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

آغا جمال نے ایک جھرجھری لی اور سر اسید نظروں سے مجھ سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اللہ کا شکر ہے میں نے کریم کے بجائے آپ کو اغوا کر لیا ہے۔ میں نے غصے اور پریشانی میں اس نازک نکتے کو فراموش کر دیا تھا۔“

اگر آپ کے سامنے بیٹھ کر کوئی کہے کہ اللہ کا شکر ہے میں نے آپ کو اغوا کر لیا تو آپ کا جی جل اٹھے گا لیکن وہ پتھر میں ایسی تھی کہ میں کسی جارحانہ رد عمل کا مظاہرہ کرنے کے بجائے زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔

آغا نے مجھ سے پوچھا۔ ”بیگ صاحب! تھوڑی دیر پہلے آپ نے بڑے وثوق سے کہا ہے کہ فریال والے معاملے کو قانونی طریقے سے نہیں بلکہ نفسیاتی طریقے سے حل کیا جاسکتا ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے بڑے اعتماد سے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اس کیس میں میں بالکل ایسا ہی سمجھ رہا ہوں۔“

”ذرا مجھے بھی تو بتائیں۔“ وہ تشویش بھرے اشتیاق سے بولا۔ ”آپ نے اپنے ذہن میں آخر کیا سوچ رکھا ہے۔“

میں نے اپنے ذہن میں اس مسئلے کے حل کے لیے جو کچھ سوچ رکھا تھا اس کی تفصیل میں جانے بغیر آغا جمال سے پوچھا۔

”آغا صاحب! یہ بتائیں کہ میری محض شکل صورت ہی کریم سے ملتی ہے یا نقد کا ٹھہ بھی اسی کے جیسا ہے؟“

”میں نے جس حد تک کریم کا جائزہ اور مشاہدہ کیا ہے اس کی رو سے تو آپ اور کریم کے قد و قامت اور نقش و نگار میں ذرا سا بھی فرق نہیں ہے۔“ وہ میری جانب دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”جیسی تو میں نے اغوا کے سلسلے میں دھوکا کھایا ہے۔“

”آواز اور لب و لہجے کے سلسلے میں آپ کیا کہتے ہیں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ چند لمحوں سوچنے کے بعد بولا۔ ”اس انہیں میں کا فرق سمجھ لیں۔“

43 اتفاقاً

2011-10-31 2

منصوب کیا بنایا ہے۔“

فریال کریم سے ملی تھی۔ ان کی یہ ملاقات ایک ریستوران میں ہوئی تھی۔ مجھے ان دونوں کے لباس کے بارے میں تفصیل بتا دیا گیا تھا۔ اس سے قبل میری فرمائش کے عین مطابق آغا جہاں نے مجھے فریال کی عدم موجودگی میں اپنے بنگلے کا تفصیلی معائنہ کرا دیا تھا۔ خصوصاً فریال کے کمرے میں آمدورفت کے راستے کو میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔ میں نے آغا جہاں کو اپنی پلاننگ سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے میری بات توجہ سے سننے کے بعد کہا تھا۔

”بیگ صاحب! آپ نے مجھے جو کچھ بھی سمجھایا ہے۔ وہ خاصا سنسنی خیز ہے۔ لیکن میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ اس پروگرام پر عمل کر کے ہمیں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوگی۔“

”لیکن مجھے صد فی صد یقین ہے کہ ہم کامیاب بھی ہوں گے اور آپ کا مسئلہ بھی ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”بس آپ میری ہدایات پر عمل کرتے جائیں۔“

”میں اب تک اور کیا کرتا آرہا ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”مگر چہ مجھے آپ کی پلاننگ میں زیادہ مضمحل نہیں آتا لیکن پھر بھی میں آپ کی ہدایت پر پوری طرح عمل کر رہا ہوں۔“

”میری بات ماننے میں ہی آپ کا بھلا ہے آغا صاحب!“ میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”آپ دیکھتے جائیں گے کیا ہوتا ہے۔“ میں نے نحالی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”میری نظر میں آج کی رات بہت اہم ہے۔ میری بھرپور اداکاری آپ کی پراہم مصلحت کر دے گی۔“

مجھے اپنے منصوبے پر مکمل اعتماد ہے۔“ ”اوکے!“ آغا جہاں نے اثبات میں گہرے دہانے اور پوچھا۔ ”بتائیں اب مجھے مزید کیا کرنا ہوگا۔“

”آپ یہاں سے سیدھے کھڑ جائیں اور اپنے گھر کے اندر موجود رہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں آغا کو ہدایات دیں۔ ”میں آٹھ ساڑھے آٹھ یا زیادہ سے زیادہ نو بجے تک دفتر سے فارغ ہو جاتا ہوں۔ لیکن اگر اس سے پہلے بھی آپ کا فون آگیا تو میں کام سمیٹ کر نکل کھڑا ہوں گا۔ اہم پوائنٹ یہ ہے کہ آپ مجھے کب فون کریں گے۔“

میں نے ذرا دیر کو رک کر استفسار یہ نظر سے آغا جہاں کو دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔

”ہاں بیگ صاحب! یہ سوال میرے ذہن میں بھی ابھر رہا ہے۔“ ”اس سوال کا جواب یہ ہے۔“ میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کہ جب آپ کی بیٹی فریال گھر آجائے اور دوبارہ اس کے باہر نہیں جانے کا ارمان موجود ہو۔“ ”دو عمو آٹھ سے پہلے ہی گھر آجانی ہے اور پھر دوبارہ گھر سے نکلتی نہیں۔“ آغا نے بتایا۔ ”بہر حال میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں آپ کو فون کر دوں گا۔“

”آج کی رات آپ نے اور میں نے جس اسکرپٹ کے تحت اداکاری کرنا ہے وہ سب آپ کو یاد ہے نا آغا صاحب؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں یاد ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں اپنی اداکاری سے آپ کو مایوس نہیں ہونے دوں گا۔“

”اور آپ بھی میری اداکاری کو دیکھ کر افسانہ کر

انہیں گے۔“ میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ ”آپ کی نشان دہی پر میں نے کریم کے ڈرامے کے بعض سین دیکھے ہیں۔ اس کی نشست و برخاست اور لب و لہجہ کی نقالی کرنا میرے لیے مشکل ثابت نہیں ہوگا۔“ ”اوکے دیکھتا ہوں آپ کیا کمال دکھاتے ہیں۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔

وہ بہت زیادہ پر امید دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن میں نے بھی اسے زیادہ تسلی دلا سادینے کی کوشش نہیں اور ان الفاظ کے ساتھ اسے رخصت کر دیا تھا۔

”ٹھیک ہے آغا صاحب! آپ کے فون کے دس پندرہ منٹ کے بعد میں آپ کے بنگلے پر ہوں گا۔“ اور اب میں آغا جہاں کے بنگلے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ رات کے لگ بھگ ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ میں نے اپنی گاڑی کو نذرہ بنگلے سے سونزدہ ایک گلی میں پارک کیا اور نیچے تلے قدم اٹھاتے ہوئے بنگلے کے گیٹ پر پہنچ گیا۔

ہمارے درمیان یہ طے ہو گیا تھا کہ آغا جہاں مجھے فون کرنے کے بعد اپنے بنگلے کے گیٹ میں بنے ہوئے چھوٹے سے دروازے کو اندر سے کھول دے گا لیکن دروازے کا پٹ بھڑار ہے گا تاکہ مجھے بنگلے کے اندر داخل ہونے کے لیے نہ تو ناک کرنا پڑے اور نہ ہی ٹکھنی بچنا پڑے۔

پروگرام کے مطابق میں نے چھوٹا دروازہ کھولا اور بنگلے کے اندر داخل ہونے کے بعد نذرہ دروازے کی کنڈی لگا دی۔

تھوڑی سی دیر کے بعد میں آغا جہاں کے ساتھ بنگلے کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے فریال کے بارے میں پوچھا۔ اس نے اشارے ہی میں جواب دیا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے۔ ہم نے طے شدہ پروگرام کے مطابق

ادکاری شروع کر دی۔ اس پروگرام کی رو سے ہمیں با آواز بلند ایک دوسرے سے باتیں کرنا تھیں۔ انداز بالکل لڑائی جھگڑے والا گرم گرم تلخ کلامی کا تھا ہماری آوازیں فریال کی سماعت تک رسائی حاصل کریں اور وہ فوراً سے پیش تر یہ دیکھنے کے لیے ڈرائنگ روم میں پہنچ جائے کہ خروباں ہو کیا رہا ہے۔“

ہماری کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ چند لمحات کے بعد فریال ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی پھر جیسے ہی اس کی مجھ پر نگاہ پڑی۔ وہ ٹھٹھک گئی۔ میں حیرت بھرے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ وہ ایک نہایت ہی حسین و جمیل و شیرہ تھی۔ اس نے سرخ پینٹ پر لوز گرین ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے ریشمی بال کھلے ہوئے تھے۔ تاہم اس نے ایک سرخ اسکارف کی مخصوص بندش سے سر ڈھانپ رکھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بے یقینی سے بولی۔

”کریم! تم! اور یہاں!؟“ ”میرے بجائے آغا جہاں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ہاں فریال! یہ تمہارا دوست کریم ہی ہے جسے تم عظیم فی وی آرٹسٹ اور تے جانے کیا کیا تھیں۔ اس سے اتنا متاثر ہو کہ یہ جاننے کے باوجود بھی کہ یہ شادی شدہ ہے اور ایک چار سالہ بچی کا باپ بھی ہے۔ تم اس کی آس لگائے بیٹھی ہو اور اس سے شادی کرنے کے لیے بھی تیار ہو لیکن! آغا نے نحالی توقف کے بعد ڈرامائی انداز میں کہا۔

”لیکن یہ بتاتے ہوئے مجھے سخت شرمندگی محسوس ہو رہی ہے کہ تمہارا یہ عظیم دوست بہت ہی گھٹیا انسان ہے۔ اس نے نہ صرف تمہاری بلکہ میری بھی بہت بے عزتی کی ہے۔“

ایک دوسرے سے کتنی شہید محبت کرتے ہیں۔
”مذاق..... محبت.....“ میں نے قطع کاوی
کرتے ہوئے عجیب روکھے انداز میں کہا۔ ”فریال
اس بات کا یقین کرلو کہ میں اس وقت بالکل مذاق
کے موڈ میں نہیں ہوں۔ چند روز پہلے تمہارے باپ
نے میری بے عزتی کی تھی۔ میں نے تمہیں اس
ملاقات کے بارے میں بتایا بھی تھا۔ آج تو میں اپنی
انسٹلٹ کا بدلہ لینے آیا ہوں۔ آغا جمال کو یہ بتانے آیا
ہوں کہ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کو سنبھال کر قابو میں رکھیں۔
میں تمہیں بلاتا نہیں ہوں بلکہ تم اصرار کر کے مجھ سے
ملنے آئی ہو اور جہاں تک محبت کا حلق ہے.....!“
میں نے دانستہ توقف کیا ایک کنبھیر سانس خارج کی
اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”فریال! تم کیلی لڑکی نہیں ہو جو مجھے پسند کرتی
ہو۔ مجھ سے ملتی ہو مجھ سے باتیں کرتی ہو۔ تم جیسی
درجنوں لڑکیاں میری فین ہیں اور مجھ سے محبت کرتی
ہیں۔ وہ بھی تمہاری طرح مجھ سے ملتی ہیں۔ میرے
ساتھ وقت گزارتی ہیں۔ میں اپنی ہر فین ہر چاہنے
والی سے محبت کرتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب بخور
ہے کہ میں ان سے شادی بھی کروں گا۔ یہ سب میری
اچھی دوست ہیں بالکل تمہاری طرح۔“

”لیکن میں تحریف دوست نہیں ہوں تمہاری۔“ وہ
میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے جارحانہ لہجے
میں بولی۔ ”میں تمہاری دوسری فیئر سے بہت مختلف
ہوں۔ تم نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا ہے کریم اب تم
پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔“

”یہ جھوٹ ہے مجھ پر ایک سنگین الزام ہے۔“
میں نے احتجاجی لہجے میں کہا پھر آغا کی طرف دیکھتے
ہوئے بولا۔

”آغا صاحب! میں نے فریال کی موجودگی میں

ہوں۔ چند روز پہلے آپ بھی میرے پاس آئے تھے۔“
اور مجھے طیش میں کھری کھری سنائی تھیں۔ آج میں
بھی آپ کو کھری کھری سناتے آیا ہوں۔ آپ ہر ری
ملاقات کو تو نہیں بھولے ہوں گے۔“

”تمہیں بھولا بھول ہی نہیں سکتا۔“ آغا جمال نے
جذباتی اداکاری کے جوہر دکھاتے ہوئے کہا۔ ”جب
فریال کو تمہانے کی میری تمام تر کوششیں ناکام ہو گئی
تھیں تو میں نے براہ راست آپ سے ملاقات کی تھی
اور.....!“ آغا کی آواز بھرا گئی۔ ”میں نے اس
ملاقات میں آپ سے درخواست کی تھی کہ فریال کا
پتہ چھپا چھوڑ دیں۔“

”اور آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ میں نے کیا جواب دیا
تھا؟“ میں نے فریال کو بدستور نظر انداز کرتے ہوئے
آغا جمال سے پوچھا۔

اس نے برا سامنا نہ بناتے ہوئے بتایا۔ ”آپ نے
کہا تھا کہ آپ کو فریال میں کوئی دلچسپی نہیں وہی ہاتھ
دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔“
فریال کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا
لیکن میں اس جذبات کی پروا کیے بغیر بڑی سنگ دلی
سے بولا۔

”ہاں! حقیقت یہی ہے۔ میں نے فریال کو کوئی
مرتبہ سمجھایا ہے کہ میں نیوی بیچوں والا ہوں دوسری
شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن یہ کچھ بھی ماننے
نہیں کو تیار نہیں۔ میں بہت لمبا لے کی کوشش کرتا
ہوں۔ مگر یہ پھر مجھ سے ملنے چلی آئی ہے۔ آج دوپہر
میں بھی ہم ریلوے سٹیشن میں بیٹھے ہوئے تھے
اور.....!“

”کریم.....!“ فریال اچانک پھٹ پڑی۔ میری
بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس نے کہا۔

”پلیز اس مذاق کو بند کر دو اور پاپا کو بتاؤ کہ ہم

”پاپا جانی! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ وہ حیرت
سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔ پھر میری جانب
دیکھتے ہوئے بے یقینی سے پوچھا۔ ”کریم.....!“ یہ
سب کیا ہے؟“

اس مرتبہ بھی آغا جمال ہی نے فریال کو اٹینڈ کیا
اور اپنے برابر میں خالی صوفے کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے غصے آمیز لہجے میں کہا۔

”آؤ..... تم بھی یہاں بیٹھو اور دیکھو جس کا ذکر
کرتے ہوئے تم تھکتی نہیں ہو اس کی نظر میں تمہاری
کیا حیثیت ہے۔ آج تمہیں اپنی غلطی کا بخوبی اندازہ
ہو جائے گا۔“

فریال کے چہرے پر مجھے حد درجہ الجھن نظر آئی۔
اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اسے یقین
آ گیا تھا کہ کریم ہی ہوں۔ میں نے اس وقت نیوی
بلیو پینٹ پر گروے کلر کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں
میں بلیک شوز تھے اور بالوں کا اسٹائل بھی میں نے
کریم جیسا ہی بنا لیا تھا۔ کریم بھی آج دوپہر میں
جب فریال سے ملا تو اس نے اسی کلر کا لباس زیب تن
کر رکھا تھا۔ لہذا فریال کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ
گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ میں کریم نہیں بلکہ کوئی اور
ہوں۔ رہی سہی کسر میں نے اپنی (کریم) کی
اداکاری سے پوری کر دی۔

آغا جمال کی فرمائش پر جب وہ مذکور صوفے پر
بیٹھ گئی تو آغا نے میری طرف دیکھتے ہوئے ترش
لہجے میں کہا۔ ”جی کریم صاحب اس الو کی سچی کو
بتائیں کہ یہاں کیا لینے آئے ہیں۔“

وہ دونوں میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں
نے ایک اچھٹی سے نگاہ فریال پر ڈالی پھر اس کے باپ
سے مخاطب ہوتے ہوئے غصے آمیز سنجیدگی سے کہا۔

”آغا صاحب! میں اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے آیا

آپ کے سامنے اپنی پوزیشن کلیئر کر دی ہے۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔ آج کے بعد اگر یہ مجھ سے ملے گی تو اس کی ساری ذمہ داری آپ پر ہوگی۔“ میں نے دیکھا فریال اندر بنی اندر بیچ و تاب کھا رہی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ مجھے جارحانہ اور مزہ توڑ جواب دیتی آغا جمال نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”فریال! دیکھ لیا تم نے.....! اس عظیم انسان کی اصلیت کیا ہے۔ تم اس کی محبت کے فریب میں الجھ کر مجھ سے دور ہو گئی تھیں۔ تم یہ سمجھ رہی تھیں کہ میں تمہاری محبت کا دشمن ہوں تم نے.....!“

”ایک منٹ آغا صاحب!“ میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی لقمہ دے دیا۔

”میں نے کسی کو فریب نہیں دیا۔ آپ یہ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ میری فریال سے صرف دوستی تھی۔ میں نے کبھی اس سے شادی کا وعدہ نہیں کیا اور اب تو.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر جذباتی لہجے میں کہا۔

”اب تو یہ دوستی بھی ختم ہی سمجھو۔ میں نے تمہاری دوستی میں بہت ذلت اٹھائی فریال۔ آج سے ہمارے راستے جدا ہیں۔ آئندہ کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔“

کبھی اتفاق سے اگر ہمارا سامنا بھی ہوا تو میں بالکل اجنبی بن جاؤں گا تمہیں پہچاننے سے صاف انکار کر دوں گا۔“

”تم.....!“ وہ میری جانب اٹکی اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”کریم تم اس طرح بدل جاؤ گے۔ یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔“ بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔

”شاید میں نے تمہیں جاننے اور پہچاننے میں غلطی کی ہے۔ تم ایک فریبی اور دھوکے باز سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہو۔“

اس کی آواز شدت جذبات سے بوجھل ہو رہی تھی۔ میں نے فاصلہ خنک گاتے ہوئے کہا۔ ”فریال! میں دھوکے باز اور فریبی نہیں ہوں۔“

”میں ہی اندھی ہو گئی تھی۔“ وہ شپٹاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تم بھی اندھی نہیں ہو۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بس مسئلہ یہ ہے کہ تم بدقسمتی سے فین ہو۔ تمام فین کی ایک کامن سائیکلی ہوتی ہے۔ وہ جس کے پرستار ہوتے ہیں۔ اس کو اپنی پراپرٹی سمجھنے لگتے ہیں اور خیالوں ہی خیالوں میں اسے اپنی زندگی کا ہم سفر بنانے کا خواب دیکھنے.....!“

”بند کرو کلاس!“ وہ غصیلے انداز میں قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آنکھ بار لہجے میں دہرائی۔

”زیادہ مابہر نفسیات بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ دفع ہو جاؤ میرے گھر سے اور آئندہ کبھی مجھ سے رابطہ کرنے یا ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ اسنو پڑکھیں گا۔“

میں بھی یکا یک اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور چہرے کے اثرات سے ایسا ظاہر کرنے لگا جیسے اس کے الفاظ نے بے عزتی سے زیادہ مجھے خجالت میں مبتلا کر دیا ہو۔ اس نے نفرت آمیز انداز میں مجھ پر نگاہ ڈالی اور پاؤں پیچ کر ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے آغا جمال کی طرف دیکھتے ہوئے ایک آنکھ دہائی اور انگلیں کھینچ کر مخصوص انداز سے ”ویل ڈن“ کا اشارہ کیا پھر سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ میرا ہجہ

دھیمار ہے۔

”آغا صاحب! آپ کل کسی وقت میرے پاس آ جائیں باقی باتیں کل ہی ہوں گی۔“

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ زبان سے خاموشی ہی رہا۔

میں نے کہا۔ ”کل وحید کو حد سے زیادہ مستعد رہنا ہوگا۔ امید تو نہیں ہے کہ فریال اب کریم کی طرف رخ کرے لیکن محبت کے معاملات میں لڑکیاں بڑی جذباتی ہوتی ہیں اور انڈیل کی محبت تو اور بھی قیمتی ڈھالی ہے۔ اس بات کا امکان نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ آج کے روپے کے لیے فریال کریم سے استفسار کرے یا یہ بھی ممکن ہے وہ فریال سے رابطہ کرے اور آج والے واقعے کی سرے سے تردید ہی کر ڈالے.....!“

وہ تشویش بھری نظر سے مجھ سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”اگر ایسا ہوا تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی.....!“

”کچھ نہیں ہوگا آغا صاحب!“ میں نے لہجے کو بدستور دھیمار رکھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

”میرے پاس ہر توڑ کا جوڑ اور ہر جوڑ کا توڑ موجود ہے۔ آپ کل کے دن فریال کی کڑی نگرانی کروائیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اس نے تائیدی انداز میں سر کو اٹھاتی جھٹکی دی۔

میں نے کہا۔ ”اب میں چلتا ہوں ان شاء اللہ کل ملاقات ہوگی۔ آپ فریال کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔“

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں اس کے جھٹکے سے نکل آیا۔

.....☆☆☆.....

مجھے اس بات پر شدید حیرت تھی کہ میں نے اتنی

اچھی اداکاری کیسے کر لی۔ عدالت کے کمرے میں عموماً ڈرامائی اداکاری کے مواقع تو میسر آتے ہی رہتے ہیں لیکن گزشتہ رات آغا جمال کے ہنگام پر جو کچھ پیش آیا تھا وہ ایک منفرد نوعیت کا ٹھیٹھ کیس تھا اور فریال کا میری اداکاری سے متاثر ہو جانا اس بات کا بین ثبوت تھا کہ میں اس کیس میں پورے نمبروں سے پاس ہو گیا تھا۔

آئندہ روز شام میں آغا جمال میرے دفتر آ کر مجھ سے ملا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا رپورٹ ہے آغا صاحب!“

”سب امان دامن ہے۔“ اس نے بوجھل انداز میں جواب دیا۔

وہ خاصا تھکا اور الجھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں میز پر آگے کی طرف جھک آیا اور دم وردی بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ”آغا صاحب! آپ کافی پریشان نظر آ رہے ہیں۔ سب ٹھیک تو ہے؟“

”فریال کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ”کل والے واقعے کا اس نے بہت اثر لیا ہے۔ اپنے کمرے میں بند ہے۔ آج کا پورا دن وہ گھر سے باہر نہیں نکلی۔“

”جب انسان کے خواب ٹوٹتے ہیں تو اس کی یہی حالت ہو جاتی ہے اور لڑکیاں تو ان معاملات میں کچھ زیادہ ہی حساس ہوتی ہیں۔“ میں نے گہری تنقید سے کہا۔ ”آغا صاحب! آپ کے ہاتھ ایک اچھا موقع آ گیا ہے۔ اگر آپ ان لمحات میں محبت سے اسے سمجھائیں گے اور اس کے دل میں اثر جائیں گے تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کریم کو بھول جائے گی۔ پھر بھی غلطی سے بھی وہ کریم کو یاد نہیں کرے گی۔“

”کوشش تو کر رہا ہوں۔“ اس نے مصہومیت

آغا جمال میرے پہلو میں موجود تھا اور اس کی سماعت بھی فریال ہی کی آواز پر لگی ہوئی تھی۔ میں جس ردِ بینک انداز میں فریال سے بات کر رہا تھا وہ یقیناً آغا کو ناگوار مڑ رہا ہوگا لیکن یہ وقت اور پکڑیشن کی مجبوری تھی۔ ذرا سے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے یہ سب ضروری تھا۔ فریال کی نفرت کے جواب میں میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”میں جانتا ہوں فریال! تم مذاق میں غصہ دکھا رہی ہو۔ تم کسی بھی قیمت پر مجھ سے نفرت نہیں کر سکتیں۔“
”یہ تمہاری بھول ہے بے وقوف انسان۔“ وہ طنز یہ انداز میں بولی۔ ”میں بغیر کسی قیمت کے تم سے نفرت کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی۔“
”آخر میری خطا تو بتا دو۔“ میں نے معتدل لہجے میں کہا۔

”تم نے کل رات میرے گھر پر آ کر جو کچھ کیا ہے کیا اسے بھول گئے ہو۔“ وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ ”یہ تمہاری اتنی بڑی خطا ہے کہ میں قیامت کے روز بھی تمہیں معاف نہیں کروں گی۔“

”اوکم آن یار!“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔
”وہ سب ایک ٹنٹ ہے تمہارے پاپا نے چند روز پہلے میری اسلٹ کی تھی۔ میں نے سوچا کہ ذرا انہیں چھٹی اپنی اداکاری کی ایک جھمک دکھا دوں۔“

”چلو مجھے میں جی تمہاری اداکاری۔“ وہ طیش کے عالم میں بولی۔ ”تمہارے رویے نے مجھے پاپا کی نظر میں کرا دیا ہے۔ میں نے تو تمہاری خاطر ان کی ناراضی اور مخالفت بھی مول لی تھی اور تم نے مجھے بری طرح بے عزت کر دیا۔ میں اب تمہارے کسی فریب میں نہیں آؤں گی۔ آئندہ مجھ سے ملنے یا فون کرنے کی کوشش نہ کرنا۔“

”یار۔۔۔ اب غصہ تھوک بھی دو۔۔۔!“ میں نے

دوسرے مرحلے پر آپ کیا کرنے جا رہے ہیں۔“
”اس مرحلے پر عمل کرنے کے لیے ہمیں پی سی او تنک جانا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”میں ابھی دفتر سے اٹھنے والا ہوں۔ آپ بھی میرے ساتھ آ جائیں۔“
اس نے ابھرن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔
”پی سی او؟“

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”آپ آئیں تو سہی۔۔۔؟“
ہم آفس سے نکل کر ایک پبلک کال آفس پہنچ گئے۔ میں نے آغا کے گھر کا نمبر ملایا اور فون کا آپٹیکر آن کر دیا تاکہ فریال کے جذبات آغا تک پہنچ جائیں۔

پانچویں یا چھٹی تھنی پر دوسری طرف سے ریسپور اٹھا لیا گیا۔ پھر فریال کی بھرائی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔ ”ہیلو۔۔۔۔۔!“

”ہیلو فریال۔“ میں نے کریم کی آواز کی بھرپور نقالی کرتے ہوئے کہا۔ ”جان من کسی ہو۔۔۔۔۔؟“
”کون ہو تم؟“ فریال نے جھنجھٹا ہٹ آمیز لہجے میں پوچھا۔

میں نے شاکی انداز میں کہا۔ ”اچھا تو اب میں کون ہو گیا۔ مائی ڈیئر ایسی بددلی اچھی نہیں ہوتی۔“
”کون اس بند کرو کریم!“ وہ دہاز سے مشابہ آواز میں بولی۔ ”مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنا۔“

”شکر ہے پہچان تو لیا۔“ میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں تو سوچ رہا تھا تمہاری یادداشت واپس لانے کے لیے مجھے ان محبت بھرے لمحات کا ذکر کرنا ہوگا۔“

”ذلیل انسان بک بک بند کرو۔“ وہ ترخ کر بولی۔ ”تمہاری ناپاک زبان پر محبت کا لفظ اچھا نہیں لگتا۔ میں تم سے شدید نفرت کرنے لگی ہوں۔“

بھرے لہجے میں کہا۔ ”آگے اللہ مالک ہے۔“
”آغا صاحب! اللہ تو مالک ہے ہی اور وہ انسان کی کوشش کا صلہ بھی ضرور دیتا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”آپ نے بتایا ہے کہ آج فریال گھر سے نہیں نکلی۔ کیا کریم نے بھی اس سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟“

”میرا خیال ہے نہیں کی۔“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ”اگر کس کا کوئی فون آیا ہوتا تو فریال مجھ سے ضرور ذکر کرتی، میں محسوس کر رہا ہوں وہ میرے بہت قریب ہو گئی ہے۔۔۔۔۔!“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس موقع پر آپ اس کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کر سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کاروباری مصروفیات نے آپ کو مٹی سے کافی دور کر دیا تھا۔ یہی یہ صورت حال پیش آئی۔۔۔۔۔!“

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بیک صاحب! میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں اور اب یہ میری کوشش ہوگی کہ میں فریال کو باقاعدہ وقت دیا کروں۔“

”ڈیس گز۔۔۔۔۔!“ میں نے ستائشی انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”کیا اس وقت فریال گھر میں موجود ہے؟“
”میں تو اسے گھر پر ہی چھوڑ کر آیا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے اسے گھر پر ہی ہونا چاہیے۔ آج رات ہمیں ڈنر کے لیے باہر جانا ہے۔ میں ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے آپ کے پاس آیا ہوں۔ یہاں سے سیدھا گھر جاؤں گا۔“

”کیا خیال ہے آغا صاحب!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”میں نے جو کس کچڑا ہے اس کے دوسرے مرحلے پر عمل نہ کر لیا جائے؟“

”دوسرا مرحلہ؟“ وہ چونک کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔
میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”جی آغا صاحب! میں نے فریال کو راہِ راست پر لانے کی جو ذمہ داری اٹھائی ہے بالفاظِ دیگر اسے ہی وی آر سٹ کریم کے چنگل سے نکالنے کا جو عزم کیا ہے۔ وہ میرے لیے ایک کیس کی حیثیت کا حامل ہے کیونکہ میں نے اس کام کے لیے آپ سے ایک بھاری معاوضہ وصول کیا ہے۔“ میں نے بخاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے اسے لائحہ عمل کو مرحلہ وار تین حصوں میں بانٹ رکھا ہے۔ گزشتہ رات میرے پروگرام کے پہلے حصے پر عمل ہو چکا۔ دوسرے حصے پر میں ابھی آپ کے سامنے عمل کروں گا اور تیسرے حصے کی باری کل رات کو آئے گی۔ مجھے امید ہے کہ اس کے بعد آپ کا مسئلہ مکمل طور پر حل ہو جائے گا۔ فریال نہ صرف یہ کہ کریم سے شدید نفرت کرنے لگے گی بلکہ پروگرام کا تیسرا حصہ اس کے دل و دماغ پر ایک ایسی دہشت بھادے گا کہ وہ زندگی بھر کریم کے بارے میں سوچنے کی کوشش بھی نہیں کرے گی۔“

”اگر میں نے آپ کے ڈاکومنٹس نہ دیکھے ہوتے تو ابھی آپ کے وکیل ہونے کا مجھے یقین نہ آتا۔“ وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیونکہ آپ کا اسٹائل اور حرکتیں وکلاء سے بہت مختلف ہیں۔“
”آغا صاحب! شناخت کے مراحل طے ہو چکے۔ اب پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔“
”ٹھیک ہے۔“ وہ ہمدن کوش ہو گیا۔ ”بتائیں

بے تکلفی سے کہا۔
”یاد تم اپنی ماں کے ہو گئے۔“ وہ ایک دم جھٹکے سے
اکھڑ گئی۔ ”مجھے تمہاری کوئی بکواس نہیں سننا۔“
ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے جھٹکے سے ریسیور
کریڈل پر رکھ دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فریال نے
ریسیور کو کریڈل پر نہیں بلکہ میرے منہ پر دے مارا ہو۔
میں نے فون رکھنے کے بعد آغا جمال کی طرف
دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا کہتے ہیں آغا صاحب؟“
”سیرب..... مائنڈ بلیونگ.....“ وہ تعریفی
انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
”بیگ صاحب! آپ نے تو کمال کر دیا۔ آپ کو
شوہر جو ان کرنا چاہیے۔ آپ کی اداکاری لا جواب
ہے باس.....!“
”آغا صاحب!“ میں نے زیر لب مسکراتے
ہوئے کہا۔ ”اگر میں وکالت چھوڑ کر شوہر میں چلا گیا
تو اس بات کے روشن امکان ہوں گے کہ ایک دن
میں بھی کریم بن جاؤں اور کسی فریال کو سہانے خواب
دکھا کر اس کے باپ کسی آغا جمال کو زہنی عذاب میں
جتلا کر دوں۔“ میں نے لمحاتی توقف کر کے کانوں کو
ہاتھ لگائے اور کہا۔
”نہ بابائے میں وکیل ہی اچھا ہوں۔“
”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیگ
صاحب!“ وہ سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے
بولا۔ ”شوہر کا نشہ بڑا خوف ناک ہے۔ میں یہ تو نہیں
کہتا کہ اس دنیا سے تعلق رکھنے والا ہر شخص کریم جیسا
ہوتا ہے لیکن جو بھی اس جیسا ہوتا ہے وہ درجنوں
والدین کی نیندیں حرام کر کے رکھ دیتا ہے۔“ لمحاتی
توقف کر کے اس نے ایک جھرجھری لی پھر تھہرے
ہوئے لہجے میں کہا۔
”آپ وکالت کرتے رہیں یہی اچھا ہے۔“
میں کہا۔ ”میں آپ سے انعامی تھن ضرور وصول کروں
میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”اب تو آپ کو کوئی
پریشانی نہیں ہوگی؟“
”بہت بہت شکریہ بیگ صاحب!“ وہ ممنونیت
بھرے انداز میں بولا۔ ”ابھی ابھی میں فون پر فریال
سے آپ کی میرا مطلب ہے کریم کی جو بات ہوئی
بھلا اس سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ بھونرے پر لعنت بھیج
چکی ہے۔ اب وہ بھی پلٹ کر کریم کی طرف نہیں
دیکھے گی۔ اس کا کرودگی کے لیے تو آپ کو ذیل فیض
ملنا چاہیے۔“
”میں اپنی طے شدہ فیس آپ سے وصول کر چکا
ہوں آغا صاحب!“ میں نے زیر لب مسکراتے
ہوئے کہا۔ ”ایک کیس کی دوبارہ فیس لینا اچھا نہیں
لگتا۔ میرے لیے یہ بات بڑی اطمینان بخش ہے کہ
آپ کی ٹینشن دور ہوئی۔ میں اسی میں خوش ہوں۔“
”بیگ صاحب!“ وہ عقیدت بھرے انداز میں
میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آج وہ کچھ زیادہ ہی
مہربان نظر آتا تھا۔“ آپ اپنی فیس وصول کر چکے ہیں
اچھی بات ہے۔ آپ وہ بارہ فیس نہیں لینا چاہتے یہ
اور بھی اچھی بات ہے لیکن آپ مجھے انعامی تھن دینے
سے تو نہیں روک سکتے۔ میں کل آپ کی خدمت میں
کچھ پیش کروں گا۔ آپ کی محنت اور کامیابی کی
صورت میں اور..... آپ انکار نہیں کریں گے۔“
”کل نہیں..... پرسوں!“ میں نے گہری سنجیدگی
سے کہا۔
”پرسوں!“ وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔
”کل کیوں نہیں بیگ صاحب!“
”آغا صاحب! میں آپ کے غلوں کی تہہ دل
سے قدر کرتا ہوں۔“ میں نے غصے سے ہوئے لہجے
میں کہا۔ ”میں آپ سے انعامی تھن ضرور وصول کروں
میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔“

گناہ گناہ کا کم ختم کرنے کے بعد.....“
”میں تو بھڑا ہوں آپ کا کام مکمل ہو گیا۔“ اس نے کہا۔

”نہیں آغا صاحب!“ میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ابھی میرے کام کا آخری مرحلہ باقی ہے۔“
”آخری مرحلے کو اب بھی آپ ضروری سمجھتے ہیں؟“ اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔
”میرے خیال میں فریال راہ راست پر آ چکی ہے۔ اب وہ بھی بھول کر بھی کریم کا خیال اپنے دل میں نہیں لائے گی۔“

”بظاہر ایسا ہی نظر آ رہا ہے۔“ میں نے گھمبیر انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں انکلیشن کا علاج پیرا سینامول کے بجائے پراپر اسٹینی بائیونک سے کرنے کا عادی ہوں۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں بلکہ صاحب!“ اس نے مختصر انداز میں میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے اپنا تعارف ایک وکیل کی حیثیت سے کرایا پھر آپ نے ایک نفسیاتی معالج کا رول پلے کیا اور اس رول میں اداکاری کے عمدہ جوہر دکھائے اور اب.....!“ اس نے لمحائی توقف کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”اور اب ایک ڈاکٹر کے روپ میں سامنے آ رہے ہیں۔“

ہم بی بی او سے نکل کر باتیں کرتے ہوئے اپنی گاڑیوں تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے آغا کے تہرے کو نظر انداز کرتے ہوئے گھمبیر انداز میں اپنا بیان جاری رکھا۔

”محبت اور عشق کا بخار ایک خطرناک انفیکشن کی مانند ہوتا ہے۔ یہ عام سی ادویہ سے نہیں کیا جاتا۔ اس کے لیے باقاعدہ اسٹینی بائیونک کا کورس کرنا پڑتا ہے۔ جو کم از کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ دن کا ہوتا ہے۔“

اسٹینی بائیونک کے استعمال کے دوسرے یا تیسرے روز سے زیادہ تیسرے روزی مریض کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ٹھیک ہو گیا کیونکہ بخار غائب ہو چکا ہوتا ہے لیکن مریض کی اس بحالی کو دیکھ کر اسٹینی بائیونک کو روکا نہیں جاتا بلکہ اسے مکمل کورس تک جاری رکھا جاتا ہے۔ یہی اچھے حال فریال کے علاج کا بھی ہے۔“ میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے فریال کے علاج کو مرحلہ وار تین حصوں میں بانٹ رکھا ہے۔ دو حصوں پر مکمل در آمد ہو چکا۔ آپ کو یہی محسوس ہو رہا ہے کہ فریال ٹھیک ہو گئی ہے۔ اب اسے مزید کسی علاج کی ضرورت نہیں لیکن یہ آپ کی بھول ہے میں علاج کے تیسرے اور آخری مرحلے کو از حد ضروری سمجھتا ہوں۔“

وہ عقیدت بھری آنکھ سے مجھ دیکھتے ہوئے بولا۔
”ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔ بتائیں تیسرے مرحلے کے لیے مجھے آپ سے کیا تعاون کرنا ہوگا۔“
میں نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ غہر غہر کر آغا جہاں کو اپنے پروگرام سے آگاہ کرنے لگا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پلپکتی چلی گئیں۔

رات اپنا آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکی تھی۔ میں ایک مرتبہ پھر آغا جہاں کے بیٹنگے میں موجود تھا اور آغا کے تعاون کے باعث میں فریال کے ہیڈ روم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ فریال کے کسی بھی فوری رد عمل کے لیے میں نے آغا کو اچھی طرح بریف کر دیا تھا اور اس نے میری ہدایت پر من و عنین عمل کرنے کا یقین بھی دلا تھا۔

فریال اپنے ہیڈ پر بے خبر سو رہی تھی۔ میں اس کے سر ہانے کی طرف آ گیا اور اسے چھوئے بغیر ایک رومال کی مدد سے اسے جیکے کی کوشش کرنے لگا۔

آغا کو میں نے کمرے کے باہر ایک ایسی جگہ تعینات کر دیا تھا جہاں خود کو پوشیدہ رکھتے ہوئے وہ بیدار رہ سکتا تھا۔ آغا جہاں ایک باپ تھا۔ اس کو بہر حال یہ حق پہنچتا تھا کہ اپنی بیٹی کے ساتھ ہونے والے سستی خیز تجربے کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔

میری کوشش بار آور ثابت ہوئی اور فریال نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی پھر نہایت ہی غصیلے لہجے میں بولی۔
”تمہاری یہ ہمت کہ میرے بیدار رہنے میں گھس آئے.....؟“

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”فریال! مجھے غلط مت سمجھو.....!“

”وضع ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ چیخ سے مشابہہ لہجے میں بولی۔ ”کریم! اب میں تمہارے کسی فریب میں نہیں آؤں گی۔“

”میں کریم نہیں ہوں۔“ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔

”کوئی نیا دھوکا!“ وہ بیڈ سے نیچے اتر آئی۔ ”فورا سے پیش تر میرے کمرے سے نکل جاؤ ورنہ میں شور مچا دوں گی۔“

”میں نے پہلے تم سے کوئی فریب کیا ہے اور نہ ہی اب دھوکا دینے کا ارادہ ہے۔“ میں نے بدستور ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”بلکہ میں اس وقت تمہیں ایک بہت ہی سنجیدہ حقیقت سے آگاہ کرنے آیا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں بی بی او آرٹس کریم نہیں ہوں ویسے اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ ہو تو تم شور مچانے والا شوق پورا کر سکتی ہو.....!“

شور مچانے کے بجائے وہ ڈھلکتی ہوئی سے نظر سے مجھ دیکھنے لگی پھر خامے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”اگر تم

کریم نہیں تو پھر کون ہو؟“
”میں کریم کا ہم زاد ہوں۔“ میں نے انکشاف آمیز لہجے میں جواب دیا۔

”اوہ..... مائی گاڈ.....!“ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے وحشت زدہ انداز میں پیچھے ہٹی۔

اس کے عقب میں ایک قدم پر اس کا بیڈ تھا۔ وہ بیڈ کے اوپر جا بیٹھی اور کبھی ہوئی نظر سے مجھ دیکھنے لگی۔ میں نے نہایت ہی تحمل انداز میں کہا۔

”فریال! مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ اگر تم میری باتیں تو جسے سن لو گی تو تمہارا ذہن صاف ہو جائے گا۔“

وہ منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر یک دم مجھ سے ٹک گئی۔

میں نے اپنے منصوبے کے تیسرے حصے کو تکمیل تک پہنچاتے ہوئے کہن شروع کیا۔

”فریال! پرسوں رات تمہارے بیٹنگے پر جو واقعہ پیش آیا تھا اور کل رات ٹیلی فون پر ہماری جو گفتگو ہوئی اس کے بارے میں بی بی او آرٹس کریم کو کوئی خبر نہیں۔ یہ سارا چکر میرا اچلا یا ہوا ہے میں نے.....!“

”اگر تم کریم کے ہمراہ ہو تو پھر ایسا کیوں کر رہے ہو؟“ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے سوال کر ڈالا۔

فریال نے ماواری علوم خصوصاً ہمزاد کے موضوع پر بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ جب آغا جہاں نے مجھے فریال کے بارے میں یہ معلومات فراہم کی تھیں۔ اسی وقت سے میرے ذہن نے اس زاویے پر سوچنا شروع کر دیا تھا اور میں نے گہری سوچ بچار کے بعد اس معاملے کو اپنے کام کے تیسرے پورٹن میں رکھ لیا تھا۔ ابھی تک حیرت انگیز طور پر فریال نے پیچھے چلانے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن میں اس سوال سے

افضل راجیل..... حضرت کیلیا نوالہ شریف
پردیس میں سونا تھا تو چھت کس لیے ڈالی
باہر ہی نکلتا تھا تو گھر کس کے لیے تھ
مرزا نصیر احمد بیگ..... فیصل آباد
پھول دامن پہ سجائے پھرتے ہیں وہ لوگ
جن کو نسبت ہی نہ تھی کوئی چمن سے یارو
محمد ظفر اللہ ضیا..... کمالیہ
پتھر تراشنے میں ہوئیں انگلیاں فگار
چکر بنا تو اس کے خریدار آ گئے
غلام احمد ڈگر..... کمالیہ
پھول مر جھائے گل دان بھی گر کر نونا
کسی خوشبو میں بسے ہیں درود یار اب تک

تمہاری اس سے بات ہوئی ہے تو وہ دن تمہاری زندگی
کا آخری دن ہوگا۔
بات ختم کرتے ہی میں نے اس کی گردن کو آواز
کر دیا اور سبک قدم اٹھاتے ہوئے بیڈ روم سے باہر
نکل گیا۔ مجھے اپنے عقب میں فریال کی بیجان خیز
آواز سنائی دی لیکن میں نے پلٹ کر دیکھنا سب نہ
کچھا۔ وہ آغا جمال سے کہہ رہی تھی۔
”ڈیڈی..... کریم کا مزو اور اس جارہا ہے۔ آپ
اسے پکڑ لیں۔ پلیز ڈیڈی آپ اسے شوٹ کر دیں۔
مجھے دھمکی دے کر گیا ہے۔ جان سے مارنے کی
دھمکی ڈیڈی اسے جانے نہیں دیں۔ پکڑ کر پولیس کے
حوالے کر دیں اسے۔“

اگلے روز آغا جمال شام میں مجھ سے منفا نس
آیا اور ایک خوب صورت پینٹنگ والا بائس میری
جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اب آپ انعامی تحفہ
لینے سے انکار نہیں کر سکتے۔ آپ کا کام مکمل ہو گیا
ہے۔“
میں نے شکریے کے ساتھ وہ گفٹ قبول کر لیا اور
کہا۔ ”فریال کی طبیعت کیسی ہے؟“
”بیگ صاحب! آپ بہت خطرناک آدمی
ہیں۔ وہ خوف زدہ نظر سے میری طرف دیکھتے
ہوئے بولا۔ ”رات کو آپ نے تو میری جان ہی نکال
لی تھی۔ ہر لمحے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ آپ کی ہدایات کو
بھول کر فریال کے سامنے ایک سپور ہو جاؤں گا۔“
”اللہ کا شکر ہے کہ آپ ایک سپور نہیں ہوئے۔“
میں نے ٹھہرے ہوئے گجھ میں کہا۔ پھر پوچھا۔
”آپ نے فریال کی طبیعت کے بارے میں کچھ
نہیں بتایا؟“
”رات کا باقی حصہ تو بہت پریشانی میں گزارا صبح
تک میں نے فریال کو سنبھال لیا تھا۔“ اس نے بتایا۔

یہی کبھی کہ میں گلا دبا کر اسے موت کے گھاٹ
اتارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔
آغا اس کے بیڈ کے قریب پہنچ کر ڈرامائی لہجے
میں پوچھا۔ ”کیا ہوا بیٹی!“ اس کے استفسار سے
مصنوعی تشویش جھلک رہی تھی۔ ”تم اس طرح کیوں
ڈری سہی پڑی ہو۔“
”آپ دیکھ نہیں رہے ڈیڈی!“ فریال کی پھنسی
پھنسی آواز نکلی۔
”کیا..... میں کیا نہیں دیکھ رہا؟“ آغا نے حیرت
بھرے لہجے میں پوچھا۔
”..... یہ کریم کا..... مزو.....! خوف کے
مارے فریال کی آنکھیں پٹی جا رہی تھیں۔ ”میرا گلا
دبا رہا ہے۔ یہ مجھے جان سے مار ڈالنا چاہتا ہے۔“
”لگتا ہے تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے۔“
آغا نے مصنوعی ابھمن کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
”اسی بے انٹی سیدھی باتیں کر رہی ہو.....!“
”ڈیڈی.....! یہ مجھے مار ڈالے گا.....!“ وہ ملجھتی
لہجے میں بولی۔ ”اسے روک لیں پلیز پلیز ڈیڈی
میری ہیلپ کریں۔“
”بیٹی! مجھے تو تمہارے کمرے میں کوئی نظر نہیں
آ رہا۔“ آغا نے ہم دردی بھرے انداز میں فریال کی
طرف دیکھا۔
آغا میری ہدایت کے عین مطابق عمدہ اداکاری کا
مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس موقع پر میں نے جھک کر فریال
کے کان میں سرگوشی کی۔
”یہ بیڈ تھا..... تمہارا باپ نہ تو مجھے دیکھ سکتا ہے اور
نہ ہی میری آواز سن سکتا ہے تم خواہ مخواہ مت چلاؤ۔ اس
مرتبہ میں تمہیں زندہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ سمجھ لو کہ
فرسٹ اینڈ لاسٹ چانس دے رہا ہوں۔ اگر مجھے پتا
چلا کہ تم نے پھر کبھی کریم سے ملنے کی کوشش کی ہے یا

بے خبر نہیں تھا۔ اگر وہ ایسی کوئی حرکت کرتی تو اس کے
توڑکے لیے میرے اسکرپٹ میں بہت ہی جذباتی
اور سنسنی خیز مین موجود تھے اور ان سیز میں آغا کا کردار
غائب تھا۔
میں نے فریال کے استفسار کے جواب میں کہا۔
”میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم فی وی آرڈر کریم
سے دور رہو۔ اس سے بھی ملنے کی کوشش نہیں کرو۔
اسے بھول جاؤ اور اگر کبھی وہ تم سے رابطہ یا ملنے کی
کوشش کرے تو تم اسے پہچاننے سے انکار کر دو۔“
میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج
کی پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔
”اگر میری باتیں تمہاری عقل میں بیٹھ جائیں
تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ یہ صورت
دیگر.....!“ میں نے بڑے خوف ناک انداز میں
جملہ اوصاف چھوڑ دیا۔
وہ بکھرے ہوئے لہجے میں مستغفر ہوئی۔ ”یہ
صورت دیگر کیا.....؟“
”یہ صورت دیگر میں تمہاری جان لے لوں گا۔“
میں نے بڑے جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھتے
ہوئے کہا پھر دونوں ہاتھ اس کی گردن کی سمت بڑھا
دیے۔ ”ایسے گلا دبا کر میں تمہیں ہلاک کر دوں گا۔“
اس کی برداشت جواب دے گئی۔ اس نے
سراسیمہ انداز میں چیخ ماری اور اپنے باپ کا وازدی۔
”ڈیڈی!“
آغا جمال اپنی بیٹی کی پکار پر الفاظ دیگر میری
ہدایات کے عین مطابق فریال کے بیڈ روم میں پہنچ
گیا۔ فریال چیخ مارتے ہوئے بستر پر ڈھسے لی گئی۔
میں نے عملاً اس کا گلا دبانے کا مظاہرہ شروع کر دیا
تاہم میں نے ہاتھ ہلکا رکھا تھا لیکن وہ چونکہ اس
چوتھین میں بری طرح دہشت زدہ ہو چکی تھی۔ لہذا وہ

فریال پر حملہ آور نہیں ہوگا۔“
”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے بیگ صاحب!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔
”اس مرحلے پر میں آپ کو ایک مفید مشورہ ضرور دوں گا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ماننا نہ ماننا آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔“
”جناب! آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“ وہ ابھمن زدہ انداز میں بولا۔
”آپ کوئی مشورہ دیں اور میں نہ مانوں۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔“
”آپ پہلی فرصت میں کوئی معقول سارشتادیکھ کر فریال کی شادی کر دیں۔“ میں نے کہا۔
”آپ نے تو میرے دماغ کی بات چرائی ہے بیگ صاحب!“ وہ پر جوش لہجے میں بولا۔ ”میں رات والے واقعے کے بعد خود بھی اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔“
”میری دعا ہے اللہ آپ کو اس کوشش میں جلد از جلد کامیابی عطا کرے۔“ میں نے خلوص دل سے کہا۔
”آمین.....!“ وہ جلدی سے بولا۔
میں نے اخلاقی طور پر پوچھ لیا۔ ”میرے لائق اور کوئی خدمت ہو جوتا میں؟“
”جناب! کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔“ وہ لچا جنت آمیز انداز میں بولا پھر ایک بہ یک اس کی آنکھوں میں شرارت سی جاگی اور اس نے مجھ سے پوچھا۔
”بیگ صاحب! ایک بات سچ سچ بتائیں گے۔“
”جی پوچھیں آغا صاحب.....!“ میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔
”آپ ٹمربیک ایڈوکیٹ ہیں یا ٹی وی آرٹسٹ کریم کا ہمزاد.....!“
میں نے بے ساختہ ایک تہقید لگایا اور کہا۔ ”آپ

کے لیے ٹمربیک ایڈوکیٹ اور آپ کی صاحبزادی کے لیے کریم کا ہمزاد.....!“ میں نے لمحائی توقف کر کے ایک پرسکون سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
”آغا صاحب! آپ صدیوں نہیں تو برسوں سے یہ محاورہ سنتے آئے ہوں گے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ میں نے اپنی زندگی کے تجربے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بھوت دراصل دو نسلوں کے ہوتے ہیں۔ لاتوں کے اور باتوں کے اور جس طرح لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے اسی طرح باتوں کے بھوت لاتوں سے نہیں مانتے۔“
”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا بیگ صاحب!“ وہ سوالیہ نظرتے مجھے دیکھنے لگا۔
”میں سمجھتا ہوں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”کریم لاتوں کا بھوت ہے اور فریال باتوں کا بھوت۔ آپ نے کریم کو باتوں (نصیحت) سے سمجھ کر اور فریال کو لاتوں (ڈانٹ ڈپٹ) سے سمجھ کر دیکھا لیکن مسئلہ حل نہیں ہوا۔ جب آپ نے کریم پر لاتوں والا فارمولا آزمائے گا پروگرام بنایا تو میرے آپ کے ہتھے چڑھ گیا اور پھر فریال کو باتوں کی طاقت سے سیدھا کر دیا۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“
وہ تائیدی انداز میں سر ہلانے لگا۔ وہ میرے فلسفے سے کلی طور پر اتفاق کر رہا تھا۔ میں زیر لب مسک کر رہ گیا۔

۵

طرف لکے لیکن ان کے راستے میں آسٹروی فوج کی دیوار حائل تھی۔

اب شیراز آسٹروی پیادوں کے ہتھوں ہتھ اکیلا رہ گیا۔ معاً اس کے دل میں خیال آیا اور اپنے گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ اس کی تلوار بدستور حرکت میں تھی اور اس نے لڑتے لڑتے اپنے مد مقابل سے پوچھا۔

”کلاؤ یوس کہاں ہے؟ تمہارا بڑا دل سردار۔ اسے کہو شیراز تمہیں بلا رہا ہے۔ جاؤ۔ اسے میرے پاس بھیجے۔ جانے۔“

شیراز نے مد مقابل کو زیر کرنے کے بعد چھوڑ دیا۔ اب وہ کسی کے ساتھ بھی پیچہ آزمائی کر رہا تھا۔ اس سے یہ بات کہہ رہا تھا لیکن کسی نے شیراز کو نہ بتایا کہ کلاؤ یوس لشکر میں نہیں ہے۔ اب شیراز گھوڑے پر سوار نہیں تھا۔ وہ دشمن کی صفوں کو چیرتا ہوا آسٹروی لشکر کی طرف بڑھنے لگا۔

مسلمانوں کا پلڑا بھاری تھا۔ غروب آفتاب سے پہلے ہی جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ آدھے سے زیادہ عیسائی مارے جاتے تھے اور باقی سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دینے میں ہی اپنی عافیت بھی گئی۔ شیراز کے علم پر مسلمانوں نے بھی ہتھیار روک لیے۔ میدان جنگ میں ہر طرف عیسائیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ شیراز ابھی تک کلاؤ یوس کو ہی ڈھونڈنے میں مصروف تھا لیکن کلاؤ یوس اسے کہیں نظر نہیں آیا۔

اب مسلمان سپاہی مال غنیمت سینے میں مشغول ہو گئے۔ ہندوہ موئے فریب آسٹروی فوجیوں کو زنجیروں میں جکڑ کر ایک طرف کھڑا کر دیا گیا تھا۔ ان کے بارے میں فیصلہ شیراز کو کرنا تھا۔ قیدیوں کی قطار میں سب سے آگے مادام تھرویشا سر جھکائے کھڑی تھی۔ مادام تھرویشا پر نظر پڑی تو شیراز چونک سا گیا کیونکہ ایک ایک اسے اپنی ہم جماعت تھیوڈورا کا خیال آیا۔ تھیوڈورا کہاں تھی؟ تھیوڈورا شیراز کو کہیں نظر نہ آئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دونوں بہن بھائی نہیں چلے گئے تھے۔

اور رزم گاہ کی مٹی خون سے لٹھڑی ہو گئی۔ شیراز کی نگاہیں مسلسل کلاؤ یوس کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

آج وہ اس شان دار معرکے میں کلاؤ یوس کے ساتھ پھسلے سارے حساب چکاتا چاہتا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار مسلسل یلغار کرتا ہوا عیسائیوں کی صفوں کو چیرنے لگا۔ مسلمان عیسائیوں کے مقابلے میں کم تھے۔ شیراز تیز رفتاری کے ساتھ یہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے صرف بارہ سو واروں کو اپنے ہمراہ لیا۔ آسٹروی زمین پر تھے اور مسلمان گھوڑوں پر۔ موت کو اپنے سامنے کھینچ کر آسٹروی سپاہی اپنی جان بچانے کی فوج سے ملنے لگے۔ چنانچہ جلد ہی ان کے پاؤں میدان میں جم گئے اور وہ ڈٹ کر مسلمانوں کا مقابلہ کرنے لگے۔

شیراز کے سپاہیوں کو گھوڑوں سے اترنا پڑ رہا تھا کیونکہ آسٹروی پیدل سپاہی ان کے گھوڑوں کی ٹانگیں کاٹ کر انہیں زمین پر گرانے لگے تھے۔ درے کی اوپری پہاڑیوں میں شمشیریں نکلانے کی گونج عجیب طرح کا ساز پیدا کر رہی تھی۔ یہاں سے لوہا نکلانے کی بازگشت تھی۔ ساتھ میں چیخ و پکار، آہیں، سسکیاں اور گراہیں مل کر اس درے کو انتہائی براسرار بنا رہی تھیں۔ شیراز مسلسل تلوار چلا رہا تھا۔ اسے ابھی تک کوئی گھوڑے سے گرانے میں کامیاب نہ ہوا تھا۔

سورج مغرب کی طرف جھکنے لگا۔ شیراز کی بے چین نگاہیں ہر شخص کو کلاؤ یوس سمجھ رہی تھیں لیکن کلاؤ یوس اسے کہیں نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ شیراز کی نگاہ مادام تھرویشا پر جا پڑی۔ مادام تھرویشا خود اپنے دستوں کی قیادت کر رہی تھی۔ وہ ایک گھوڑے کی پشت پر سوار تھی چیخ و گراہ کا مات صادر کر رہی تھی۔ شیراز نے اپنے پہلوؤں میں موجود ترک سپاہیوں سے کہا۔

”اس عورت کو زندہ گرفتار کرنا ہے اور یہ کام تم کرو گے، میں نہیں۔ مجھے کلاؤ یوس سے لڑنا ہے۔ اس فوج کے سپہ سالار کلاؤ یوس سے۔“

شیراز کی بات سننے ہی ترک افسر مادام تھرویشا کی

اس بار دینے والی چوٹس نے اسے اور حیرت زدہ کر دیا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا مرد اور عورت کے ڈھانچے سے کچھ خاص فرق ہو سکتا ہے کیونکہ ایکس نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے یہ اندازہ ہو کہ انسانی ڈھانچوں میں کس صنف کا ڈھانچا زیادہ اہمیت رکھتا ہے وہ خود بھی یہ اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ میڈیکل کی تعلیم کے لیے مرد یا عورت کے ڈھانچے میں سے کون سا زیادہ اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے او ر کیوں؟ اس کے تردد کو پیٹر نے شاید محسوس کر لیا تھا۔

”اگر آپ میرا کہنا نہیں جناب تو عورت کو ترجیح دیں دراصل عورتوں کے ڈھانچے جمع کرنا میرے لیے زیادہ آسان ہوتا ہے اس کے علاوہ ان کے خوب صورت وجود بھی نگاہ کو تسکین دیتے ہیں۔“ وہ اپنی بات کرتے کرتے رک گیا اس نے اپنے مقابل کے چہرے پر ایسے تاثرات دیکھے جیسے وہ اٹھ کر ابھی پیٹری کی بیانی کر رہے گا یہ بات واقعی اس کی برداشت سے باہر تھی۔

”کیا آپ اس ڈھانچے کو پیک کر وا کر لینا چاہیں گے؟“ پیٹر نے پھر پوچھا اور پھر ایک اندھیرے کارز کی طرف مڑ گیا۔ ”دراصل میں ڈھانچوں کو پیک کرنے کے لیے خاص قسم کا ہلکا والا کارڈ بورڈ استعمال کرتا ہوں۔“ پیٹر نے کہا۔

اس سے پہلے اس نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اس کو خریدنے کے بعد اپنے ساتھ کس طرح لے کر جائے گا لیکن اب وہ اس بارے میں سوچ رہا تھا کہ مقررہ تاریخ پر پیک ڈھانچا جو ایک کارڈ بورڈ کے بکس میں ہو گا وہاں لے آئے گا وہ اسے خود اٹھائے گا اور پھر کیا وہ بڑا بکس کسی ٹیکسی میں بھی آ جائے گا؟ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے پیٹر نے اس کی سوچ پڑھ لی ہو۔

دیتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”بالکل جناب ہم آپ کو ایک ہفتے میں بہترین آرٹ کا نمونہ پیش کریں گے۔“ سائے نما شخص نے کہا۔

”آرٹ کا نمونہ؟“

”جی ہاں کیا آپ اس کا سائز بتانا پسند کریں گے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ بڑے سائز کو پسند کریں گے یا چھوٹے سائز کو؟“

اس سوال پر وہ اسے چند لمحوں تک حیرت سے دیکھتا رہا تھا کیونکہ یہ سوال اس کی توقع کے خلاف تھا وہ خوف ناک شخص اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے کوئی درزی کسی لمبوس کی تیاری کے وقت گاؤں سے کرتا ہے اس کے سامنے کاؤنٹر پر ایک چھوٹی نوٹ بک رکھی تھی اور اس نے اپنی پتلی پتلی انگلیوں کے درمیان میں ایک پینسل پکڑی ہوئی تھی۔ اس کی انگلیوں پر زخموں اور جلنے کے نشان تھے جو اس کے زرد زرد انگیوں پر عجیب سے ٹک رہے تھے۔

”اس..... اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔“ چند لمحوں بعد اس نے کہا وہ اپنی خواہش پوری ہوتے دیکھ کر عجیب سی کیفیت کا شکار تھا اب اس کی کوئی عجیب سا تحفہ خریدنے کی خواہش پوری ہونے والی تھی۔

”میں پسند کروں گا جناب کہ چھوٹا ڈھانچا لیں۔“ خوف ناک شکل والے نے کہا وہ اپنی نوٹ بک پر کچھ لکھتا بھی جا رہا تھا۔ ”دراصل چھوٹے ڈھانچے ڈیوڑ کرنا میرے لیے ذرا آسان بھی رہتا ہے اور یہ زیادہ محفوظ طریقہ بھی ہے۔ اب آپ یہ بتائیں کہ آپ مرد کا ڈھانچا لینا پسند کریں یا عورت کا؟“

اس بار پھر وہ حیرت سے پیٹر کا منہ تک رہا تھا۔

آنکھیں بھی زرد تھیں اور حیرت سے اس کی طرف تنک رہی تھیں ان آنکھوں میں زندگی کی کوئی رفق نہیں تھی پیٹر کو دیکھ کر یوں لگا تھا جیسے وہ کوئی زندہ لاش ہو اس کے علاوہ اس خوف ناک زندہ لاش میں سے ایک عجیب قسم کی ناگوار بو جو پوری دکان میں پھیلی ہوئی تھی اور یہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ یہ بو کس قسم کی ہے بس اسے یہ احساس تھا کہ اس نے یہ خوش بو پہلے بھی نہیں سونگھی تھی وہ شاید کسی جانور کی خوش بو تھی یا پھر..... یا پھر اس کی سمجھ میں اس سے آگے کچھ نہیں آیا بنیادی طور پر وہ ایک سادہ انسان تھا اور شاید ان چند لمحات میں وہ اپنی ساری زندگی سے زیادہ ذہین ہو گیا تھا۔

”تم یہ تو جانتے ہو گے کہ اس کام میں مجھے دو تین دن تو لگیں گے جب میرے ہاتھ کوئی انسانی لاش لگے تب ہی یہ کام ہو سکے گا کیونکہ فی الحال تو میرے پاس اسٹاک میں کچھ نہیں ہے۔“

”پھر کتنا عرصہ لگے گا؟“ اس نے پوچھا اس کے انداز میں بے صبری تھی اس سوال کے پوچھنے کے بعد بھی وہ خود میں یہ شدید احساس پارہا تھا کہ اسے اس عجیب و غریب دکان سے جلد از جلد بھاگ جانا چاہیے۔

”میرا خیال سے کم کم از کم ایک ہفتے میں اپنے تمام ذرائع سے بات کروں گا۔“

”ایک ہفتہ اوہ خدایا! اس نے تقریباً چنچنے ہوئے کہا۔“ میں ایک ہفتے تک انتظار نہیں کر سکتا کیونکہ تو.....!“ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور سوچا کہ اسے اتنی جلدی یہاں یہ بات نہیں بتانا چاہیے کہ اسے اپنی مطلوبہ چیز کسی کو تحفے میں دینے کے لیے چاہیے۔

”کیا تم ایک ہفتے میں مطلوبہ شے دینے کی گارنٹی

تعداد پوری ہوگئی۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ ایسی دوا کی آٹھ یا دس گولیاں کسی بھی انسان کو مارنے کے لیے کافی ہوتی ہیں مگر ڈک ایسا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ جس سے اس کا پروگرام ناکام ہو جائے۔۔۔۔۔ کیونکہ اسے صرف یہی ایک پہلا اور آخری موقع تھا۔ اس لیے اس نے اس تعداد سے زیادہ گولیاں اکٹھی کر لیں۔

اس پہلے مرحلے کی تکمیل کے بعد اب ڈک کو دوسرا کام یہ انجام دینا تھا کہ تھیلما کی خودکشی کا کوئی جذباتی پس منظر بھی پیدا کر دے اور اس موڑ پر ایک دوسرا شخص اس کے ذہن میں آیا۔ ڈک اس سے بھی اتنا ہی شدید متاثر تھا جتنا کہ تھیلما سے اور وہ شخص تھا بوب تھا۔

بوب تھا۔ مہسن ان کا ایک پرانا دوست تھا۔ جس کا اس مقام سے چند میل کے فاصلے پر ایک جزل اسٹور تھا۔ ڈک کے حادثے کے وقت بھی اس نے ان دونوں کی بہت مدد کی تھی وہ اپنا اسٹور کی روز کے لیے مقفل کر کے ہر وقت ڈک کے کمرے کے باہر موجود رہا تھا۔ اس کے بعد سے اس نے اپنا معمول بنالیا تھا کہ ہفتے میں دو روز وہ شام کو ملاقات کے لیے ان کے کانسج ضرور آتا اور تھیلما کی فہرست کے مطابق ضرورت کی اشیاء بھی ساتھ لے آتا۔

اس کی آمد کے کچھ ہی عرصے کے بعد ڈک کو محسوس ہونے لگا کہ بوب شام کو بہت جلدی آ جاتا ہے اور بہت دیر تک بیٹھا رہتا تھا۔ باب تھا مہسن ایک ملنسار اور ہنس کھٹا آدمی تھا۔ وہ تھیلما سے بھی ہمیشہ مسکرا کر باتیں کرتا تھا۔ اس کی یہ مسکراہٹ ڈک کی جارحانہ سوچوں میں مزید زہر گھول دیتی۔ وہ خوابوں میں بھی بوب کے فرضی قبضوں سے چونک چونک اٹھتا۔۔۔۔۔ اس کا فاسد ذہن اس وقت اسے بتاتا کہ اس

جاری رکھو اس طرح انگلیوں کی ورزش بھی ہوتی رہے گی۔“ تھیلما نے اپنا نرم پھول جیسا رخسار ڈک کے چہرے سے لگا دیا۔

”میں کبھی تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم مجھے اپنے دماغ سے سوچنے کا عادی بنا سکو۔“ وہ برہمی سے سوچتا۔

تھیلما ایک ننگی اس کے پیٹ پر جھادتی اور ڈک اس کے ساتھ بیڈ لگا کر لکھتا رہتا مگر تھیلما کے نام تو وہ ایسی باتیں لکھتا جو اس کے لیے باعث آزار ہو سکیں۔ مثلاً وہ لکھتا۔

”تم کیسے اس قدر خوش و خرم اور مسکراتی ہوئی دکھائی دیتی ہو جب کہ مجھے اس حالت میں پہنچانے اور یہاں قید کرنے کی ذمہ داری ہو۔“

ایسے بیانات پڑھ کر تھیلما کا معصوم اور حسین چہرہ رنج و غم سے سرخ ہو جاتا اور وہ فوراً ہی ڈک کے کمرے سے نکل جاتی پھر اگلا ایک گھنٹہ ڈک دوسرے کسی کمرے سے اس کی سسکیاں اور کراہیں سن سن کر نہایت تسکین اور آسودگی محسوس کرتے ہوئے گزارتا۔

ایک روز تھیلما نے ڈک کے منہ میں خواب آور گولی رکھی اور پانی اٹھانے کے لیے میز کی جانب جھکی تو ڈک نے وہ گولی اپنی زبان کے نیچے چھپائی اور پانی پی کر خاموشی سے لیٹ گیا۔ جیسے ہی تھیلما کمرے سے نکلی ڈک نے زبان کے نیچے چھپائی ہوئی گولی نکال کر تکیے کے نیچے رکھے ہوئے ایک خالی لفافے میں ڈال دی۔ اب اس نے ایک پروگرام بنالیا تھا اور اسی کے تحت وہ مقررہ مقدار تک خواب آور گولیاں جمع کر لینا چاہتا تھا۔ اتنی گولیاں جو تھیلما کو گہری نیند سلا سکیں۔۔۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔

اگلے چند ہفتوں کے دوران گولیوں کی وہ مقررہ

آسان فعل تھا اور کوئی بھی شخص ایک ایسے ایجاب اور مفلوج انسان پر اس کی موت کا محیرہ نہیں کر سکتا جو حرکت کرنا تو کچا زبان سے ایک لفظ تک ادا کرنے سے بھی قاصر ہو مگر اس کے بعد کیا ہوگا؟ پولیس اسے یہاں سے اٹھا کر کسی ریاستی ادارے میں داخل کراوے گی جو ممکن ہے اس ویران ساحلی بٹ سے کسی قدر بہتر ہی ہو مگر پھر وہ جگہ ہمیشہ کے لیے اور آخری ہوگی۔ وہاں سے کہیں اور جانے کا کوئی راستہ نہ ہوگا مگر اس کے برعکس اگر تھیلما سے نجات کا کوئی بہترین طریقہ دریافت کیا جائے تو ایسی صورت میں وہ جدید طبی ذرائع سے اپنے علاج اور ان تمام دلچسپیوں اور شہرت کی منزلوں کے متعلق بھی سوچ سکتا تھا جنہیں وہ دور کہیں بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

ڈک نے اس موضوع پر بہت سوچا۔ کئی ترکیبیں اس کے ذہن میں آئیں اور اس نے انہیں قابل عمل نہ پا کر رد کر دیا۔

وہ تھیلما کی نہایت اطمینان سے مگرانی کرنے لگا تاکہ کہیں سے تھیلما کی کوئی کمزوری اس کی گرفت میں آ جائے تو وہ اس کی بنا پر ایک مکمل فن انجام دے ڈالے۔

تھیلما نے ان دنوں محسوس کیا کہ مختلف اشیاء میں ڈک کی دلچسپی بڑھنے لگی ہے، اس کی آنکھیں اب پہلے جیسی سرد اور ٹھہری ہوئی نہیں ہیں بلکہ ان میں زندگی کی چمک دکھائی دینے لگی ہے۔

”تم اب اپنا خیال رکھنے لگے ہو، ڈارلنگ! اور تمہاری حالت میں بڑی تیزی سے نمایاں فرق ظاہر ہو رہا ہے۔“ تھیلما نے مسکرا کر کہا۔ ”میں تبدیلی تمہیں زندگی کی جانب لوٹ آنے میں بڑی مدد دے گی۔“

اب تو تمہارا دایاں بازو بھی بے حد جان دار نظر آ رہا ہے۔ میرا خیال ہے تم اپنے اس ہاتھ سے لکھنے کی مشق

اپنے ہاتھ کی ورزش جاری رکھو اور خوب کھاؤ پیو۔“ وہ محبت سے کہتی لیکن ڈک کو ایسی باتوں سے مزید آگ لگ جاتی وہ سوچتا کہ تھیلما شاید اسی طرح کہہ کر اسے احساس کمتری میں مبتلا کرنا چاہتی ہے تاکہ جب میں اپنے آپ میں کچھ کرنے کی ہمت نہیں پاؤں گا تو جلدی مر سکوں گا اور تھیلما یقیناً ایسا سوچنے میں حق بجانب بھی ہے۔ میری موت کے ساتھ اسے نہ صرف اڑھائی سو پاؤنڈ کی رقم بھی ملے گی بلکہ ایک ناکارہ اور مفلوج وجود سے اس کا چھپا بھی چھوٹ جائے گا۔

اپنے ایسے مفروضات اسے نہایت تشویش میں مبتلا کر دیتے اور پھر تھیلما کو مار ڈالنے کا جنون اور بھی بڑھ جاتا۔ اس کا دل چاہتا کہ تھیلما کو کبڑا کر بڑی طرح پیٹ ڈالے مگر گوشت کا بستر پر پڑا ہوا ذہیر کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سوائے بے لگام سوچنے کے۔۔۔۔۔

ایک روز جب تھیلما، ڈک کے سینے پر سر رکھے اسے ان پرندوں اور خوش نما مرغابیوں کے متعلق بتا رہی تھی جو اس نے علی الصبح ساحل کی شفاف موجوں کے ساتھ چمکتی ہوئی سنہری ریت پر دکھی تھیں تو ڈک نے نسبتاً اپنا کارآمد دایاں ہاتھ اٹھایا پھر اپنی انگلیاں بھینچ کر سوچنے لگا کہ وہ اپنے ایک ہی ہاتھ سے مار ڈالنے کی قوت بھی رکھتا ہے یا نہیں؟ اس روز کے بعد سے ڈک اکثر اپنے ہاتھ کو حرکت دینے کی مشق کرتا رہتا اور تقریباً پندرہ روز بعد اسے محسوس ہوا کہ انگلیوں کی گرفت میں اب کافی مضبوطی آ گئی ہے پھر چند روز اور گزر گئے تو اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ جب چاہے تھیلما کو قتل کرنے کے ارادے پر عمل پیرا ہو سکتا ہے۔

لیکن اب اسے قدرے بچھاہٹ ہی محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ قتل کر دینا تو اپنی جگہ ایک سادہ سا اور

”کیوں؟“ اس نے مجھ سے الگ ہوتے ہوئے سار کیا۔ ”باقی سب لوگ تو ٹھیک ہے ناں؟“ فائزہ بابا؟“

میں نے انگلیوں کی پوروں سے بیٹھکی ہوئی پلکیں ف کرتے ہوئے کہا۔ ”فائزہ اور بابا بھی مجھے چھوڑ ئے ہیں۔ بابا کو تو ان لوگوں نے تمہارے سامنے ہی ڈالا تھا لیکن فائزہ کے ساتھ ان درندوں نے بہت سلوک کیا تھا۔“ اتنا کہنے کے بعد میں نے اسے ی سرگزشت بلام و کا ست سنادی۔

چکے تھے۔ اس لیے ہم بے فکر ہو کر بیٹھے رہے۔ مشی کو میں نے اپنے آئندہ کے پروگرام کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ باتوں کے دوران ہم نے ایک دوسرے کے نئے موبائل فون نمبر لے لیے تھے۔ رخصت ہونے سے قبل میں نے مشی سے ایک درخواست کی۔ ”مشی مجھے سردار شیر افضل خان کا موبائل فون نمبر چاہیے۔ یقیناً اس کا نمبر راجا صاحب کے پاس ہوگا اگر غم.....!“

اس نے قطع کلامی کی۔ ”یہ نمبر تمہیں کس لیے

چند لمحے تو وہ سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھی رہی پھر رانی ہوئی آواز میں یوں۔ ”شاہو! یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں اگر اس وقت پاپا کو مجبور کر کے شیر دہ خشک کے خلاف رپورٹ درج نہ کرانی تو یقیناً جج بابا اور فاضلہ زندہ ہوتے۔“

چاہیے؟“

میں نے کہا۔ ”بس کوئی کام تھا اس سے۔“

اس نے مشکوک انداز میں پوچھا۔ ”تم کچھ چھپا رہے ہو شاہو! کیا مجھے نہیں بتاؤ گے؟“

”میں بھلا تم سے کوئی بات کیوں چھپاؤں گا؟ تم

”تمہیں اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ بوجھ منسلوک ہو رہی ہو۔ میں نے تو صرف ممبرانِ بزم میری ضد اور ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔ میں اگر بابا بابا مان لیتا تو شاید ایسا کچھ بھی نہ ہوا ہوتا۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا اور

شی اپنی پھیل ہوئی آنکھیں صاف کرنے لگی۔
 وہ چند لمحے تخمیر انداز میں میری طرف دھنکی رہی
 پھر مُسرت انداز میں بولی۔ ”شاہو! تم نے بالکل
 ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ میں خود تم سے یہ بات کہنے والی
 تھی۔ تمہارے
 میں نے قدرے توقف سے پوچھا۔ تمہارے
 اتھ اٹھو! نہ کیا سلوک کرتا تھا؟“

وہ بولی۔ ”پاپا کی وجہ سے انہوں نے دوسرے دن
 بھے راوی پنڈی پہنچا دیا تھا مگر موبائل اور میموری کارڈ
 عین لیا تھا۔ میری گاڑی بھی انہوں نے اسی روز
 بھی گریہ سوچ کر نہیں لی کہ شاید ہمیں برا لگے گا۔“
 ”چلو اب تو خوش ہو ناں کہ میں نے خود ہی یہ
 فیصلہ کر لیا۔“

ہاں پہنچاؤدی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے مٹی کہ تم محفوظ
ہوئی۔“ اس نے چپکٹی ہوئی

آواز میں جواب دیا اور میں دل ہی دل میں اس کی
سادگی پر مسکرا دیا۔ بے چاری اب بھی میرے ساتھ

زندگی بسر کرنے کے جھوٹے خواب دیکھ رہی تھی۔
جب کہ میں غقریب موت کی وادی میں قدم رکھنے

”اوکے“ کہہ کر انہوں نے چپ چاپ میرے استغنیٰ پر سائن کر دیے اور میرا حساب بے باقی کرنے کے بعد بولے۔ ”شاہ زمان! مجھے کبھی کسی ملازم کے جانے کا دکھ نہیں ہوا مگر آپ کے جانے کا دکھ مجھے ایک عرصے تک رہے گا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کی چھوڑی ہوئی سیٹ بہت جلد بڑھو جائے گی لیکن آپ والی بات نہیں ہوگی۔“

میں نے ممنون انداز میں کہا۔ ”سر! آپ کا بہت بہت شکریہ اگر زندگی نے مجھے دوبارہ سروس جوائن کرنے کی مہلت دی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے پاس ہی آؤں گا۔“ اس کے بعد ان سے اجازت طلب کرتے ہوئے میں آفس سے باہر نکل گیا۔

اس روز میں نے اپنے اکاؤنٹ میں موجود تمام رقم نکلوائی۔ جو تقریباً سو لاکھ روپے تھے۔ اب مجھے آئندہ کا لاکھ عمل طے کرنا تھا۔ میرے دشمن بہت طاقتور تھے۔ میں ان سے قانون کے دائرے میں رہ کر اپنا انتقام نہیں لے سکتا تھا۔ ویسے بھی میں نے ان کے خلاف قانونی جنگ لڑ کر اس کا نتیجہ جھگٹ لیا تھا۔ اس لیے اب یہ جنگ میں اپنے طریقے سے لڑنا چاہتا تھا۔ بہت دیر تک میں سوچتا رہا مگر جب مجھے انتقام لینے کا کوئی بہترین طریقہ نہ سوچا تو میں موز بائیک لے کر مشی کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا نمبر میرے چھن جانے والے فون میں رہ گیا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ فتح خان نے مشی کا

موبائل فون اسے واپس کر دیا ہوگا کہ نہیں؟
 آدھے گھنٹے کے بعد میں ان کی شاندار کوٹھی کے
 صدر دروازے پر پہنچ گیا۔ میں نے نمونر پائیک سائیز
 میں کھڑی کردی اور ڈور بیل پر انگلی رکھ دی۔ فوراً گیٹ
 کی ذیلی کھڑی کھلی اور چوکیدار کا چہرہ نمودار ہوا۔ یہ کوئی
 نیا آدمی تھا اور شکل و صورت سے شیریں لگتا تھا۔ اس

”خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم زندہ ہو۔ میں.....
 میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ تمہیں دیکھ کر مجھے کس قدر
 خوشی ہو رہی ہے۔“ وہ ہنسرت انداز میں بول رہی
 تھی۔ مگر میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے بھرائی
 ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہاں مٹھی! میں زندہ ہوں لیکن
 مردوں سے بدتر حالت میں ہوں۔“



محترم عمران صاحب!
السلام علیکم!

اہل طویل غیر حاضری کے بعد "مار آسٹین" لے کر حاضر خدمت ہوں۔ یہ کافی حد تک سچی کہانی اور معاشرے کی عکاس ہے۔ امید ہے آپ اس کی نوک پلک درست کر کے اشاعت کے قابل بنا دیں گے

آپ کی مخلص بہن
سلمیٰ غزل
کراچی

انہیں توقع تھی کہ اماں بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائیں گی مگر ان کے ہونٹوں پر ایک جامد خاموشی تھی اور آنکھوں میں آنسو۔
کچھ کبے بغیر وہ جامناز پر کھڑی ہو گئیں اور نیت باندھ لی۔

”آپ کی اماں کی یہ چپ مجھے زہر لگتی ہے۔ مجال ہے جو ایک لفظ بھی مریم کے خلاف کہا ہو۔ سہیل کے انتقال کے بعد کتنا ہم نے اس کا ساتھ دیا۔ بچوں کا خیال رکھا۔ خود تو کالج جانے کے بہانے سیرپائے کو نکل جاتی تھیں اور ہم ان کی آل اولاد کو بھٹکتے تھے۔ اماں کو بس اسٹول سے آنے کے بعد انہیں تھلانے دھلانے اور کھانا کھلانے کی ذمہ داری تھی۔ باقی تو مریم کے آنے تک میں ہی دیکھ بھال کرتی تھی اور پھر رات کا چلوہا بانڈی سنبھال کر بھتی تھیں ہم پر احسان کیا ہے۔“ عذرا اس کی جیٹھانی کو جانے کس بات پر غصہ تھا۔
”مجھے تو حیرت آپ کی آپا اور حمزہ بھائی پر ہے۔ بڑے طعرات سے یہاں سے لے کر گھسے تھے جیسے ہم کوئی ظلم کے پہاڑ توڑ رہے ہوں اور اماں نے بھی جو ایک لفظ کہا ہو مریم کے خلاف.....“
”میں تو سہیل کے لحاظ میں کچھ نہیں کہتا تھا کہ مریم سہیل کی پسندیدہ ورنہ وہ مجھے بھی ایک آنکھ نہ بھائی۔ پتا نہیں اسے کس بات کا غرہ اور غصہ تھا۔ اپنی خوب صورتی

”مریم نے شادی کر لی!“
یہ خبر پورے محلے میں اس طرح گردش کر رہی تھی جیسے مریم نے شادی نہ کی کوئی گناہ کر لیا۔ خود مریم کے سرال میں بھی صف ماتم چھٹی ہوئی تھی۔
”میں نے کہہ دیا ہے اماں! اب اگر مریم نے اس گھر میں قدم رکھا تو میں ٹانگیں توڑ دوں گا اس کی.....“
نہیل نے گرج کر کہا جو مریم کے جیٹھ تھے۔
”حد ہو گئی دو بچوں کی ماں..... میاں کی آنکھ بند ہونے کی دیر ہی ایک سال کے اندر اندر بیاہ چالیا۔ ابھی تو سہیل کا کفن بھی سہلا نہیں ہوا تھا۔ بچوں کا نہ سہی کچھ دنیا کا ہی خیال کر لیتیں۔ سہیل کی فونکی پر قیل تو ایسا پچا رہی تھی جیسے اس کے ساتھ ہی دفن ہو جائے گی۔“
جیٹھانی نے بھی دل کی بھڑاس نکالی۔
”ای! امار یہ اور قاریہ کیا اب ہمارے پاس آ جائیں گی؟“ دس سالہ عارض اور آٹھ سالہ عارض نے اشتیاق سے پوچھا جن کی دونوں بہنوں سے بڑی دوستی تھی۔
”ارے دمع دور! جیٹھی ماں ویسی بیٹیاں..... رہیں اپنی اولاد داہنے پاس..... کوئی اتنا فالتو نہیں جو پرانی اولاد کو سنبھالے۔ آج ورنہ ورنہ بانی اور ان کے میاں کو آنے دو! پوچھوں گی ان سے بڑے ٹھنڈے سے لے گی تمہیں بھانج اور بھینچوں کو کہ اب یہ میری ذمہ داری ہیں۔ چار دن نہ کھانا کھا گیا ہاں کیا.....؟“
جیٹھ جیٹھانی جی بھر کر مریم کو اجملا کہہ رہے تھے اور

پاچھر کالج میں ملازمت کا.....! نہیل نے بھی بیوی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ غصہ اس کی شکل سے ہو رہا تھا اور پیشانی پر پڑے بے شمار بل اس کے ذہنی خلفشار کے غماز۔

مریم نے جب کراچی یونیورسٹی سے ایم ایس سی کیا تو سہیل اس سے ایک سال سینئر ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی چھوڑ چکے تھے اور ان کا تعلق رکی اور واجبی سا تھا کیونکہ مریم صدر رجہ لیے دیے رہنے والی اور خاموش طبع لڑکی تھی کچھ حالات نے بھی اسے مجبور کر دیا تھا اس کی بیوہ ماں گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر اور اس کا ۱۰ سالہ سہا! تھیں جنہوں نے مریم کی وجہ سے دوسری شادی سے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے بیوی اس صبر و شکر اور قناعت سے گزاری کہ کسی کو انکی اٹھانے کا موقع نہیں دیا۔ جب تک ماما نانی زندہ رہے مریم پر غم و فکر سے آزاد تھی کی طرح زندگی کے مزے لوتی رہی مگر آگے چلے ان کے جانے کے بعد دونوں ماں بیٹی کو یوں لگا جیسے وہ چلنے آسمان کے نیچے ٹپکے سر اور ٹپکے پاؤں کھڑی ہوں۔ ماما نانی ان دونوں کے لیے جھڑ جھاڑ تھے۔ ماما نانی کی بے لوث محبت ان کے لیے تحفظ کا حصہ تھی۔ مریم کو اپنی ماں کی قربانیوں اور محرومیوں کا بچپن ہی سے احساس تھا اس لیے وہ ہر قدم چھوٹک چھوٹک کر رکھتی تھی کہ سر پر نہ باپ کا شفقت بھرا ہاتھ تھا نہ بھائی کا مان اور اب تو چاہنے والے ماما نانی بھی نہیں رہے تھے وہ اسکول اور کالج کی ہونہار اسٹوڈنٹ رہی تھی مگر ماما نانی کی وفات نے اس کا دل تعلیم سے اچاٹ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر ماما اس کے ماما کا خواب تھا جب وہ تھی نہیں رہے تو خوابوں کو تعبیر دینے کا فائدہ..... اس نے میڈیکل کا ارادہ چھوڑ کر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور وہاں ایم ایس سی میں گولڈ میڈل لے کر ماں کا سرخسرے سے بلند کر دیا۔ کمیشن کا امتحان پاس کر کے جب اس کا ایک گورنمنٹ کالج میں تقرر کیا گیا تو وہاں سہیل پہلے ہی سے موجود تھے۔ ایک

شٹا سا چہرہ دیکھ کر اسے انجانی سی خوشی ہوئی۔ سہیل اس کی ملاقات سہیل کے دوست ”جنید“ سے بھی ہوئی جو عمر میں تو سہیل سے کافی بڑے تھے لیکن دونوں کی دوستی اصول تھی اتفاق سے پر سہیل بھی ماما کے ایک پرانے جاننے والے نکل آئے۔ اس طرح مریم کا وقت بہت اچھا گزرنے لگا اور جانے کب اور کیسے سہیل اور وہ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن بن گئے اور پھر جنید کی ہی کوششوں سے مریم سہیل کے گھر میں اچالا بکھیرنے آ گئی۔

بھارتیہ ہونے کی بڑی بڑی باتیں جو تھی ماما کی حالت و اطوار سے ساتھ شکار تھی بہت خوب صورت تھی جب کہ اس کے مقابلے میں سہیل کی شکل واجبی جی تھی مگر اس کا رکھ رکھاؤ اخلاق و خوش مزاجی اور طبیعت کا دھیمپا پن اسے ہر جگہ نمایاں کرتا تھا وہ کالج میں ہر دل عزیز استادوں گھر میں ایک فرماں بردار بیٹا تھا اور مریم کو اس کے مزاج کا دھیمپا پن ہی متاثر کر گیا تھا پھر سب سے بڑی بات یہ کہ نہ مریم اپنے حسن کے غرور میں جلتا تھی نہ سہیل احساس کمتری کا شکار نہ دوست مریم کو دیکھ کر مذاق میں کہہ دیتی۔
”یار! تیری ٹولہ لڑی نکل آئی۔“
مگر سہیل نے اس بات کو بھی اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ دونوں میں مثالی محبت تھی۔ سہیل کی رفاقت پر مریم کو ناز تھا فخر تھا۔ اسی نے اس کی شادی کے لیے وقت سے پہلے ہی ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور باوجود سہیل اور مریم کے منع کرنے پر سارا سرمایہ اس کی شادی پر لگا دیا تھا۔ انہوں نے اسے ضرورت کی ہر چیز کے علاوہ ایک آٹو کار بھی دی تھی شاید وہ اس کی شادی کا انتظار ہی کر رہی تھیں کیونکہ شادی کے صرف پچھ مہینے کے بعد ان کا وصال ہو گیا اور بعد میں مریم کو پتا چلا کہ انہیں گال بلینڈر کا کینسر تھا۔ جس کی عمر بہت کم ہوتی ہے وہ شاید مریم سے چھپا کر اسے دکھ و تکلیف سے بچانا چاہتی تھیں۔